

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطبات حکیم الاسلام

جلد — ۳

ایک اعلیٰ پیکل اعراب اور جزین تحقیق کے ساتھ (۲۰) ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و فکر کو بیدار کرے اور فکر و روح کو بصیرت تازگی بخشتا ہے

مستوفیہ مولانا قاری محمد اویس ہوشیارپوری صاحب خطبہ
بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمہ ملتان

تفصیل و تحقیق

مولانا ساجد محمود صاحب
مدرسہ اہل سنت ہمدانہ کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
مدرسہ اہل سنت ہمدانہ کراچی

مولانا محمد اصغر صاحب
کامیاب بھٹو انسٹیٹیوٹ کراچی

تقدیم و تکریم: مولانا ابن الحسن عباوی صاحب خطبہ

پیش اسلام
پبلشر: کراچی، پاکستان





قرآن و سنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

- جملہ حقوق..... بحق ناشر محفوظ ہیں
- طبع جدید..... اکتوبر 2011ء
- تعداد..... 1100
- ناشر..... بیت السلام



بیت السلام
پبلشر - کراچی - پاکستان

نزد مقعدہ مسجد، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32711878
موبائل: 0321-381/113 اے سی۔ بٹیس السلام_pk@yahoo.com

36	معرفت باری تعالیٰ
36	بجواب سپاس
37	دارالعلوم کی ترقی بخیر قوت کی مرہون منت ہے
38	دارالعلوم کی روح معرفت خداوندی ہے
39	انسان خدا کو دلائل سے نہیں فطرت کے دباؤ سے مانتا ہے
40	نظام حکومت سیاست سے نہیں دیانت سے چلتا ہے
41	عقل سے خدا کو مانا جاتا تو فلاسفر عارفین کا ملین ہوتے
42	قرآن کریم نے مشاہدات و واقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے
43	اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے
44	حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت پر نہیں
45	انسان سیرت سے اشرف المخلوقات ہے صورت سے نہیں
46	اہل سیرت کو ہی ربی عظمت نصیب ہوتی ہے
47	صاحب سیرت ہی خلافت خداوندی کا مستحق ہے
48	انسانوں کا جو ہر ایک ہے تفوق بلحاظ سیرت ہے جو اس اختیار پر ہے
49	متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہے
50	مدار نہایت فضل خداوندی ہے
51	عمل علامت فضل ہے
52	جنت محل کا نہیں ایمان کا جملہ ہے
53	دلائل قدرت
54	ذکر اللہ
55
56
57
58
59
60
61
62
63
64
65
66
67
68
69
70
71
72
73
74
75
76
77
78
79
80
81
82
83
84
85
86
87
88
89
90
91
92
93
94
95
96
97
98
99
100

105	70	رسالت و بشریت
106	72	علم و اخلاق کے حصول کا طریق اول، فیضِ محبت
107	73	فیضِ صحیفہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بحرِ عے
108	77	بے شعور اشیاء کی محبت
108	78	دین اہل اللہ کی محبت سے پیدا ہوتا ہے
109	81	علم و اخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواخاۃ فی
110	83	اللہ
112	83	علم و اخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، إحتاط
112	87	یا غیر
113	88	علم و اخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبہ نفس
115	90	اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں
115	91	دنیا کا ہر ذرہ ولعظ ہے
117	94	شیطانِ دھوکہ
118	95	عمل کا زمانہ جوانی ہے
119	96	نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں
120	97	رضائے الہی
124	99	تسمیہ
126	102	وقت و نزع کا خطاب
128	104	ملائکہ موت مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے
		آمادہ کرتے ہیں
		مومن کو عند الموت حق تعالیٰ براہِ راست بھی خطاب
		فرماتے ہیں
		مومن کے لئے اعلانِ رضا کی بشارت
		اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے افعال پر بھی راضی
		رہنا چاہئے
		آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟

- 163 مسائل دینیہ میں مطالبہ سند اس امت کا ذوق ہے 131 توہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ 163
- 165 سید صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اختیار فرض رخصت کے بندوں کی محاذ 165
- 167 ہے 132 ادب اور اختلاف رائے 167
- 167 ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود شعائر اللہ کا ادب 167
- 168 قانون نہیں 136 غیر اختیاری کمالات کا ادب 168
- 169 مشارح طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے نسبت کا ادب 169
- 170 سے نزاع پیدا ہوتا ہے 137 حضرت بانو قوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا سابق آموز واقعہ 170
- 172 شریعت و طریقت کو تحقیق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ادب میں محکمات کا لحاظ 172
- 173 ہے 138 حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عایت و رب ادب 173
- 174 بجا تربیت و محبت تحقیق نہیں ہو سکتا 140 اختلاف رائے 174
- 175 اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالنی ہوئی گستاخی جہالت کی علامت ہے 175
- 176 آتی ہے 141 مولانا قاضی رحمہ اللہ علیہ اور مولانا احمد رضا خاں 176
- 176 اہل اللہ تبارک الدنیا ہیں 142 (مروان) 176
- 176 ادب و عظمت کے حامل کتاب اللہ کے سچ وارث کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے ساتھ حضرت بانو قوی 176
- 176 ہیں 143 رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلوک 176
- 177 تسکین نفرت 146 بے ادبی کی وجہ سے علمی فیض سے محرومی 177
- 177 تین فطری سوال 146 حضرت بانو قوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تاؤب کا دوسرا 177
- 177 انسان کا سدا کیا ہے؟ 147 واقعہ 177
- 178 رحمان کے بندوں کی چال 147 آؤب سے غفلت برتنے کا نتیجہ 178
- 178 رخصت کے بندوں کا قال 159 سدا رافع اور اس کی امثلہ 178
- 179 سلام کی برکات اور آداب 150 عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں 179
- 179 رخصت کے بندوں کی تمہائی 152 اہل اللہ کو نیکی کی حرص 179
- 180 رخصت کے بندوں کی زبان سے عبادت 155 امام ابو داؤد رحمہ اللہ علیہ کا واقعہ 180
- 181 مایات کے سلسلہ میں رخصت کے بندوں کی شان 155 امیر مجتہدین کا ہامی طرز عمل 181
- 181 رخصت کے بندوں کی قلبی عبادت 157 مسائل اور جذبات نفسانی 181
- 181 حقوق العباد کے بارے میں رخصت کے بندوں کے مسلمانوں کے فردی اختلاف پر عیسائی حج کا طنز 181
- 182 طرز عمل 161 اختلافی مسائل میں راہ صواب 182

- شیخ عبدالقدور رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت 182 ایمان اور سکون قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے
- فساد یا صراح؟ 183 بڑھ کر ہیں 206
- تنبیہ اور ترمیمی مسائل میں فرق 183 مسلم کو دنیا بطور حق نہیں بلکہ خدمات کے سلسلہ میں ملتی
- حقوق مالیہ 184 ہے 207
- بدن اور اس کی ضروریات کا خالق 184 بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے 208
- روح اور اس کی ضروریات کا خالق 184 اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے 211
- روح و بدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے 186 خطبہ طیبہ 214
- روح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے 187 تمہید 214
- بندے کا کام ارادے سے ہمہ قسم عبادت ہے 188 تعین موضوع 214
- آرہ سے عبادت 188 دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت 214
- عبادت مالی 189 دینی تعلیم پر مبنی چند سوالات 215
- عبادت مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم 189 انسان ایک حقیقت جامعہ کی تخلیق 215
- کرنا ہے 191 اعضاء کے خلقی وظائف اور ان سے ایک قرآنی
- امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری 192 استدلال 215
- امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ 193 اعضاء کا عمل اور کائناتی عدل 216
- اسلام نے لیاہت کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے 195 سلطان بدن قلب کا عمل 217
- تبع کے اصول پر نہیں 195 سلطان بدن قلب کا عمل 217
- قرآن اول کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت 196 قلب کا وسیلہ علم فکر و تدبر 218
- سخاوت مسلمانوں کو قومی مزاج ہے 197 بدن کا ہر عضو صاحب ادراک و شعور ہے 219
- تقسیم دولت میں اسلام اور کینوزم میں فرق 199 اعضاء کے ادراک کی تین قوتیں 219
- اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا 199 قرآن کریم سے وسائل ادراک کی تعین 220
- اسلام نے خرچ کرنے میں حدود و نواہی ہیں 201 اعضاء ادراک کا باہمی فرق مراتب 221
- مالی حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے 201 اعضاء ادراک کے علم کا باہمی تفاوت 222
- قرآن حلال قرب خداوندی کی شرط اول ہے 202 قوت ذاتیہ 224
- حلال کئی ہی میں برکت و نورانیت ہے 203 قوت شانہ 225
- اتفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرز 204 قوت شہدہ کے جزوی علم پر قرآنی استشہاد 226
- اسلوب 204 قوت واسعہ، ذائقہ و شمار کا حکم کوئی معتدیانہ علم نہیں ہے 227

- 239 227 اور اک قلب کی دو دہشتیں 239
 239 228 تدبیر و جدید باب دماغ کا معجزانہ فکر 239
 240 228 عقل کے بارے میں اہل دل کا نقطہ نظر 240
 240 228 عقل کے حقیقی مرتبہ و مقام کی تعیین 240
 241 228 عقل نہ مستقل بلکہ دراک ہے اور نہ مستقل بالحقیت 241
 242 229 عقل خدا کی صفت نہیں ہے 242
 242 229 علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صفت ہے 242
 9 229 مخلوق (مخلی انسانی) غیر مخلوق (علم الہی) پر حاکم 242
 243 229 نہیں ہو سکتی 243
 243 230 عقل کا سرچشمہ قلب ہی ہے 243
 10 231 حقائق اشیاء تک عقل کی بھی رسائی نہیں ہے 244
 244 12 231 حقیقی علم و ادراک صرف قلب کی خصوصیت ہے 244
 244 232 حیاتی اور عقلی علوم کا مستحکم صورت سامان ہیں خوش 244
 245 233 سیرت انسان نہیں 245
 246 233 حیاتی اور عقلی علوم کے طبعی نتائج 246
 248 234 قلبی ادراک کے دو علمی رخ 248
 248 235 قلب کی مادی اور روحانی ادراکات میں مشابہت 248
 250 235 حس اور علم کا فرق 250
 250 236 حیاتی علوم کا سرچشمہ مادہ ہے اور الہامی علوم کا منبع 250
 250 236 ذات و صفات خداوندی ہے 250
 251 236 قلب اپنی قوت تصویر یہ کے ذریعہ ایک حد تک موجود 251
 252 236 محسوسات بھی ہے 252
 252 236 اعضائے احساس کے بالمقابل قلب کی جلالت قدر 252
 252 236 حیاتی علوم کی طرح دماغی علوم بھی حقیقتاً قلب ہی کا 252
 253 237 فیضان ہیں 253
 253 238 تفہیم بھی درحقیقت قلب ہی کا وصف ہے 253
 254 238 قلب کا وصف امتیازی فاعل ہے 254

- 254 حسیاتی علوم کی طرح ربانی علوم کا طرف بھی قلب ہی ہے
- 255 ربانی اور حسی علوم کے لوازم اور خاصیات
- 256 علم نافع کی حقیقت و وسعت
- 257 عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے
- 258 مدارس دینیہ کے قیام کی ضرورت اور غرض و غایت
- 259 دور حاضر کی بیمار دنیا کا واحد علاج
- 259 ایک غلط فہمی کا ازالہ
- علم دین ترقی کے لئے اور علم دنیا حصول ضروریات کے لئے ہے
- 260 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اولین
- 260 بعثت کا مقصد ثانی
- 260 بعثت کا مقصد ثالث
- 261 عم و عمل کی باہمی وابستگی
- 261 مسلمانانہ زندگی کے حتمی بنیادی شعبے
- 261 قومی بربادی کے تین اسباب
- 262 قومی ترقی کے تین وسائل
- 262 دور حاضر اور ملت اسلامیہ
- 262 اقوام کی تباہی کی طبیعتی ترتیب

معرفت باری تعالیٰ

"الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسَبِّحُهُ وَنُسْتَغْفِرُهُ وَتُؤْمِنُ بِهِ وَتَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَتَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
الْأَنْفُسِ وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّهُ فَلَا مُهَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَوَلَاؤُنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَوْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كُلِّ نَفْسٍ نَبِيْرًا وَنَذِيْرًا، وَدَاعِيَا إِلَيْهِ بِإِذْنِهِ وَمِيْرًا جَا مُنِيْرًا.

اُمَّا بَعْدُ:..... فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. هَـ اَلَمْ تَرَ اَنْ
اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاصْبَرَ اَنْجَابًا رَّسَمَتْ مِنْ خَلْقِنَا الْاَنْهَارَ وَمِنْ الْجِبَالِ جُدَدًا بَيْضَ
وَحُمْرًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٍ ۝ وَمِنَ النَّجْمِ اَلذُّوْاْبِ وَالْاَلْنَاعَامِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهُ
كَذٰلِكَ ۝ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بحجواب سپاس..... بزرگان محترم! ابھی آپ حضرات کے سامنے میرے ایک محترم بھائی نے دارالعلوم دیوبند
اور وہاں کے بزرگوں کی نسبت، نیز خود میرے متعلق جو کلمات ارشاد فرمائے (اس کے بارے میں عرض ہے کہ)۔
جہاں تک دارالعلوم اور اس کے بزرگوں کا تعلق ہے، یہاں تک یہ کلمات بالکل صحیح اور حق ہیں۔ دارالعلوم بھی بڑی
جگہ ہے، اور وہاں کے اکابر و اساتذہ بھی بڑے لوگ ہیں، بڑے ہی تھے، بڑے ہی اب بھی ہیں۔ لیکن جہاں تک
انہوں نے میرے متعلق فرمایا یہ ان کا ایک حسنِ عن اور نیک گمان ہے۔ خود میرے اندر کوئی ایسی اہلیت و صلاحیت
نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ان بزرگوں کے جیسے یہ لوگ خوش چین اور وہاں کے فاضل ہیں، اسی طرح کام میں بھی
وہاں کا ایک فاضل اور خوش چین ہوں۔

دارالعلوم کی ترقی فیہی قوت کی مرہونِ منت ہے..... جہاں تک دارالعلوم کی ترقیات کا تعلق ہے تو اس
تینتیس سالہ خدمت کے دوران ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ دارالعلوم کو چلانے والی کوئی فیہی طاقت ہے۔ یہ محض
ایک تہمت ہے کہ فلان مہتمم ہے۔ اس نے کوئی خدمت کی یا ترقی دی۔ یہ محض ایک راستہ اور وسیلہ کی بات ہے۔
درند اس دارالعلوم کو ہانے اور چلانے والی ایک فیہی طاقت ہے، تہمت کے طور پر نام آجاتا ہے کہ فلاں مہتمم یا منتظم
ہے۔ اس نے یہ کیا اور وہ کیا۔ حالانکہ اس سے جو کچھ واقع ہوا، وہ بھی کچھ سن جانب اللہ ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اماما شقاں مصلحت را چھتے برآ ہوئے توبست اند

فارسی کا شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے اور حقیقتاً محبوب حقیقی حق تعالیٰ ہیں۔ کہ ”تیری زلفوں کا اثر ہے کہ مشک میں سیاهی بھی اور خوشبو بھی پیدا ہوگئی۔ تہمت کے طور پر نام رکھ دیا گیا۔ کہ مشک ہرن کے اندر پیدا ہوتا ہے۔“ ہرن بے چارے کی کیا مجال تھی کہ مشک پیدا کرے۔ اس کے اندر خون بھرا ہوا تھا۔ خون جھاکر سیاہ کر کے خوشبو پیدا کر دیا، اے اللہ! یہ تیرا کام ہے۔ ہرن کا کام نہیں ہے۔ نام ہرن کا لگ گیا کہ اس میں خون جم کر مشک بن گیا۔ بنانے والا تو ہے۔ ہرن بنانے والا نہیں ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ میرے اندر کوئی خون بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی اسے پتہ نہیں کہ خون میں خوشبو کس طرح پیدا کی جا رہی ہے۔ جب ہرن سے خوشبو نکلی، لوگوں نے کہہ دیا، ہرن میں سے خوشبو نکلی، حالانکہ ہرن بے چارے کو خبر بھی نہیں ہے کہ کہاں سے خون آیا ہے؟ کس طرح سیاہ ہوا؟ کس طرح اس میں خوشبو پیدا ہوئی؟

تو کہنے والے نے یہ کہہ دیا ”فلاں آدمی مجتہم ہے۔ اس کے زمانے میں ترقی ہوئی۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کس طرح ترقی ہوئی۔ کس طرح سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ یہ محض ایک غبی طاقت ہے جو چلا رہی ہے۔ یہ تہمت کی بات ہے کہ فلاں نے ایسا کیا۔

حقیقت میں ایسے شخص بزرگوں نے اس کی بنیاد رکھی کہ ان کے اخلاص کی برکت سے آج تک دارالعلوم چل رہا ہے۔ تہمت ہم پر آ رہی ہے۔ بلکہ ہماری برائی دارالعلوم کے سائے کے اندر ردی ہوئی ہے۔ اصل خبر اس کی ہے۔ چلانے والے نے اس زور سے پیسے کولٹھو کھایا تھا کہ وہ آج تک ٹڑھکتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ہمارا کام اس کو چلانا نہیں ہے۔ ہم خود اس کے ساتھ لگے ہوئے اپنا کام بنا رہے ہیں۔ ہمیں دین اور علم حاصل ہو رہا ہے۔ یہ دارالعلوم کا طفیل ہے، نہ کہ دارالعلوم کو ہم بنا رہے ہیں اور نہ اسے چلا رہے ہیں۔ اس کو چلانے والے نے ترقی دی ہے وہ بھی طاقت ہے، جو چلا رہی ہے اور ان اہل اللہ کی برکتیں، جنہوں نے اخلاص پر اس کی بنیاد قائم کی، وہ چلا رہی ہیں۔

دارالعلوم کی روح معرفت خداوندی ہے..... کس طرح سے انہوں نے بنیاد قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عارف باللہ تھے۔ اللہ کی معرفت، اس کے کمالات کا جاننا اور اس کی پہچان ان کے قلوب کے اندر تھی۔ اس معرفت اور پہچان کا ثمرہ تھا کہ انہوں نے دارالعلوم کو قائم کیا اور ان کی برکت سے یہ دارالعلوم چل رہا ہے۔ تو دارالعلوم کی اصل روح معرفت خداوندی ہے جس کے وہ لوگ حامل تھے جو ان کے اندر موجود تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”رَأْسُ الْمَعْلَمِ مَعْرِفَةُ اللَّهِ“ ”سب سے بڑا علم اللہ کی پہچان ہے۔“

آپ پناڑوں اور زمین کو پہچان لیں، اپنے گھر کو پہچان لیں، دنیا کے مور، تیز کو پہچان لیں تو عارف نہیں کہا جائے گا۔ اگر اللہ کی ذات و صفات کو پہچان لیں تو آپ کو عارف کامل اور عالم کہا جائے گا۔ یہ بزرگ عارف باللہ تھے۔ انہیں اللہ کی شان جلال و جمال کی پہچان تھی۔ اس کی برکت تھی جو اتنا بڑا کام کر گئے کہ آج مشرق و مغرب

اب در بار لگا ہوا ہے، خلیفہ، امراء، وزراء، بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ یہ بھی بیٹھا ہوا ہے۔ امام صاحب کا انتظار ہے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں آ رہے۔ رات کے بارہ بج گئے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نذر آمد۔ دہریے کی بن آئی، اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ڈر گئے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ کوئی بڑا فلسفی آیا ہے۔ میں اس سے نہٹ نہیں سکوں گا، اس واسطے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اور آپ یقین رکھیں وہ نہیں آئیں گے۔ میرے مقابلے میں کوئی نہیں آ سکتا۔ اب خلیفہ بھی متاثر ہے۔ دربار کی بھی حیران ہیں اور دہریہ بیٹھا ہوا شنی دکھا رہا ہے۔ جب رات کا ایک بجنا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہنچے، دربار میں حاضر ہوئے خلیفہ وقت نے تعظیم کی، جیسے علماء و ربانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آئے؟ آدمی رات کے آٹھ بجے بھی جا گیا تھا۔ اب رات کا ایک بج رہا ہے۔ آخر اتنی تاخیر کی کیا وجہ پیش آئی؟ شاہی حکم تھا۔ اس کی تعمیل جلد ہونی چاہئے تھی نہ یہ کہ اس میں اتنی دیر لگائی جائے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے دیر لگی اور عمر بھر میں میں نے ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کیسا قصہ پیش آیا۔ اس شروع سے بیان کیا کہ سارا دربار حیران ہو گیا کہ کیا حادثہ پیش آ گیا فرمایا: بس عجیب و غریب ہی واقعہ تھا اور خود مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا قصہ تھا؟ جب سارے دربار کو خوب شوق دلایا اور سب سر تاپا شوق بن گئے۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین نے کہا کہ فرمائیے کیا قصہ پیش آیا؟ فرمایا: قصہ یہ پیش آیا جب میں شان گل میں اترنے کے لئے چلا ہوں تو دریاچ میں تھا دریا کے کنارے پر جو بیٹھا تو اندھیری رات تھی، نہ کوئی ملال تھا نہ کشتی تھی، آنے کا کوئی راستہ نہ تھا، میں حیران تھا کہ دریا کو کس طرح پار کروں۔ اس شش و پنج میں کھڑا تھا کہ میں نے یہ حادثہ دیکھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود دھڑلے کے نہایت عمدہ بنے بنائے تختے نکلے شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلے چلے آ رہے ہیں۔ میں تعجب سے دیکھ رہا تھا کہ یا اللہ! دریا میں سے موتی نکل سکتے ہیں، مچھلی نکل سکتی ہے۔ مگر یہ بنے بنائے تختے کہاں سے آئے؟ ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ اس سے زیادہ عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ تختے خود بخود جڑے شروع ہوئے۔ جڑے جڑے کشتی کی صورت ہو گئی میں نے کہا یا اللہ! یہ کس طرح سے کشتی بن گئی؟ آخر انہیں کون جوڑ رہا ہے کہ اوپر نیچے خود بخود تختے لگے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی میں اس حیرت میں تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے پتیل کی کھلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھٹھکیں لگیں اور جڑ جڑا کے بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ میں حیرت میں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ تختے جو جڑے ہوئے تھے انکی درجوں سے پانی اندر ٹھٹھکا رہا تھا کہ دریا کے اندر سے خود بخود ایک روغن نکلتا شروع ہوا اور ان درجوں میں وہ بھرنا شروع ہوا جس سے پانی اندر گھسنا بند ہو گیا۔

ابھی میں اسی حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنی شروع ہوئی۔ اور کنارے پر آ کر ایسے جھک

گئی، گویا مجھے سوار کرنا چاہتی ہے، میں بھی بیٹھ گیا وہ خود بخود چل بچھ لے کر روانہ ہو گئی۔ دریا کی دھار پر پہنچی پانی اودھر کو جارہا تھا کشتی خود بخود اودھر کو جارہی تھی۔ کیونکہ شاہی محلات ادھر کو تھے۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ! آخر پانی کے بہاؤ کے خلاف کون اس کو لے جا رہا ہے؟ یہاں تک کہ شاہی محل کے قریب کنارے پر پہنچ گئی اور آ کر جھک کر پھر کنارے پر کھڑی ہو گئی کہ میں اتر جاؤں تو میں اتر گیا۔ پھر میرے دیکھنے ہی دیکھتے وہ کشتی غائب بھی ہو گئی۔ گھنٹہ بھر اس کنارے اور گھنٹہ بھر اس کنارے پر سوچتا رہا کہ یہ کیا قصہ تھا؟

یہ سانحہ تھا جس کی وجہ سے حقیر میں کئی گھنٹے لگ گئے اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا ماجرا تھا؟ اور میں امیر المؤمنین سے معافی چاہتا ہوں کہ آٹھ بجے جلا یا گیا اور میں ایک بجے پہنچا ہوں۔ دہریے نے کہا، امام صاحب! میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بڑے عالم ہیں، بڑے دانش مند اور فاضل آدمی ہیں۔ مگر بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ پانی میں سے خود بخود تختے نکل آئیں، خود ہی جڑنے لگیں، خود کیلیں ٹھک جائیں، خود ہی روغن لگ جائے، خود آ کے کشتی اپنے آپ کو جھکا دے، آپ اس پر بیٹھ جائیں اور خود ہی لے کے چل دے، خود ہی وہ کنارے پر پہنچا دے۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے دانش مند، فاضل اور عالم ہیں۔ امام آپ کا لقب ہے اور باتیں کر رہے ہیں آپ نادانوں اور بچوں جیسی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بخود بن گئی، کوئی کیلیں ٹھوکنے والا نہیں، خود بخود ٹھک گئیں کوئی روغن بھرنے والا نہیں، خود ہی بھر گیا کوئی چھانے والا طالع نہیں، خود ہی چل پڑی۔ کوئی سمجھانے والا نہیں، خود ہی سمجھ گئی کہ مجھے شاہی محل کے اوپر جانا ہے۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟

امام صاحب نے فرمایا اچھا! بات نادانی اور بے وقوفی کی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! فرمایا: ایک کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہ سکے، بغیر چلانے والے کے چل نہ سکے، بغیر کیس ٹھوکنے والے کے اس کی کیلیں ٹھک نہ سکیں، اور یہ اتنا بڑا جہان جس کی چھت آسمان ہے، جس کا فرش زمین ہے، جس کی فضا میں لاکھوں جانور ہیں۔ یہ خود بخود بن گیا، خود ہی چل رہا ہے سورج بھی، چاند بھی خود ہی چل رہے ہیں۔ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ ایک معمولی کشتی جیسے انسان بنا سکتا ہے۔ یہ تو بغیر بنانے والے کے نہ بنے اور اتنا بڑا جہان جو انسان کے بس میں نہیں وہ خود بخود بن جائے تو تمہاری عقل بچوں جیسی ہے یا میری عقل بچوں جیسی ہے؟ میں نادان ہوں یا تم نادان ہو؟

مناظرہ ختم ہو گیا اور بحث تام ہو گئی اور دہریے اپنا سامنہ لے کر واپس ہو گیا اب کیا بحث کرے جو اس کی بنیاد تھی وہ ساری ختم ہو گئی۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا وجود اور اس کی پہچان دلائل کی محتاج نہیں ہے بلکہ قلب کے اندر خود بخود فطرت کہتی ہے کہ اس جہان کا ہے کوئی بنانے والا انسان کے قلب پر فطرت کا دباؤ ہے۔ ایک بچہ اور غیر مسلم وہ قلب میں اس چیز کا دباؤ محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس نے کسی کالج میں نہیں پڑھا، کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ مگر دل میں دباؤ محسوس کرتا ہے۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں مشائیں کرتے ہیں اور ہزاروں کام کرتے ہیں لیکن کامیابی سو میں سے ایک میں ہوتی ہے۔ ننانوے میں ناکامی ہوتی ہے۔ تو کون سا انسان چاہتا ہے کہ میں ناکام ہو جاؤں؟ کون چاہتا ہے کہ میں دوکان پر بیٹھوں اور مجھے خسارہ ہو؟ نفع ہی کی خاطر بیٹھتا ہے۔ لیکن بہت سی جگہ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ خسارہ دینے والا اور خلاف مرضی چلانے والا کون ہے؟

انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، بیس بیس برس گزر جاتے ہیں، دوائیں کرتا ہے دعائیں کراتا ہے، نہیں ہوتی، بھٹے چاہتے ہیں کہ ہمارے اولاد نہ ہو، بلکہ برتھ کنٹرول کا سٹم جاری کرتے ہیں کہ اولاد بند ہو جائے اور جب سے برتھ کنٹرول کی دوائیں شروع کیں، جب سے اولاد زیادہ پیدا ہوتی شروع ہو گئی۔ غرض آدمی چاہتا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ہوتی چلی جا رہی ہے، چاہتا ہے کہ ہو مگر بیس بیس برس گزر جاتے ہیں نہیں ہوتی۔ ایک چاہتا ہے کہ نفع ہو، مگر خسارہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک کولاکھوں روپے کا نفع ہو رہا ہے۔

آخر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ سب سے برتر مخلوق انسان ہے۔ جب اس کا کیا ہوا پورا نہیں ہوتا تو گدھے اور گھوڑے تو اس سے نیچے کی چیز ہیں، درخت اور پتھر اس سے نیچے کی چیز ہیں۔ جب انسان اپنے ارادے میں عاجز ہے تو اور چیزوں کا کیا کہنا؟ جب برتر مخلوق بھی عاجز ہے۔ تو ضرور کوئی قوی اور طاقت ور ذات موجود ہے۔ کوئی اوپر کی طاقت ہے جو انہیں چلا رہی ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہو، مگر نہیں ہوتی، گھنٹا بگی ہے، پریشان بھی ہوتا ہے۔ لیکن لاکھ پریشان ہو جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مرجاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں موت کا اندیشہ ہوتا ہے تو دوائیں کرتے ہیں، غذائیں کھاتے ہیں، تفریح کرتے ہیں آب و ہوا بدلتے ہیں کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو بادشاہ، نواب لکھ پتی سب مجبور ہیں۔ اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچا کرتی تو امیر آدمی ایک نہ مرنا سارے بے چارے غریب مرا کرتے، جن کے ہاتھ میں پیسہ نہ ہوتا اور بادشاہ تو مرنے کا نام ہی نہ لیتا خزانے کا منہ کھول دیا کرتا کچھ ملک الموت کو، کچھ انکے فرشتوں کو رشوت دے دی اور اپنی جان بچا لی تو دولت مند کوئی نہ مرنا۔ لیکن سب مرتے ہیں، چاہتا کوئی نہیں، پھر مرتے ہیں۔ پھر آخر کون ہے جو موت دینے والا ہے؟ کون ہے جو مرضی کے خلاف زندگی چھیننے والا ہے؟ اپنی مرضی سے ہم دنیا میں آئے بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جا کیں گے بھی نہیں۔ جب آنا ہوتا ہے تو آنے پر مجبور ہیں، جب جانے کا وقت آتا ہے تو جانے پر مجبور ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ مجبور کے لئے کوئی نہ کوئی جابر ہونا چاہئے جو جبر کر رہا ہے اور اس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔

ہم مخلوق ہیں۔ خود ہم نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا جب مخلوق ہیں تو مخلوق ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی خالق ہو جس نے ہمیں مخلوق بنایا ورنہ ہم خود خالق ہیں، مقبور ہیں تو کابر کی خبر ملتی ہے۔ مرزوق ہیں تو کسی رازق کا پتہ چلتا ہے۔ تو ہر قدم پر انسان اللہ کو اور کسی شانوں کو پہچاننے پر مجبور ہے اور اس کو دلائل سے نہیں پہچانتا بلکہ اس کی ہستی

میں واقعات و حوادث ہیں جو اس کو ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔

عقل سے خدا کو مانا جاتا تو فلاسفر عارفین کا ملین ہوتے..... باقی دلائل تو ہم خود واقعات سے بنا لیتے ہیں۔ دلائل پر خدا کا وجود موقوف نہیں ہے۔ اگر دلائل پر موقوف ہوتا تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں، وہی خدا سے بعید ہیں اس لئے معرفت باری تعالیٰ کا دار و مدار عقل اور دلائل پر نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکے وجود پر سو دلیلیں قائم کی تھیں، بڑی بچی اور فلسفیانہ مضبوط دلیلیں تھیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ کیونکہ سو دلیلیں میں نے ایمان کے اوپر قائم کی ہیں۔ بلکہ بے پڑھا لکھا آقا تو اسے حقارت سے دیکھتے کہ اس کا ایمان کیا ہے؟ ایمان تو میرا ہے کہ میں نے دلیلوں کے زور سے اللہ کو ایک سمجھا ہے۔ ان جاہلوں کو پتہ ہی کچھ نہیں۔ یہ تو محض تقلید کی طور پر مانتے ہیں۔

ایک دفعہ امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ کھیت پر چلے جا رہے تھے۔ کھیت کا ایک کاشت کار سامنے آ گیا کاشت کار بچا رہے پڑھا لکھا، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ کون ہو؟ اس نے کہا مسلمان ہوں۔ پوچھا، مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا جو یہ کہے کہ اللہ ایک اور رسول برحق، آخرت حق، وہ مسلمان ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مسلمان تو ہے۔ مگر تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے؟ دیہاتی نے کہا۔ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تو کوئی دہریہ آ گیا ہے۔ لامٹی لے کے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے ہو لیا کہ ظہر جائے تلاؤں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے آگے اور دیہاتی پیچھے پیچھے کہا کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگنا ہے؟ ارے مسلمان نے خدا کو دل کے یقین سے پہچانا ہے نہ کہ دلیل سے، دلائل کے بغیر کھڑی کے ہوتے ہیں کھڑی آگ میں بھی جل جاتی ہے، پانی میں بھی بہہ جاتی ہے۔ ہوا میں بھی اڑ جاتی ہے۔ تو دلیلوں پر خدا کا وجود نہیں خدا کا وجود دل کے یقین پر ہے اور یقین اللہ ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے کہ میں ہوں اور میری شانیں برحق ہیں۔

قرآن کریم نے مشاہدات و واقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے..... اسی واسطے قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے خدا کے وجود کو نکالو اس چیز کو دیکھو اور اس سے خدا کو سمجھو۔ اسی کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مجھے یاد آیا ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: میں نے شہوت کے پتے سے پہچانا اس طرح کہ شہوت کا پتہ بکری کھاتی ہے تو بیگنیاں ٹٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو منگ ٹٹنا شروع ہو جاتا ہے، ایریشم کا کیر اکھاتا ہے تو ریشم ٹٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو ایک پتہ ہے کہیں جیجی نکلی، کہیں منگ نکلا، کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت ایک کام کر سکتی ہے، دس کام نہیں کر سکتی

اس کی حیثیت کے ادھر کوئی بنانے والا ہے کہ کبھی یہ بنا دیا، کبھی وہ بنا دیا میں نے اس حقیر سے سچے سے خدا کے وجود کو سمجھا۔ اگر آدمی سمجھنا چاہے تو ایک سچے سے خدا کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیہم السلام ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں، رات دن مجھ سے دکھائے ابو جہل کو نہیں سمجھتا تھا، مرتے دم تک نہیں سمجھا ابولہب کو نہیں ماننا تھا، آخر تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبر نے عرفا روق رضی اللہ عنہما نے۔ جس نے مانا، تو کوئی صدیق بنا، کوئی فاروق بنا۔ جس نے نہیں مانا، کوئی ابو جہل رہ گیا، کوئی ابولہب رہ گیا۔ معلوم ہوا جب آدمی نہیں ماننے پر آتا تو پیغمبر بھی نہیں بنا سکتے اور ماننے پر آتا ہے تو شجوت کے پتے سے خدا کو پہچان لے۔

امام احمد ضل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ فرمایا: ہاں الحمد للہ اس نے کہا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ فرمایا، جو اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اس نے کہا، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے۔ اب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر یہ ارشاد فرماتے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا وہ جاہل نہ سمجھ سکتا۔ اسی کے انداز پر اسے سمجھایا فرمایا میں جو خدا کے وجود کو سمجھا ہوں ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں۔ میں نے دنیا میں ایک محل دیکھا کہ وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں شکمیں درز، نہ سوراخ، نہ کوئی روشن دن، کچھ بھی نہیں۔ اس محل کے اندر ایک سونے کا محل بنا ہوا ہے۔ اس میں بھی کوئی دروازہ اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ محل بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں نہ کوئی اندر کی چیز باہر جاسکتی ہے اور نہ باہر سے اندر جاسکتی حتیٰ کہ ہوا کا بھی گزر نہیں، ایک محل باہر ہے اور دوسرا اس کے اندر ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک چاندی کا پتلا پیدا ہوتے ہی بچہ نادان ہوتا ہے۔ مگر اس نے وہ کام شروع کیا جو تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اس سے میں سمجھا کہ اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے جس نے اسے اندر تیار کر دیا ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ خدا کی ذات ہے۔

لوگوں نے عرض کیا حضرت! یہ چاندی کا محل جسے آپ دیکھ کے آئے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھ اور چاندی کے محل میں سونے کا ایک اور محل ہو یہ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ آخر آپ اس محل کو دیکھنے کس دنیا میں گئے تھے۔ فرمایا یہ تمہارے ہاں بھی موجود ہے۔ لوگوں نے کہا ہم نے تو نہیں دیکھا فرمایا، تم آکھ بند کر لو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے۔ یہ تو تمہارے گھر میں بھی موجود ہے۔

فرمایا: کیا تم نے کبھی انڈر نہیں دیکھا؟ وہ چاندی کا ایک محل ہے اس میں جو زردی ہے۔ وہ سونے کا محل ہے، کوئی دروازہ نہیں نہ اندر کی چیز باہر آئے، نہ باہر کی چیز اندر آئے۔ مرنے لے کر اسے جیتھ گئی اچانک اکیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا، اور اس بچے نے دی کی کام کرنے شروع کئے۔ حالانکہ وہ کسی اسکول میں گیا، کوئی ڈگری اس نے نہیں پائی، ماں سے تربیت اس نے نہیں پائی۔ مگر جس طرح اماں دانہ پھینکتی ہے، وہ بھی چھینے لگا، جس طرح وہ بولتی ہے، اسی لہجہ میں اس نے بھی کلام کرنا شروع کر دیا۔

تو انسان کے بچے کو جب تک کتب میں نہ بٹھائیں مادی زبان کی بھی جب تک کتاب نہیں پڑھے گا۔ وہ ادیب و شاعر نہیں بنے گا اور دوسری زبانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ خود مادی اور لکی زبان جب تک اس کو کتابی صورت میں نہ پڑھے، پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاسکتا تو ایک انسان بغیر یکھے زبان نہ بولے اور سیکھنے کے لئے اس کو بیسیوں ملکوں کا سفر کرنا پڑے کہیں جا کے دوسری زبان سے واقف ہو۔ اور یہ سونے چاندی کے محل میں سے ایک بچہ کرکڑ کرتا ہوا نکلا اور اس نے وہی کام کرنا شروع کیا، جو اس کی ماں کر رہی ہے۔

گویا وہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ اس محل میں آخر اس کو کس نے پڑھایا لکھایا ہے، کس نے اس کو سمجھایا کہ تو نے اس طرح بولنا ہے اور کس نے وہ طریقہ بتلایا کہ اٹھ سے باہر نکلنے ہی دانہ چھٹنا شروع کر دینا یہ تعلیم کس نے دی؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا: ﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَذِيَّ أَنْغَضِيَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَيْنَاهُ﴾ ① ”ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس میں ہدایت ڈال دی کہ تو یہ کام کر“۔ انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ علم کی بات الگ ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانے کی خواہش، سونے کی خواہش۔ یہ بلا کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے۔ جس نے دل میں راہنمائی کی ہے اور وہ وہی اللہ کی ذات ہے۔ جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ دل میں آتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے

اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے کہ

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

دل میں تو ہر انسان کے ہے کہ بے شک کوئی جاہل ہستی ہے۔ جو اس کائنات کو چارہ ہی ہے۔ سمجھنا چاہے تو اس کی ذات بڑی بلند والا ہے۔ ہماری سمجھ کے احاطے میں نہیں آ سکتی ہے تو اکبر کہتا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا

بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے
تو جودل میں آجائے، سمجھ میں نہ آئے۔ بس خدا کی ذات کی یہی پہچان ہے۔ ورنہ جو چیز دل میں آتی ہے۔ پہلے آدمی اسے سمجھ جاتا ہے۔ ایک خیال ہمارے دل میں آیا پہلے ہم اس کو سمجھ گئے تو ایک نظریہ ہمارے دل میں پیدا ہوا، ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کا وجود دل میں آتا ہے۔ مگر سمجھ نہیں سکتے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کیا ہے۔ انسان عاجز ہے مگر ماننے پر مجبور ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے آپ موجود ہیں اور آپ کے اندر روح بھی موجود ہے۔ بدن کی تربیت اندر روح ہی کر رہی ہے۔ یہ بدن کے اوپر جو سرفنی اور چہرے کے اوپر تروتازگی ہے، یہ روح ہی کا اثر ہے۔ اگر روح نکال دی جائے تو بدن مرجھا کر، کھلا کر، پڑھ رہا ہو کر

تین دن کے اندر مٹی میں ش جاتا ہے۔ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آگ آگ میں مل جاتی ہے۔ تمام شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کو روح نے جوڑ رکھا ہے۔ لیکن آج تک آپ نے روح کو دیکھا نہیں مگر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ضرور ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر ہماری زندگی کس طرح سے ہے؟ آج تک آپ نے اپنی روح پر کوئی دلیل قائم نہیں کی، کہ کوئی فلسفی یوں کہے کہ یا تو دلہن سے بتاؤ میرے اندر روح ہے۔ ورنہ میں نہیں مانتا کہ میرے اندر روح ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا ایک بھی دلیل نہ ہو۔ آپ ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر نہیں مانتے پھر آپ کو زندہ کہنا مشکل ہے۔ آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ میں مردہ ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ زندہ ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟ کوئی دلیل آپ کے پاس ہے؟ ہر شخص موجود ہے، میں اس سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ میں روح موجود ہے؟ دلیل تو نہیں۔ ہم کہیں گے آپ نے کبھی روح کو دیکھا؟ جواب یہ ہوگا کہ کبھی نہیں روح کی شکل و صورت کیسی ہے؟ معلوم نہیں۔ مگر ہے ضرور۔ تو دلیل ایک نہیں، دیکھا بھی نہیں پھر روح موجود ہے۔ تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ آدمی اسے بلا دلیل مانتا ہے اور خدا کی ذات کو نہ ماننے، یہ حیرت کی بات ہے؟

جب ہمارا بدن بغیر روح کے نہیں ٹھہر سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے، جس کے پیر زمین ہے۔ یہ اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے۔ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے۔ وہ چلا نہیں رہی اور تدبیر نہیں کر رہی؟ غرض جس طرح سے آپ روح کے ماننے کے لئے دلیل کے قیام نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح سے پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی کے بدن کے اندر رکھ پایا جائے کہ بھی ذرا دیکھ کر آؤ روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے۔ دل میں یا دماغ میں ہاتھ چیریں، اس کا مقام کہاں ہے؟ پھر اس سے پوچھو کہ بھی کیا دیکھا؟ وہ یوں کہے گا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، روح کا جلوہ نظر آتا ہے مگر اشارہ کر کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ روح وہاں بیٹھی ہے یا یہاں بیٹھی ہے۔ جہاں جہاں بھی بدن موجود ہے وہیں وہیں روح موجود ہے۔ حتیٰ کہ بال، ناخن، آنکھ میں بھی موجود ہے۔

اور جس طرح ہمارے بدن میں ہماری روح ہے۔ جو سمت و جہت سے بھی پاک ہے اور اشارے سے بھی بری ہے اس طرح سے کائنات کی روح اعظم اللہ رب العزت کی طرف بھی اشارہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں یا وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سمت و جہت سے بری اور اشارہ سے بری مگر کائنات کے ذرے ذرے میں ان کا جلوہ موجود ہے۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ ① ”تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے۔“ ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى فَلْنُبْهِ إِلَّا هُوَ أَيْبَهُمْ وَلَا خُمْسَهُ إِلَّا هُوَ سَاجِدُهُمْ وَلَا أَذُنِي مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَنْكُرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا﴾ ② ”تم ایک جگہ تین ہو تو چوتھا خدا موجود ہے اور اگر پانچ ہو تو چھ خدا

① پارہ ۴، سورۃ الحديد، آیہ ۴، ② پارہ ۲۸، سورۃ المجادہ، آیہ ۷۔

موجود ہے۔ زیادہ ہو یا کم، مگر خدا وہاں موجود ہے اور پھر بھی اشارے سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہے اللہ میاں۔ اس لئے کہ اتنے لطیف ہیں کہ بدن سے بھی پاک ہیں، صورت سے بھی پاک ہیں۔ تو جب ان کی بنائی ہوئی ایک مخلوق یہ شان رکھتی ہے کہ اس کو اشارے سے نہیں بتا سکتے کہ یہ ہے تو اللہ کی ذات تو کہیں بڑی وبالا ہے۔ روح کی آج تک آپ نے شکل دیکھی؟ نہیں دیکھی ہوگی اور آپ کہتے ہیں کہ روح کی کوئی شکل نہیں۔ اللہ رب العزت بھی شکل سے بری وبالا ہیں۔ روح کا آپ نے بھی رنگ دیکھا؟ کہ زرد یا کالی ہے؟ یہ گورے کا لے کافر جو ہے، یہ تو بدن سے چلا ہے روح سے نہیں چلتا۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت پر نہیں..... اسی لئے جو روحانی لوگ ہیں، ان کے ہاں کا لے گورے کا فرق کوئی نہیں، وہاں تو روح کی چمک اور نورانیت دیکھی جاتی ہے۔ چڑی کسی کی کالی ہو یا سفید ہو۔ یہ اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ وہ انسان خطا پرست ہوگا جو حقیقت کو چھوڑ کر محض چڑی کو دیکھے حقیقت پسند انسان کی نظر بھی چڑی کے اوپر نہیں ہوتی، کبھی صورت پر نہیں ہوتی وہ سیرت کو دیکھتا ہے

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سیاہ نام ہیں، موٹے موٹے ہونٹ ہیں کوئی ظاہری شکل و صورت نہیں ہے۔ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے اجلاء صحابہ جو قریش کے سردار تھے، انہوں نے کہا، "ہَلَّا لِيْ حَسْبًا لَّنَا وَهَؤُلَاءِ" ① بلال رضی اللہ عنہ ہمارے سردار اور آقا ہیں۔ ان کے لئے سب کی بیٹیاں حاضر ہیں۔ اگر وہاں کالے اور گورے کا فرق ہوتا تو گورے رنگ کا کوئی بیٹی دینا پسند نہ کرتا۔ مگر اسلام نے یہ سارے فرق مٹا دیئے اسلام کہتا ہے کہ صورت کو نہ دیکھو، سیرت اور حقیقت کو دیکھو شکل و صورت اور رنگوں کو مت دیکھو یہ تو آئی جانی اور اوپر اوپر کی چیزیں ہیں۔ یہ ظاہری شکلیں چند روزہ ہیں۔ اصل سیرت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے۔ اور صورت کو آپ کتنا ہی بتائیں مگر صورت بگڑنے کیلئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ یہ جتنی نہیں، یہ بگڑتی ہی ہے۔ اللہ بھلا کرے بخار کا۔ تین دن بخار آ جائے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے۔ جو رنگ و روغن، غذائیں کھا کے مبینوں میں پیدا کیا تھا۔ بخار نے تین دن میں ختم کر دیا۔ اور بخار بھی نہ آئے تو بڑھا پا تو کہیں گیا ہی نہیں، بڑھا پا آ کے ساری صورت کو چوق موق کر دیتا ہے نہ رنگ رہتا ہے نہ سفیدی۔ اور بڑھا پا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں مگنی ہی نہیں موت آ کے ساری صورت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اس لئے صورت بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے آپ کہناں تک بتائیں گے؟ کہناں تک اس کی خدمت کریں گے؟ جتنی خدمت کریں گے جب بگڑنے پائے گی بیماری بگاڑے گی کوئی فکر لگ گیا اس سے بگڑ جائے گی بڑھا پا بگاڑے گا، موت بگاڑ دے گی اس لئے جو صورت بگڑنے کیلئے پیدا ہوئی اس کے بنائے سنوارنے میں وقت لگانا، وقت ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ تھی اور بہت سے مرید اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے اور شیخ ان

کی تربیت کرتے تھے۔ ایک شخص نیا مرید آیا اور بیعت ہو گیا۔ اس نے اللہ اللہ کرنی شروع کی۔ ابھی اللہ اللہ نے دل میں اثر نہیں کیا تھا۔ بالکل نوا موز اور مبتدی تھا۔ وہ بھی اپنے ذکر و شغل میں لگا۔ شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ ان کے گھر سے کھانا پکا ہوا آتا تھا۔ گھر میں ایک باندی تھی۔ وہ کھانا ہر ہر حجرے میں بانٹ جاتی تھی۔ یہ جو نئے مرید پہنچے تو معمول کے مطابق باندی انہیں کھانا دیتے آئی۔ باندی ذرا قبول صورت تھی۔ ان کی اس سے آنکھ نمئی اور ان کے دل میں عشق و محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب جب وہ آتی، تو کھانا رکھ لیتے مگر اسے گھورنا شروع کرتے۔ شیخ کو پتہ چل گیا کہ سیکھنے تو اللہ اللہ آئے ہیں اور باندی سے عشق بازی اور آنکھ لڑانا شروع کر دی۔ انہوں نے علاج کیا۔ مگر اہل اللہ کے ہاں علاج زہن سے نہیں ہوتا، وہ تو دھمک ایسا ڈالتے ہیں کہ خود بخود علاج ہو جائے۔ شیخ نے جب دیکھا کہ اس آدمی کے اندر عشق پورا اثر کر گیا ہے اور بجائے اللہ اللہ کرنے کے یہ باندی باندی پکارتا ہے، بجائے اللہ کے مشاہدہ کرنے کے باندی کی صورت میں الجھ گیا ہے، اس کا علاج کرنا چاہئے۔ علاج یہ کیا کہ کسی ذاکر سے دست آور دوا منگوئی اور اس باندی کو کھلا دی اس کو دست آنے شروع ہوئے تو اس کے لئے ایک جگہ مقرر کر دی کہ یہاں بیٹھ کے استجماء سے فارغ ہو۔ صبح سے شام تک اس کو خوب دست آئے اور شام کو یہ کیفیت ہو گئی کہ ناک پڑیں تو اس کا دم نکلے نہ رگ رہا، نہ درغین رہا۔ ہڈی و اس کا چمراٹک گیا۔ اس کی صورت بالکل بھیا تک ہو گئی۔ اس کے بعد اس سے کہا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے جا اور جو وہ معاملہ کرے مجھے اطلاع کرنا وہ کھانا لے کے پہنچی چلا جاتا نہیں تھا۔ پاؤں لرز رہے ہیں زرد رنگ، ہڈیاں نکلی ہوئیں، صورت اس کی بری ہو گئی۔ اب وہ کھانا لے کر آئی۔ تو یہ صاحب انتظار میں بیٹھ رہا کرتے تھے کہ باندی آئے تو اسے گھوروں اب جو آئی اور اس کی شکل دیکھی۔ تو انہیں بڑی نفرت ہوئی۔ منہ پھیر کے کہا رکھو دے کھانا۔ چلی جا جندی یہاں سے۔ وہ بے چاری چلی گئی۔ شیخ نے پوچھا، اس نے کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا حضرت! آج تو یہ معاملہ کیا کہ دیکھا تو بجائے خود ہے۔ اس نے تو نفرت سے منہ پھیر کے مجھے کہا کہ جا جلدی یہاں سے، رکھو دے کھانا۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ فرمایا: ”الْحَفْظُ لِلَّهِ“ علاج ہو گیا۔

شیخ شریف لائے، انہوں نے اس مرید سے کہا، ذرا میرے ساتھ تشریف لائے ان کی انگلی پکڑی اور وہ جو تہہ مچھا، جہاں باندی فارغ ہوئی تھی۔ نجاست اس میں بھری ہوئی تھی فرمایا: یہ آپ کا معشوق ہے۔ اسے اٹھا کے لے جائیے اور بڑی حفاظت سے رکھئے اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ آپ کو پانہ نہ سے محبت تھی۔ جب تک یہ باندی میں تھا آپ کو عشق رہا۔ جب یہ نکل گیا، آپ کا عشق ختم ہو گیا تو باندی سے عشق نہیں تھا، اس گندگی سے تھا۔ اس اپنے معشوق کو لے جائیے اور صندوق میں بڑی حفاظت سے رکھئے اور اس کی زیارت کیا کیجئے اس دن مرید کی سمجھ میں آیا کہ:

عشق صورت عاقبت مجھے خود

صورتیں عشق کے لئے نہیں ہیں، میرت عشق کے لئے ہے۔ صورت تو بگڑنے والی چیز ہے، صورت در حقیقت ایک گندگی ہے۔ گندگی جب تک رہتی ہے صورت ہاتی ہے۔ یہ نکل جائے تو صورت ختم ہو جاتی ہے نہیں

سیرت ہر حالت میں موجود ہے۔ اگر اچھی سیرت علم اور کمال ہو تو دنیا میں رہے گا جب باکمال و مقبر میں جائے گا جب باکمال، حشر میں پہنچے گا جب باکمال اور صورت یہاں کہیں بھی ساتھ نہیں ہوگی۔ سیرت ہی سیرت انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے انسان کا یہ فرض ہے کہ اپنی سیرت بنانے کی فکر کرے نہ کہ صورت بنانے کی فکر میں رات دن لگا رہے۔ یہ تو بگڑنے والی ہے۔ ایک نہ ایک دن بگڑے گی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک تابعی ہیں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ یہ غلام تھے اور حبشی تھے، سیاہ رنگ تھے، صورت اچھی نہیں تھی۔ لیکن علم اتنا بڑا تھا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "سَارَ اَيْكُتُ الْفَضْلُ مِنْ عِلْمِهِ ابْنِ أَبِي ذُنَاجٍ" ① "میں نے اپنی عمر میں عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کوئی شخص عالم، افضل، برتر اور کامل نہیں پایا" تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس کی تعریف کریں سمجھ لیجئے وہ شخص کس درجے کا ہوگا، کس درجے کا عالم ہوگا تو علم اتنا بڑا کہ انبی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے عاشق اور صورت کالی کلوثی۔ اس لئے اسلام نے صورت پر مدد نہیں رکھا سیرت پر مدد اور کھایا ہے کہ اندرونی حقیقت درست ہونی چاہئے۔

انسان سیرت سے اشرف المخلوقات ہے صورت سے نہیں..... اور بھائی صورت کا تو یہ ہے کہ صورت ہمیشہ فتوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے اور عزت و بلندی پیدا کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ ہم اور آپ خوبصورت نہیں ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی۔ قرآن کریم میں موجود ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ نے حسن و جمال کو پیدا کیا تو آدھا حسن پوری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا تو کتنے بڑے حسین و جمیل تھے۔

مصر کی بیگمات جب جمع ہوئیں اور ان کی صورت مبارک دیکھی تو کہا۔ ﴿وَخَاشَ لِلّٰهِ مَا هَذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ مُّسْتَوِيٌّ﴾ ② یہ کوئی انسان بشر نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اترا آیا ہے۔ اتنا حسن و جمال تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام جہاں جہاں مصیبتوں میں گرفتار ہوئے صورت کی خوبصورتی نے انہیں گرفتار کر لیا، کھان کے کنویں میں ڈالے گئے، حسن و جمال سب بٹا، بھائیوں نے حسد کیا اور کنویں میں ڈال دیا۔ قافلہ نکال کے لے گیا اس نے مصر کے بازار میں بیچ دیا۔ غلام بنے تو صورت کی وجہ سے بنے۔ زلیخا عاشق ہو گئی اور اس کی وجہ سے نو برس جیل میں رہنا پڑا۔ ان سب کا باعث صورت کی خوبصورتی تھی اور جب مصر کی سلطنت کا وقت آیا خود فرمایا ﴿وَاجْعَلْنِيْ عَلٰی عَزْوٰی الْاَرْضِ﴾ ③ اے بادشاہ مصر! ملک میرے سپرد کر، میں انتظام کر کے ملک چلا سکے دکھاؤں گا زمین کے خزانے میرے حوالے کر۔ اس کی یہ وجہ بیان نہیں کی "اِنِّيْ حَسْبُنَا جَبَلٌ"۔ مصر کی سلطنت میرے سپرد کر دے، اس واسطے کہ میں بہت خوبصورت ہوں، بلکہ یہ فرمایا ﴿اِنْسِيْ حَفِيْظًا عَلَيْنَا﴾ ④ "اس

① غل الترمدی، ج: ۱۲، ص: ۹۲، ② ہار: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیہ: ۳۱۔

③ ہار: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیہ: ۵۵، ④ ہار: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیہ: ۵۵۔

واسطے کہ جس علم والا ہوں، مجھ میں ملک چلانے کی قوت و صلاحیت موجود ہے۔ غرض جب فتنے میں پڑنے کا وقت آیا تو صورت اس کا باعث بنی اور جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو سیرت آگے بڑھی تو سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔ صورت ترقی و رفعت اور بلندی کا باعث نہیں ہے۔

جیسے آپ خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت پھرتے ہیں۔ مور کتنا خوبصورت ہے، اس کے اوپر کیسے عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے۔ کئی کئی رنگ اس کے پروں کے اندر ہوتے ہیں۔ کتنے حسین و جمیل ہوتا ہے بہت سے درندے بھی ایسے ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔ شیر کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کھال ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے بہت اعلیٰ قسم کا کپڑا اوڑھ کر آیا ہے۔ رنگ الگ ہوتے ہیں نقش الگ ہوتے ہیں۔ آپ تو نقش اتار کے ایسا کپڑا بناتے ہیں۔ اس کے پاس قدرت کا بنا ہوا موجود ہے تو جانوروں کی کیسی عمدہ عمدہ کھالیں، پرندوں کے کیسے عمدہ عمدہ رنگ، ان سے زیادہ کون خوبصورت ہے۔ اگر خوبصورتی باعث ترقی ہوتی۔ تو انہیں اشرف المخلوقات بنا دیا جاتا۔ یہ آخر آپ ہی کو کیوں دعویٰ ہے؟ اور آپ ہی کے بہت سے بھائی بند ہیں۔ صورت کے لحاظ سے کم رہتے ہیں۔ لیکن اتنی دھڑلہ کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔ اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی کوئی بھی تعریف نہ کرتا عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف نہ کرتے اس لئے کہ صورت کا تو فی حق سیرت سامنے تھی۔ اس لئے ان کی بڑی عظمت و بڑائی کی جاتی تھی۔ معلوم ہوا صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔ سیرت سے آدمی آدمی بنتا ہے۔ خوب کہا ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ

مگر بصورت آدمی انسان بدے احمدؔ و یوحناؔ ہم یکساں بدے

اگر صورت کی وجہ سے آدمی آدمی بنتا، تو ابو جہل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ایک درجے کے ہی ہوتے، کیونکہ اس کی صورت بھی آدمیوں جیسی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل بھی انسانوں جیسی ہے۔ لیکن سیرت دیکھی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت عرش سے اوپر پہنچی ہوئی ہے اور ابو جہل کی سیرت تخت اطرافی کے اندر پہنچی ہوئی ہے۔ سیرتوں کے لحاظ سے زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ صورت کے لحاظ سے کچھ بھی فرق نہیں اس لئے کہتے ہیں:

مگر بصورت آدمی انسان بدے احمدؔ و یوحناؔ ہم یکساں بدے

ز بربوں چوں گور کافر پر مثل ذر اندر دل قبر خدائے عزوجل

باہر سے دیکھو تو ایک کافر کی قبر کو دیکھو۔ اس کے نقش و نگار بنے ہیں۔ اس پر چار دریں چڑھی ہوئی ہیں، پھول پڑے ہوئے ہیں اور اندر جا کے دیکھو تو عذاب خداوندی بھرا ہوا ہے۔ تو صورت اگر اچھی ہو، مگر اندر اخلاق اچھے نہ ہوں، علم کا کمال نہ ہو، معرفت الہی نہ ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کافر کی قبر اس کے اوپر اچھی اچھی چار دریں پڑی ہوئیں

ہیں۔ اندر خدا کا قہر بڑا ہوا ہے۔ اس لئے آدمی سیرت سے آدمی بنتا ہے۔ صورت سے انسان انسان نہیں بنتا۔ اہل سیرت کو ہی تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے..... دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں مل کر خاک ہو گئے کوئی جاننے والا بھی نہیں۔ لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں۔ آج تک ان کے نام کے ساتھ آپ عظمت کے الفاظ بولتے ہیں۔ عظمت سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا ذکر آتا ہے تو آپ "صلی اللہ علیہ وسلم" کہتے ہیں۔ صحابہ کرام کا ذکر آتا ہے تو آپ "رضی اللہ عنہم اجمعین" کہتے ہیں۔ اولیاء کا ذکر آتا ہے آپ "رحمۃ اللہ علیہم اجمعین" کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی صورتیں موجود ہیں اور ان میں سے کوئی کالا تھا، کوئی گورا تھا، کوئی زرد رنگ کا تھا، کوئی سرخ رنگ کا تھا تو رنگ کا کوئی پتہ نہیں۔ لیکن نام لینے میں آپ آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی سیرت سامنے ہے۔ ان کا علم و کمال سامنے ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کا نام آ جائے، عقیدت سے آپ گردن جھکا دیں گے، ان بزرگوں کی شان میں اگر کوئی ادنیٰ گستاخی کرے، آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ہم یہ گستاخی نہیں سن سکتے، محبت و عظمت آج تک قلوب میں موجود ہے۔ حالانکہ وہ ہستیاں سامنے نہیں ہیں۔ ان کی سیرت اور علم و فضل ہی ہمارے سامنے ہے۔

صاحب! سیرت ہی خلافت خداوندی کا مستحق ہے..... اس لئے اہل بنائے کی چیز علم و معرفت اور اخلاق و کمالات الہیہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جو دنیا میں تشریف لائے، وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے انبیاء کا یہ موضوع نہیں ہے۔ وہ سیرت بنانے کے لئے آئے ہیں کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو، دلوں کے اندر محبت الہیہ پیدا کرو انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بننے کے لئے آیا ہے۔ خلیفہ وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کے اوصاف آجائیں ایک شاعر اسی کو خلیفہ بنائے گا جس کے اندر شعر کہنے کا مادہ آجائے ایک بڑھئی اس کو خلیفہ بنائے گا جو بڑھئی کے فن کے اندر ماہر ہو۔ ایک میاں جی جو لڑکوں کو قرآن مجید حفظ کراتا ہے۔ لڑکوں میں سے اس کو خلیفہ بنائے گا جو قرآن مجید کا حافظ ہوگا۔ اللہ میاں اپنا خلیفہ اس کو بنائیں گے۔ جس میں اللہ میاں کے اخلاق پیدا ہو جائیں گے، اللہ کے علوم و کمالات پیدا ہو جائیں گے۔ اللہ میاں کی نیابت و خلافت شکلوں پر نہیں ہے وہ سیرت پر ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام کے بنائے ہوئے راستہ پر چلے گا وہ خلیفہ اور نائب الہی بن جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین کی عظمت آپ کے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ ان کی صورتوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ آج بھی اگر آپ کسی عالم سے محبت رکھتے ہیں یا اس کی عظمت کرتے ہیں یا اس کو سر پر بٹھاتے ہیں، اس کے چہرے مہرے کی وجہ سے نہیں بٹھاتے یہ جان کر کہ اس کے اندر علم کا مادہ موجود ہے، اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اور علم یہ درحقیقت اللہ کی چیز ہے کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں نہ علم ہے، نہ اخلاقی کمالات ہیں۔ یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔ نو نو برس محنت کرتے ہیں۔ جب آدمی عالم بن کے آتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کیلئے خانقاہیں بنتی ہیں، شیوخ کے ہاں رہتے ہیں۔ مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن کوئی مدرسہ ایسا بھی قائم ہوا ہے۔ جس میں جہالت بھی سکھائی جاتی ہو اور آپ بچے کو داخل کرویں کہ صاحب اس کو جاہل بنا دو۔ یا دنیا میں کوئی خانقاہ ایسی ہے کہ آپ بچے کو وہاں داخل کر کے انہیں کہ صاحب! ذرا اسے بد اخلاق بنا دیجئے ہم آپ کو تنخواہ دیں گے۔ بد اخلاقی کے لئے کوئی خانقاہ نہیں اس لئے کہ بد اخلاق تو پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ حاصل کرنے کی چیز علم ہے نہ کہ جہالت وہ تو پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت اٹھانی چاہئے علم و اخلاق پیدا کرنے کے لئے نہ کہ صورت بنانے کے لئے نہ کمال کو اجلا کرنے کے لئے یہ چیزیں تو من جانب اللہ جیسے ملتی ہیں بل جاتی ہیں۔

انسانوں کا جو ہر ایک ہے تفوق بخلاف سیرت ہے جو امر اختیار کی ہے..... اسی واسطے قرآن کریم نے ایک اصول ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُ شُعْبًا وَفَصْلًا لِّتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْثَرَكُمْ فِتْنَةً عِنْدَ اللَّهِ اتَّقُوا ۚ** ﴿۱﴾ اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام ان دو سے ساری اولاد چلی۔ سب کے سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کوئی کالا۔ کوئی گورا، کوئی سانولا، کوئی اجلا، کوئی سیاہ قوم، کوئی سفید قوم۔ یہ آدم کی اولاد ہیں۔ خاندان اور قبیلے ہم نے بنائے تاکہ دنیا میں پہچان سکوں کہ یہ فلاں کی اولاد ہے، یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ تاکہ احکام جاری ہو سکیں کہ یہ فلاں کی اولاد ہے۔ لہذا میراث کا یہ مستحق ہے، دوسرا نہیں۔ وراثت اسے ملے گی، دوسرے کو نہیں ملے گی۔ تو خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔ خاندان اس لئے نہیں ہیں کہ تم شیخیاں بناؤ کہ میں شیوخ میں سے ہوں اور میں سادات میں سے ہوں اور یہ بیچ ہے، میں اونچے ہوں (مرزا علی دادلی)، اسلام نے ان سب چیزوں کو مٹا دیا۔

فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔ ہاں اونچے بیچ تم میں ہے۔ مگر یہ اختیاری ہے جس کا بھی چاہے بیچ بن جائے۔ ﴿۱﴾ **اتَّقُوا ۚ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقُوا ۚ** ﴿۲﴾ ”جو تم میں زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے ہاں زیادہ با عظمت ہے۔“ جس میں تقویٰ اور طہارت کم ہے وہ اللہ کے ہاں کم وقعت ہے اور تقویٰ حاصل کرنا یہ انسان کا اختیاری فعل ہے۔ تو متقی بن کے جس کا بھی چاہے با عزت بن جائے قاسم و قاجر بن کے جس کا بھی چاہے ذلیل بن جائے۔ خلقی طور پر جو ہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اونچے ہے، کسی کا جوہر نیچا ہے۔ فرمایا: **اَنْتُمْ بَشَرٌ اَوَّلًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ مِنْ قُرْبٰبٍ** ﴿۳﴾ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو ہم نے مٹی سے پیدا کیا لہذا تم سب کا جوہر مٹی ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی انسان سونے

﴿۱﴾ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآية: ۱۳، ﴿۲﴾ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآية: ۱۳

﴿۳﴾ السنن لابن داؤد، کتاب الادب، باب فی التفاضل بالاحساب، ج: ۱، ص: ۳۲۰، رقم: ۴۳۵۴، حدیث حسن ہے۔

دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۱، ص: ۱۱۶، رقم: ۵۱۱۶

سے بنا ہے، کوئی مٹی سے بنا ہے اور کوئی لوہے سے بنا ہے اور کوئی پتھر سے، لہذا ان کے اندر فرق ہے۔ بلکہ سب مشیت خاک ہیں۔ جب ہمارے باپ ہی خاک سے پیدا کئے گئے تو ہم میں چاندی کہاں سے آ جاتی ہے۔ اور مٹی کا کام کیا ہے؟ مٹی جتنا نیچے رہے گی با عظمت رہے گی۔ جتنا اونچا اڑے گی ذلیل ہوگی اگر مٹی اور پر چڑھ کے آنکھوں میں پڑی، تو آپ لعنت بھیجیں گے۔ کپڑوں پر پڑی تو دامن جھٹکیں گے کہ کجبت کہاں سے آ گئی جب تک جوتیوں میں پاؤں رہے گی با عظمت رہے گی اور جہاں اس نے اوپر اڑنا شروع کیا، لوگوں نے لعنت بھیجنا شروع کی۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہے..... اس لئے آدمی بھی وہ بہتر ہے جس میں خاکساری و عجز و نیاز اور تواضع ہو۔ جو بڑا ہے گا اور ابھر کر شنی لگائے گا، تو یہ ایسا ہے جیسے مٹی آنکھ میں پڑ گئی۔ تو لوگ لعنت بھیجیں گے جو ابھرے گا اسے پست کر دیں گے، جو شنی بگھارے گا اسے نچا دکھایا جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ”مَنْ فَوَاضَعَ لِنَفْسِهِ رُفْعَهُ الْفُلَّةُ“ ① ”جو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اللہ اس کو بلند کرتا ہے“ اور جو خود بلند ہوتا ہے اسے فتنی دیتا ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ۔

پستی سے ہوسر بلند اور سرکشی سے پستی اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو خود ابھرتا ہے اسے فتنی دیتے ہیں اور جو خود گر جاتا ہے اسے ابھار دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے، نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے شنی بگھارے اور یوں کہے کہ یا اللہ! میں نے نماز پڑھی میں نے روزہ رکھا، گویا میں نے بہت بڑا کام کیا۔ معاذ اللہ! میں نے گویا آپ کے اوپر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ لا اقل! تو نے کیا کام کیا؟ طاقت تیرے اندر ہم نے دی، ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا، اسباب ہم نے مہیا کئے تو نے کیا کیا؟ اور اگر بندہ نماز پڑھ کے، روزہ رکھ کے سب کچھ کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ جتنا میں نے کیا، تیرا فضل و کرم تھا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں تھی۔ تو نے سب کچھ کیا۔ غرض جو یوں کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا اسے بلند کرتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا اور جو یوں کہتا کہ میں نے کیا۔ تو میں کے گلے چھری پھیر دی جاتی ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا یہ تو سب کچھ ہمارا کیا ہوا ہے۔ اصل چیز انسان میں بھی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میں عاجز ہوں اور ہے بھی بات یہی۔

اس لئے کہ اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ان کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اگر آپ ان کا شکر ادا کریں گے تو وہ بے شمار اور بے حد نہیں ہو سکتا۔ آپ خود محدود ہیں و ماغ محدود ہے، عقل اور طاقت محدود ہے۔ محدود ہوا اور لامحدود افعال کیسے انجام دے دے؟ تو نعمتیں لامحدود ہیں اور شکر محدود ہے۔ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ آدمی شکر ادا کر کے یوں کہے اے اللہ! میں عاجز ہوں، میں شکر ادا نہیں کر سکتا تیری نعمتیں بے شمار ہیں

① المصنف لابن ابی شیبہ ج: ۸، ص: ۱۷۹، رقم: ۹۰۔ حدیث حسن ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب لا فضل لاحد علی

اور میرے اندر طاقت کی کمی ہے۔ تو عاجز ہونے کا اظہار کرنا، اپنے عجز کو مان لینا اللہ کے ہاں بھی پسند ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو قسم دیا گیا کہ ﴿إِغْلُظْ أَلْفَ دَاوُدَ شُكْرًا﴾ ① "اے داؤد! ہزار شکر ادا کرو۔" داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! بے شک میرا فرض ہے میں شکر ادا کروں گا۔ کیونکہ جب آپ کا حکم ہے میں تعمیل کروں گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا شکر ادا کروں تو کس طرح کروں؟

اس واسطے کہ جب نعمتوں پر شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے، تو توفیق خود ایک نعمت ہوگئی۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس کا شکر ادا کروں گا۔ تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، پھر وہ ایک نعمت ہوگئی۔ تو پہلے اس کا شکر ادا کروں تو ہر شکر سے پہلے شکر نکلتا ہے اس لئے میں تو شکر کی ابتداء نہیں کر سکتا۔ شکر کروں تو کس طرح کروں میں تو بالکل عاجز ہوں میرے بس میں نہیں ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔

اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو شکر ادا کرنے سے عاجز ہے۔ تو یہی شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنا عجز مان لو، اپنی ناتوانی تسلیم کرو کون ہے جو ہمارا شکر ادا کرے اور ہماری طاعت کا حق ادا کر دے، فرض ادا کر کے یہ کہنا کہ کچھ نہیں ہو سکا۔ بس یہی ادائیگی شکر ہے کہ اپنی بارمانہ اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے یوں کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا اور یہ تو اضع نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا فضل اگر دشگیری نہ کرے تو ہماری نجات بھی نہیں ہو سکتی عمل بھی قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری نمازیں ان کے امداد کیا رکھا ہے؟ دوسو سے بھرے ہوئے، خیالات بھرے ہوئے۔ نمازیں انبیاء علیہم السلام کی ہیں یا اللہ کی۔ مگر یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ وہ قبول کر لے اور اپنے فضل و کرم سے قبول کرتے ہیں ہمارے عمل کے اندر کوئی جان نہیں ہے۔

مدارِ نجاتِ فضلِ خداوندی ہے..... اور نجات بھی فضل سے ہے حدیث میں ہے کہ: "لَنْ يَنْجِيَنِي اَعْدَاؤُكُمْ غَفْلَةً" ② تم میں سے کسی کو بھی تمہارا عمل نجات نہیں دے گا۔ جب تک اللہ کا فضل نہ ہو"۔ ③

شیخ جلال الدین سیوطی، رحمت اللہ علیہ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے اس میں پچھلی آیتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک عابد تھا جو رات دن اللہ کی عبادت میں لگا رہتا تھا مگر بہر حال جب آدمی دنیا میں رہتا ہے تو کھانے پکانے کی بھی ضرورت ہے، بیوی بچے ہیں، گھر بھی ہے، رشتہ دار بھی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان میں بھی مشغولی ہوتی ہے۔ اس عابد کو یہ بھی ناگوار تھا کہ اتنی دیر بھی بیوی بچوں میں کیوں لگے؟ یہ وقت بھی اللہ ہی کی عبادت میں گننا چاہئے تو اس نے یہ کیا کہ بیوی، بچے، رشتہ دار، مال، جائیداد کو ترک کر کے سمندر کے بیچ میں

① پارہ ۲۲، سورۃ النبا، آیت: ۱۳

② الصحيح للبخاری، کتاب الترقی، باب انقصوا المداومۃ، ج: ۲۰ ص: ۹۹ رقم: ۵۹۸۴

ایک نیلے پر جا کر بیٹھ گیا کہ بس اب میں فارغ ہو گیا ہوں اور چوبیس گھنٹے اللہ کے ذکر میں مشغول رہوں گا۔ اس زمانے میں یہ چیز جائز تھی۔ اسلام نے اس چیز کو حتم کر دیا ہے۔ لیکن پچھلی امتوں میں رہبانیت یعنی گوشہ گیری کرنا اور پہاڑوں پر چلا جانا یہ جائز تھا۔ یہ بھی پہنچ گیا اور ایسی جگہ پہنچا کوئی آدمی وہاں نہ پہنچ سکے۔ سمندر اور اس کے بیچ میں ایک ٹیلہ تھا۔ اس پر جا کے بیٹھ گیا اور ایک چھپر ڈال لیا اللہ نے فضل کیا۔ اسی پہاڑ کے نیلے پر ایک انار کا درخت آگ آیا اور اس پر بیٹھے انار لگنے لگے اور اسی کڑوے پانی کے اندر اس پہاڑ میں سے اللہ نے ایک چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھالیا، ایک کنوڑا پانی پی لیا اور چوبیس گھنٹے نماز میں مشغول نہ رات کو سو نہ دن کو کہیں جانا۔ دن بھر نماز، رات بھر نماز پانچ سو برس اس نے اسی طرح گزارے۔ اور یہ عبادت بھی خالص اس لئے کہ وہاں دکھلاؤ اکس کو ہوتا۔ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہرت اور نام آوری مقصود نہیں تھی۔ وہاں کون نام سننے والا تھا۔ تن تنہا یہ بندہ اور اس کا خدا۔ تو خالص عبادت اور پانچ سو برس۔

پانچ سو برس گزر کر جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے نماز پڑھے ہوئے بجدے کی حالت میں موت دیجئے اور میرے اس بدن کو بجدے کی حالت میں قیامت تک محفوظ رکھئے تاکہ قیامت تک میں تیرا بجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں کم سے کم بجدہ کرنے والے کی صورت ہی بنی رہے۔ تو میری لاش بجدے کے حالت میں قیامت تک محفوظ رہے۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ اور حدیث میں ہے کہ اس کو عین بجدے کی حالت میں موت آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج تک اس کی لاش بجدے میں محفوظ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں اس کی پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے! میں نے اپنے فضل و کرم سے تجھے بخشا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطا کیا۔ تو ابدًا باؤدیک کے لئے اب جہنم میں رہ۔ اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ۔ یہ میرا قبول بندہ ہے۔ میں نے اس کو اپنے فضل و کرم سے نجات دی۔

اس عابد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی۔ بیوی، بچے، رشتہ داروں اور مال و دولت میں نے چھوڑا اور اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا کم سے کم میری تسلی کے لئے کہہ دیجئے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دے دی۔ تو نے گھریا چھوڑا تھا۔ حیرے اس عمل کے طفیل نجات دے دی۔ تو ذرا میرا دل خوش ہو جاتا کہ میرے عمل کی کچھ قدر کی اتنی میں نے محنت کی، ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا گویا میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ ایک دوسرا اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کی کھٹک کو جانتے ہیں۔ ﴿وَلِلّٰهِ غَلِيْمٌ يُّذَابُ الصُّدُوْرِ﴾ ① ”سینوں میں جو خیالات ہیں ان کو بھی جانتے ہیں۔“

اس لئے ملائکہ سے فرمایا، جنت کی بجائے اس عابد کو جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔

لیکن اتنی دور جہنم سے کھڑا کرو جہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، اس کو وہاں پہنچایا گیا، وہاں جو جہنم کی ایک نواور لپٹ آئی ہے تو سر سے ہیر تک یہ عابد خشک ہو گیا اس کو کانٹے چھینے گئے اور پیاس پیاس چلا نا شروع کیا۔ جہنم کا ایک جھونکا نکلتے ہی اس کی ساری روح خشک ہو گئی۔ حدیث میں ہے کہ ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا کنورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اسے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، یہ اور آگے ہو گیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا یہ اور آگے ہو گیا، ہاتھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا خدا کے لئے مجھے پانی دے۔

جواب یہ ملا، واڑ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے، مگر اس کی قیمت ہے۔ اس عابد نے پوچھا کیا قیمت ہے؟ کہ پانچ سو برس کی عبادت جو خالص کی ہو۔ وہ اگر قیمت میں لدا کر دی جائے تو یہ پانی کا کنورا مل سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ اس نے کہا، میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ اور وہ جلدی سے پیش کر دی کنورا لے کر چلا تو کچھ دم میں دم آیا۔ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ اس عابد کو لوٹا کے لے دو اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو پھر پیش ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے، تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم جھوٹ گئے۔ تو نے پانچ سو برس عبادت کی تھی۔ اس کی قیمت ایک کنورا پانی تھی مل گئی اور وہ قیمت تو نے خود تجویز کی۔ ہم نے نہیں کی تو نے ہی کہا کہ میں پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں اور کنورا خریدتا ہوں۔ اس لئے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے ہم ادا ہوئے۔ معاملہ برابر سرازیر ہو گیا۔

اب ان لاکھوں کنوروں پانی کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا اور وہ جو دنیا میں تو نے لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں۔ ایک ایک دانے کا حساب دے ان کے بدلے میں کتنے سجدے، کتنے رکوع کتنے کتنی عبادتیں کیں؟ اور دانہ پانی تو الگ ہے۔ وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھتا تھا، ایک ایک پانگاہ کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا ہے؟ اور نگاہ تو الگ ہے۔ یہ جو تو سانس لیتا تھا۔ جس کے ذریعے زندگی قائم تھی۔ ایک ایک سانس کا حساب دے اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو بدن میں ہم نے جان دی تھی جس نے پانچ سو برس زندگی رکھی اور تو نے عبادت کی۔ اس طاقت کا حساب دے۔ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا اور ہواؤں کو تیری طرف متوجہ کیا جس سے تو سانس لیتا تھا۔ اور جو ہم نے اپنے سورج کو گرمی بخشی جس نے تجھ تک گرمی پہنچائی، جس سے حیرا بدن قائم رہا۔ ان سب چیزوں کا حساب دے۔ ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے جو فائدہ اٹھایا، اب سب کا حساب دے۔ کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

عابد بے چارہ غمرا گیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ! بے شک نجات تیرے فضل ہی سے ہوتی ہے۔

بندے کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی توکل قیمت یہ ہے کہ پانچ سو برس کے عمل کے بدلے ایک کنوڑا پانی مل گیا۔ اور وہ بھی آپ نے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ یوں فرماتے کہ کنوڑا اسے ملے گا۔ جس نے ایک لاکھ برس عبادت کی ہے۔ میں تو اس سے بھی محروم رہ جاتا۔ تو نے قیمت اتنی رکھی جو میں ادا کر سکایہ بھی تیرا ہی فضل ہے۔ اس لئے نجات فضل سے ہوتی ہے، عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل علامت فضل ہے..... مگر بھی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائو کہ آج سے ہی نماز تو صبر اور گھر بیٹھ گئے کہ جب نجات فضل سے ہوگی، پھر عمل کی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر فضل ہونا ہوگا، ہو جائے گا اور جس پر نہیں ہوگا نہیں ہوگا ہم کیوں محنت اٹھائیں؟ یہ خیال مت کرنا۔ بے شک فضل سے ہی نجات ہوگی لیکن یہ کیسے پہنچے کہ ہم پر فضل متوجہ ہے بھی یا نہیں؟ اس کی علامت عمل ہے۔ عمل جو کر رہے ہیں وہ اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہے عمل کو چھوڑ دینا اس کی علامت ہوگی کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔ دنیا میں جب فضل متوجہ ہوتا ہے، تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتیوں کی صورت میں صلہ ملے گا یہاں بھی فضل، وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل کا نہیں ایمان کا صلہ ہے..... البتہ ایمان ایک ایسا چیز ہے جو کہ جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے جس سے ایمان پہچان لیا جائے ورنہ اصل میں ایمان کا بدلہ جنت ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صراف کی دوکان پر جائیں اور ایک ہزار روپے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپے دیا، اس نے سونا دے دیا اور آپ نے لے کے چلے آئے۔ پہلے اسے پرکھتے ہیں کہ اصل بھی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک چتر ہوتا ہے، اس پر گھسا کر دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر سفید چمک دار لکیریں پڑیں، یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے تو آپ ہزار روپے دیدیں گے، سونا لے لیں گے اور اگر میلی اور نمیا لے رنگ کی لکیریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوتا ہے۔ آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صراف کو ہزار روپے دیا۔ یہ ہزار روپے کیا ان لکیروں کی قیمت تھی۔ جو پھر پرکھنی گئیں یا سونے کی قیمت ہے؟ یہ سونے کی قیمت تھی، لکیروں کی نہیں تھی۔ وہ تو علامت تھیں، جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت جو ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں۔ عمل کی لکیریں ہوں گی جن سے ایمان کے کھرے کھولے ہوئے کو پرکھا جائے گا مل اچھے ہیں، تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان بھی اچھا تھا۔ لہذا اس ایمان کی قیمت جنت ادا کر دی جائے گی۔ اگر عمل برے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان میں کمی تھی، کھوٹ تھا۔ لہذا بدلہ پورا نہیں مل سکتا اس لئے بدلہ جو ملے گا وہ عمل کا نہیں، ایمان کا ملے گا ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا تو میں نے اور آپ نے بچس برس مثلاً عمل کیا۔ تو بس بچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے کچرے کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہو گیا۔ جنت میں جو آپ ابد الابد رہیں گے یہ عمل کا بدلہ نہیں اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا۔ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا۔ اور جب آدمی مرتا ہے تو یہ عزم لے کے جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں گا، تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو ایمان دائری ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایمان چونکہ ابدی چیز ہے۔ اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا عمل ابدی چیز نہیں ہے۔ اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں۔ ظاہر میں بے شک عمل سے جنت ملی مگر ایمان نہ ہو، کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی معلوم ہوا عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ہو، تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی۔ لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے۔ اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال فعل و صورت سے نہیں ہے، بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے، ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بتانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت..... اس کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو سنوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں اور وہ دلائل للشیانہ نہیں ہیں۔ بلکہ دنیا کی چیزیں عیش کی ہیں کہ ان میں غور کرو، تاکہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ یہ جو آیت میں نے پڑھی یہی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا: ﴿اَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ ① ”اے نبی طبع انور دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔“

پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا پانی نیچے سے ابلتا چاہئے۔ زبردستی آپ نکالتے ہیں۔ ورنہ اسے نیچے جانا چاہئے۔ یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا کہ وہاں سے پانی کو گراتا شروع کیا۔ تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کونہ ہم ہاتھوں پر لے کر گھسنے نہ ہمارے آباؤ اجداد۔ کوئی بڑی ذات ہے جس کے حکم سے وہاں پہنچ گیا اور طبیعت کے خلاف اسے وہاں جانے پر مجبور کیا۔ اس لئے اللہ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔

پانی آ کر زمین میں جذب ہوا، پھر زمین سے پھل، پلے، ترکاریاں اور سبزیاں اگنا شروع ہوئیں۔ ﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَشَايَہٗ فَسَرَبَتْ مِنْ خِلَافِہٖ اَنْوَاعُ الْاَنْہَا﴾ ② ہم نے اس کے ذریعے پھل نکالے، ان پھلوں کے نکالنے والا کون ہے؟

① ہازہ: ۲۳، سورۃ الفاطر، الآية: ۲. ② ہازہ: ۲۴، سورۃ الفاطر، الآية: ۶.

کاشت کرنے اگر بیج ڈال بھی دیا، تو منوں مٹی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے کوئل کو نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی؟ یا ہمارے آباؤ اجداد نکالے گئے تھے؟ کاشت کار زیادہ سے زیادہ بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد اسے کچھ خیر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ زمین کے اندر اس بیج کو توڑنا پھوڑنا، اس میں سے کوئل بننا، نکال دینا، یہ اللہ ہی کا کام ہے۔ پھر یہ کوئل ایسی نرم و نازک چیز ہے کہ آدمی اسے اٹھیوں سے مسل دے، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن طاقت و راتنی ہے کہ زمین کو پھاڑ کر کلل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کر دی کہ وہ منوں مٹی کو چیر پھاڑ کر اوپر آگئی۔ جب کہ اس کی طبیعت نیچے جانے کی تھی۔ گھاس کو آپ اوپر کو اچھالنے اوپر نہیں جائے گی نیچے کو آئے گی۔ یہ اس کی طبیعت کے خلاف نیچے سے اوپر کی طرف پڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کو نیچے اتارنا، اوپر پڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا کچھ بھنا، اس میں سے کوئل نکلی۔ منوں مٹی کے اندر سے اس نے زمین کو چاک کیا اور اوپر آئے اپنا چہرہ دکھلایا کہ میں آگئی ہوں۔ یہ سارے کام کرنے والے، بجز حق تعالیٰ کے اور کون ہیں؟

اور آگے دلیل یہ بیان کی کہ ﴿فَخَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ﴾ ① ہر پھل کے رنگ الگ سیب دیکھو اور رنگ، آم دیکھو اور رنگ، انگور دیکھو اور رنگ بلکہ اب تو ہر نوع کے اندر خدا جانے کتنی اقسام اور کتنے رنگ ہیں۔ سیب کی بہت سی اقسام اور بہت الوان۔ اس طرح آم کی بے شمار اقسام۔ انگور کی بھی اقسام ہیں رنگ بھی مختلف ہیں۔ حالانکہ جنس ایک ہے اور حرے مختلف ہیں۔ ﴿وَاللَّهُ أَخْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ ② حالانکہ سب کی اصل زمین ہے۔ زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں اور رنگ سب کے مختلف۔ اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلا کرتی ہے۔ یہ مختلف رفتار سے کام کوئی پھل، کوئی پھول، کوئی، پیلا، کوئی نیلا، کوئی سرخ، کوئی کالا۔ یہ بجز حق تعالیٰ کے کون کر سکتا ہے؟ اور فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ یہ سلسلہ صرف پھلوں ہی کا نہیں بلکہ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودَ﴾ ③ پہاڑوں کو دیکھو تو کوئی سفید، کوئی نیلے رنگ کا، کوئی کالے رنگ کا، کوئی ہز و سرخ رنگ کا۔

یہ جو بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے آیت پڑھی۔ وہ آج کے سفر سے یاد تازہ ہوئی پہاڑوں کے بیج میں سے نکل کر آرہے تھے کہ کوئی پہاڑ نیلے رنگ کا سامنے آگیا، کسی میں سرخی جھلک رہی ہے، کسی میں گلابی رنگ، کسی میں کالی مٹی، کسی میں سے کوئلہ نکل رہا ہے تو پہاڑوں کے اتنے مختلف رنگ۔ اگر یہ پہاڑ کی خاصیت ہوتی تو ایک ہی رنگ کے پہاڑ بنتے۔ یہ رنگ کیسے پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فاعل مختار ہے۔ جو ان کے اندر اپنی مرضی سے رنگ بھرتا ہے۔ خود پہاڑ اپنی طبیعت سے پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر کالے بھی معمولی رنگ کے نہیں، بدھ فرمایا،

① ہارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیہ: ۲۷۔ ② ہارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیہ: ۱۳۔

③ ہارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیہ: ۲۷۔

﴿وَعَرَابُيُّبُ مُؤَذِّجٌ﴾ ① گاڑھے رنگ کے کالے اُمنوڈ غارِب اُسے کہتے ہیں، جس کے اندر بڑی گہری سیاہی ہو، دو لفظ ہیں، غَرَابُيُّبُ اور مُؤَذِّجُی انتہا کی سیاہی، تو پہاڑوں سے کوئلہ نکلتا ہے۔ جو انتہائی سیاہی ہے۔

پھر فرماتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو تو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے رنگ کے، متزوں میں سیاہ رنگ کے، چینی اور جاپان میں زرد اور پیلے رنگ کے۔ ہندوستان میں دیکھو تو بولسوں۔ کہیں کالے، گورے، سب لکڑی مختلف رنگوں کے انسان ملیں گے۔ اگر انسان کی طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کچھ کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرتا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھرنے والا موجود ہے، کوئی خالق موجود ہے۔ جیسا اس نے چاہا ویسا کر دیا۔ اور فرماتے ہیں انسانوں ہی کی کیا بات ہے۔ چوپایوں کو دیکھو، ان میں بھی رنگ مختلف ہیں۔ ہزاروں چوپائے مختلف رنگ کے ہیں۔ شیر زرد رنگ کا، ہرن سیاہ رنگ کا، ہرنی پیلے رنگ کی، بگلا سفید، کوا سیاہ، تتر سبز، مورست رنگا، ہر جانور درندے، چرندے، پرندے سب کے رنگ الگ اور رنگوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اسی طرح ایک ہی نوع میں مختلف رنگ ہیں۔ گائے میں سفید رنگ کی بھی کالی بھی، سرخ رنگ کی بھی اور سفید بھی اور چت کھرنی بھی ہوتی ہے۔ بکریوں اور اونٹوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر یہ حیوانی طبیعت کا تقاضا تھا، ایک رنگ ہوتا یہ دس رنگ کیوں ہیں؟ پہاڑ کی طبیعت کا تقاضا ایک رنگ کا تھا، یہ پچاس رنگ کیوں ہیں؟ بجز اس کے کہ اس کو مانا جائے کہ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنے والی ذات وہ ہے، جس کو ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ جس کو جیسا چاہے رنگ دے دے۔ جس کو جیسا چاہے مادے۔ تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ پھر انسانوں میں اختلاف ہے، چہرے کا اختلاف، صورتوں کا اختلاف۔ یعنی کروڑوں انسان آج بھی موجود ہیں۔ اربوں گزر گئے ہیں، اربوں آنے والے ہیں۔ ایک کا نقشہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اللہ کا اتنا لا محدود عمل ہے کہ ہر انسان کی شکل جدا کر دی۔

پھر فرق پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کی ناک وہاں لگا دیتے، کسی کے یہاں لگا دیتے، کسی کے کان آگے ہوتے، کسی کے کان پیچھے ہوتے۔ کان، ناک وہیں ہیں جہاں ہونے چاہئیں، آنکھیں وہیں ہیں۔ اس کے باوجود فرق موجود ہے۔ غرض رنگوں کا اختلاف الگ، صورتوں اور نقشوں کا اختلاف الگ ہے۔ پھر زبانوں کا اختلاف الگ ہے۔ ایک جانور مثلاً طوطا ہے۔ اس کو دیکھیں عرب کا ہو، ہندوستان کا ہو، ترکستان کا ہو، کسی ملک کا ہو اس کی زبان ایک ہی ہوگی یا سب سے ہندو کا ہو، سندھی کا ہو، ایک ہی بول بولے گا مرخ ہے وہ بھی ایک طرح بولے گا۔ لیکن انسان ہے کہ بھانت بھانت کی بولی بولتا ہے۔ مشرق، امریکہ، افریقہ، ہندوستان، انگلستان، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ سب کی الگ الگ زبان ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں اس وقت اصولی طور پر ایک سو بیس

① ہازہ: ۲۳، سورۃ الفاطر، الآية: ۲۷

زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ ہر صوبے کی زبان الگ الگ ہے۔ پنجابی، سندھی، مدراسی، مراد آبادی، بلوچستانی وغیرہ۔ ہر ایک کی زبان الگ۔

پھر ہر زبان میں فرق ہے۔ دہلی والوں کی اردو اور ہے، لکھنؤ والوں کی اور ہے، بہار کی اور طرح کی، یوپی کی اور طرح کی۔ انسان عجب چیز ہے کہ زبانوں کا اختلاف بے حدود بے حساب ہے۔ دنیا کی زبانیں گنیں تو ہزاروں کی تعداد نکلے گی۔ اگر انسان کی جبلت کا تقاضا عربی وغیرہ تھا۔ سارے انسانوں کی ایک ہی زبان ہوتی۔ یہ کسی کی عربی، کسی کی ترکی۔ بٹانے دانے سے بتلایا۔ یہ میری قدرت ہے کہ میں قلوب کو ہدایت دیتا ہوں کہ اس طرح بولو تم تھوڑا ہی زبانیں سکھاتے ہو۔ ماں کے پیٹ سے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ماں باپ ایک ایک لفظ تھوڑا ہی سکھاتے ہیں۔ وہ خود ہی بولتے ہو اٹھتا ہے تو یہ کون ہے جو اندر تعلیم دیتا ہے غرض اختلاف اَللّٰہ کے وجود کو پہچاننے کی مستقل دلیل ہے۔

اس لئے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَاللُّوْا۟بِكُمْ﴾ ① اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی بنوٹ ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ مگر ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ② اس میں قدرت کی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، نگہ کرتے ہیں، جو یہ سوچ بہار کرتے ہیں کہ آخر یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچانتا چاہے تو کائنات کا اختلاف کیوں ہے؟ اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی راز ہے۔ اگر انسان اللہ کو پہچانتا چاہے تو کائنات کا اختلاف یہ اللہ کے وجود کو پہچاننے کی ایک مستقل دلیل ہے۔ زبان، صورت، رنگ، پہاڑ، جانور، ہر چیز میں اختلاف ہے۔ ایک ہی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ انسان اگر کچھ بنانے بیٹھے گا۔ تو وہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ ایک رنگ کی چیز ہو۔ وہ بھی یہ چاہے گا کہ دس قسم کی چیزیں ہوں۔ یہ دس جذبات کس نے پیدا کر دیئے طبیعت کا تقاضا تھا کہ ایک ہی وضع کی چیز بنانا۔ ایک کا لباس ایسا ہو، ایک کا ایسا۔ تو میں روز ایک سے ایک فیشن نکالتی رہتی ہیں۔ آج جو فیشن ہے وہ کل پرانا ہو جائے گا۔ کل اور فیشن آجائے گا۔ اگلے دن اور خدا جانے سو برس میں کتنے فیشن بن چکے ہیں، کتنے بدل چکے ہیں۔ آخر انسان میں اگر یہ جبلت اور طبیعت کا تقاضا ہے تو وہ ایک شکل پر آتی۔ ہر چیز میں اختلاف ہے، عقول میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف پیدا کرنے والے اللہ ہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کا تقاضا نہیں۔ کس قائل مختار کے ارادے کا یہ فعل ہے۔ اس نے جیسا ارادہ کیا ویسا بنا دیا۔ اس لئے اگر انسان اللہ کو پہچانتا چاہے تو اپنے کو دیکھ لے، جب پہچان جائے گا۔ پہاڑ پہ نگا ڈالے تو پہچان جائے گا۔ غرض جس چیز پہ نگاہ ڈالے گا، اللہ کا وجود اس سے نمایاں ہوگا۔ اور اگر فکر نہ کرے تو انبیاء بھی تعلیم دیں، جب بھی نہیں مانے گا اور ماننا چاہے تو اللہ نے ایک ایک چیز کو واعظ و مبلغ اور تذکرہ بنا دیا۔

بہر حال یہ آیت میں اس لئے تلاوت کی تھی کہ اس آیت سے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں ایسی بیان کی ہیں، جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا بھی سمجھ جائے۔ قرآن کریم سارے انسانوں کے لئے کتاب ہے۔ اس میں ایسے دلائل ہونے چاہئیں، جس کو عوام و خواص یکساں سمجھ سکیں اور اگر فلسفیوں کی طرح شکل اول بنائی جاتی، مقدمات لگائے جاتے اور منطقی دکرینی ملتا، پھر نتیجہ نکلتا۔ تو بے چارہ گنوار دیہاتی ان کو کیا سمجھتا؟ اس لئے ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا کھابھی آسانی سے سمجھ سکے۔

بہر حال یہ آیت میں نے پڑھی تھی اس کے متعلق چند باتیں میں نے عرض کیں اللہ تعالیٰ ہمیں فہم سلیم عطا فرما دے۔ ہمارے لئے دنیا و آخرت میں بھلائی مقدر فرمائے۔ اپنی معرفت اور پہچان کی، علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ حق تعالیٰ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمادے۔ دین کو ہمارا شعار بنائے۔ دنیا و آخرت دونوں ہماری درست فرمادے۔ آخرت میں بلا حساب ہمیں جنت میں داخل فرمادے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور معیت نصیب فرمادے۔ آمین

اَللّٰهُمَّ زَيِّنَا قَبْلَ بِنَا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ وَاَوْنَا مَتَابِعَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر اللہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسَبِّحُهُ وَنُشْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ
اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنُشْهَدُ اَنْ لَا
اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، وَنُشْهَدُ اَنْ سَيِّدُنَا وَسَيِّدُنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُوْلُهُ ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كُلِّ قَوْمٍ لِّنُتَبِّحَهُمْ بِشِيْرًا وَنُنْذِرَهُمْ اَوْعِيْبًا وَيَاْذِيْهِ وَسِرَاجًا مُّبِيْنًا .

اُمّنا بِعَسَدٍ: فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ . ﴿وَإِنْ
الضَّلٰوةُ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ، وَلَيْدَ كُرَّ اللّٰهُ اَكْثَرُ . وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ صدق اللّٰهُ
الْعَلِيْمُ الْعَظِيْمُ ①

بزرگان محترم!..... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت آپ حضرات کے سامنے میں نے
عطا کی۔ اس وقت پوری آیت کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے صرف ایک
جز کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور وہ درحقیقت ساری شریعت کی روح ہے۔ اور وہ ﴿وَلَيْدَ كُرَّ اللّٰهُ اَكْثَرُ﴾ ②
ہے۔ ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ نماز آدمی کو بے حیائی کی باتوں سے بچاتی ہے برائیوں سے
روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔ نماز بخش اور منکرات سے کس طرح بچاتی ہے؟ اس وقت اس کے
بارے میں کلام نہیں کرنا بلکہ ﴿وَلَيْدَ كُرَّ اللّٰهُ اَكْثَرُ﴾ ③ کے بارے میں چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

اعمال شرعیہ کی روح..... اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر اللہ ہی سب سے زیادہ اعمال میں افضل ہے۔ اس سے بڑھ
کر کوئی عمل نہیں۔ بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے تو ذکر اللہ ہی کی وجہ سے مقبول ہوتا ہے۔ اگر نماز میں
ذکر اللہ اور یاد خداوندی نہ ہو۔ (۲۸۔ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) نماز بے روح رہ جائے گی، روزے میں ذکر اللہ نہ ہو
روزہ بے روح رہ جائے گا، دُعاؤں میں ذکر اللہ نہ ہو دُعا بے روح ہو جاتی ہے۔ سارے اعمال شرعیہ کی روح فی
الحقیقت ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ اس لئے اس پر کلام کرنا گویا ساری شریعت پر اور شریعت کے سارے احکام
پر کلام کرنا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی

① پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۳۵، ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۳۵،

③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۳۵،

زندگی روح سے ہے محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ بدن کے اندر روح نہ ہو۔ روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے۔ بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں۔ یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو بھی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے اسے جلد سے جلد اپنے سے دور کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا تعلق اور محبت و رقیقت بدن سے نہیں بلکہ بدن کے اندر جو روح سمائی ہوئی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے کسی شے کے لئے بقاء نہیں ہے۔

جس طرح سے ان مادی چیزوں میں روح سے ہی بقاء ہے۔ اسی طرح سے اعمال شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکر اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کے مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔ اگر نماز میں یاد خداوندی کی بجائے غفلت آ جائے نماز شمر ہوگئی۔ اس لیے کہ فرمایا گیا ﴿اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ ① ”نماز قائم کر دیر سے ذکر کے لئے“۔ جب ذکر نہ ہو اور نماز ختم ہوگئی۔ اب محض ایک اٹھک بیٹھک یا ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر قیمت عند اللہ نہیں ہوگی۔ اس طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر و تلاوت اور تراویح نہ ہو تو روزہ بھی ایک فاقہ ہے۔ جس کی کوئی قدر قیمت نہیں۔ نیت کے سچے اور اس میں یاد خداوندی ہونے سے روزہ زندہ ہو جاتا ہے اس کو عبادت کہتے ہیں یہ روح نکل جائے عبادت کی بجائے عادت ہو جاتی ہے۔ تو عادت اور عبادت میں فرق یہی ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتی ہے۔ جس میں اللہ کی یاد نہیں ہوتی اگر یہ ہوتی بھی ہے تو اپنے نفس کی ہوتی ہے۔ اگر بلا نیت کے سارا دن کھانا نہ کھائیں، پانی نہ پئیں، بیوی کی طرف رخ کر کے بھی نہ دیکھیں۔ اسے فاقہ کہیں گے اور نیت کے ساتھ اور یاد خداوندی کے ساتھ کریں تو اسی کو روزہ کہیں گے۔ اگر حج میں ذکر اللہ نہ ہو اور نیت صحیح نہ ہو تو حج نہیں بلکہ میرا سیاحت ہے۔ اگر اسی میں بھی نیت آ جائے۔ وہ حج بن جاتا ہے تو عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یاوہ حق ہے۔ جس سے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حاصل یہ نکلا جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس طرح سے پورے شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے گی۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی عبادت نہیں رہے گی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”لَا تَقْضُوا السَّاعَةَ حَتَّى يُقَالَ لِي الْآزْجِي اللَّهُ اللَّهُ“ ② قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی۔ جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

① بارہ: ۱۶۰، سورۃ طہ، آیہ ۴

② التصحیح لمسلم، کتاب الايمان، باب فاضلہ الايمان، ج: ۱، صفحہ: ۳۵۴، رقم: ۲۱۱

قیامت کا ٹھکرہ ردی جائے گی۔

قیامت کے معنی درحقیقت عالم کی موت کے ہیں۔ جیسا کہ مرنے کے بعد بدن پھول چھٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمانوں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ زمینیں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، پہاڑ گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں، سردار کا خانہ مخمر بڑا اور درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قیامت ہے۔ تو حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے جب ایک بھی نہیں رہے گا۔ جسیں عالم کو موت آ جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی روح ذکر اللہ سے تو پوری دنیا کی زندگی اور روح درحقیقت پاؤ خداوندی ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکر اللہ سے زندگی ہے۔..... یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے ایک ایک جز میں زندگی کے آثار ذکر اللہ سے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ چٹا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ جب تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تو ہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر جاتا ہے جہاں پانی ٹھہرا تو چند دن کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ میل کچیل بڑھ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی میں میل کچیل قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے بہتا ہوا پانی تھوڑا ہویا زیادہ، اس سے وضو جائز ہے۔ اگر اس میں کوئی گندگی بھی گر جائے اس کی پاکی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس میں تسبیح اور ذکر اللہ جاری ہے۔ وہ اسے ناپاک نہیں ہونے دیتا اور ٹھہرا ہوا پانی اگر مقررہ ار میں کہے اور اس میں کوئی گندگی گر جائے وہ اپروپانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس سے وضو غیرہ نہیں کر سکتے۔ گندگی کیوں بچھلے؟ اس لئے کہ اس کے اندر وہ روح مختار ہوئی۔ تو چلا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہی اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ درخت کی ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح بند ہوئی جب ہی اس پر زردی آتی ہے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہی جلانے کے قابل بن جاتی ہیں۔ گویا جہاں ان سے ذکر کی روح نکلی تو پھر اسے جلا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے حدیث میں فرمایا گیا کہ کیا کبیر اللہ کی تسبیح کرتا ہے جہاں اس کی تسبیح بند ہوئی؟ جیسا کہ پر میل کچیل آنا شروع ہو جاتا ہے اور تسبیح ختم ہوتے ہی جہاں وہ میل بنا، پھر پیسنے کے قابل نہیں رہا، آپ اسے اتار کر دھوپ کے ہاں بھیج دیتے ہیں۔ جب تک دھول نہ آئے آپ اس قابل نہیں سمجھتے کہ اسے بدن کے قریب بھی کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے کی صفائی اور ستھرائی ذکر اللہ سے قائم ہے۔ ذکر کے بند ہوتے ہی اس میں میل کچیل آنا شروع ہو جاتی ہے۔

انسان کی صفائی بھی فی الحقیقت یا خداوندی سے ہے۔ جب اس میں ذرہ ذرہ یا دھن باقی نہیں رہے۔ تب انسان کے قلب میں میل کچیل گندگی اور نجاست آتی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں یا دلہی ختم ہوئی انسان سیلا ہو جاتا ہے اور سیلا انسان میلے کپڑے کی طرح ہے۔ وہ دھکے دینے کے قابل ہو جاتا ہے اسے کوئی افسانہ میں سے پسند نہیں کرتا۔ روح کے اندر جتنا ذرہ زہر رہے گا، اتنی صفائی نہ رہے گی جتنا ذرہ کرم ہو جائے گا۔ اتنی ہی کمزورت

پیدا ہوگی۔ جتنی کمزورت اور ظلمت پیدا ہوگی۔ گناہ معصیت اور نافرمانی کرنے کے جذبات پیدا ہوں گے۔ شرک و بدعت کے جذبات ابھر رہے ہوں گے جب تک ذکر قائم ہے اور روح کے اندر تازگی ہے، بدن تازہ ہے۔ نفس کے اندر صفائی ہے تو نورانیت پیدا ہوتی ہے اس سے نیکی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جز ہودہ جہی تک زندہ ہے جب تک اس میں یاد خداوندی ہے۔ ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنہال رکھا ہے۔

زراعت و تجارت سے نہیں دنیا دیانت سے قائم ہے۔۔۔۔۔ دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کو سنہال رکھا ہے مثلاً ایک کاشتکار کا دعویٰ ہے کہ میں نے دنیا کو سنہال رکھا ہے اس واسطے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے۔ میں غلہ اگاتا ہوں، گیہوں، چاول اور چنا سب میری بدولت اگتا ہے میں اگر اگتا چھوڑ دوں۔ کھانے کو کچھ نہ ملے تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ دنیا کی زندگی میرے دم سے ہے۔

اگر کاشت کار اور زمیندار دنیا میں نہ ہوں تو دنیا فنا ہو جائے گی۔ ہجر نے آ کر کہا کہ دنیا کو میں نے سنہال رکھا ہے، اس لئے کہ تو تو کچی اجناس اگاتا ہے۔ ان جنسوں کو اگر میں بنا سنوار کر دوں تو پڑھ سچاؤں۔ کپڑا، غلہ اور پھل، پھول پہلائی نہ کروں۔ دنیا بھوکی مر جائے گی۔ تو میری بدولت دنیا قائم ہے، نہ کہ تیری بدولت۔ تو نے غلہ کا انبار لگا دیا۔ مگر ڈھیر سے کیا ہوتا ہے۔ کبے کا تو میری دکان پر آ کر۔ تو نے روٹی اگادی۔ لیکن روٹی کے گانے اگر پڑے رہیں تو کیا ہوتا ہے؟ کپڑا بنا کر میں نے اپنی دکان پر رکھا تو دنیا کو میں نے سنہال رکھا ہے۔ تیرا دعویٰ غلط ہے۔ ان دونوں کے بالقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط کہتے ہو دنیا کو میں نے سنہال رکھا ہے۔ اس لئے کہ میں نے دنیا کا نظام قائم کر کے اس میں امن قائم کر رکھا ہے۔ اگر میں امن قائم نہ کروں، وہ آیا دھانی پڑے کہ کاشت کار تاجر کو ختم کر دے اور تاجر کاشتکار کو، سرمایہ دار مزدور کو، رڈالے اور مزدور سرمایہ دار کو۔ تاجر کاشتکار کے اور کاشت کار تاجر کی دکان پر ڈاکے مارے۔ دنیا ساری گڑبڑ ہو جائے۔

میں نے اپنے عدل و انصاف سے دنیا کو سنہال رکھا ہے۔ میں کرسی سیاست پر بیٹھ کر دنیا کو تھام رہا ہوں تو کاشت کار، تاجر اور زمیندار مجھے سنہال رہا میں سنہال رہا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سارے غلط کہتے ہو، دنیا کو سنہالنے والا تو ہمارا نام لینے والا ہے۔ جو ہماری یاد میں مصروف ہے۔ اس نے دنیا کو سنہال رکھا ہے۔ نہ کہ تاجر، کاشت کار، زمیندار اور سیاسی آدمی نے۔ ہم نے اور ہمارے نام لینے والوں نے سنہال رکھا ہے۔ غور کریں تو اللہ ہی کا دعویٰ سچا ہے۔ باقی سب کے دعویٰ غلط ہیں۔ اگر ایک دیندار کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنہال رکھا ہے تو اس نے کب تک سنہال رکھا ہے؟ اگر کاشت کار دیانت داری سے کام کرتا ہے تو دوسرے کی زمین پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ ایک ایجنڈ زمین دوسرے کی نہیں لینا چاہتا۔ جتنے غلہ اس کے ہاں اگتا ہے۔ اسی کو وہ بازار میں لے جا کر بیچتا ہے۔ دوسروں کے غلے چرا کر اپنے غلے میں ملا کر نہیں لے جاتا۔

تو جب تک وہ دین و دیانت سے کام کر رہا ہے۔ اس وقت تک اس کی زمینداری چل رہی ہے اور اگر بد دیانتی اور ظلم و ستم پر آ جائے۔ لوگوں کی زمینوں پر چھاپے مارے۔ لوگوں کے غلوں میں اپنا غلہ ڈال کر ان کے غلے کھینچ لائے۔ اگلے دن اس پر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ تو نہ اس کی کاشت کاری باقی رہے گی، نہ زمینداری نہ یہ دنیا کو سنبھال سکے گا۔ تو معلوم ہوا کہ زمیندار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت کی وجہ سے، دیا امتداری علی اللہ کا ذکر ہے۔ تو بات یہ نکل آئی کہ ذکر کرنے والے نے دنیا کو سنبھالا، دیانت دار نے سنبھالا، بد دیانت نے نہیں سنبھالا۔

ایک تاجر اگر کہتا ہے کہ میں نے دنیا کو سنبھالا۔ وہ اس وقت صحیح ہے کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ تجارت کرتا ہو۔ اصول تجارت کا پابند ہو۔ اس کا جذبہ یہ ہو کہ نہ میرے گا ہب کو نقصان پہنچے نہ مجھے۔ وہ ایک منٹ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ یہ گا ہب آ رہا ہے تو لاؤ اس کی کھال بھی اُتار لوں اور اس کو ہ لکل گھول کر کھا جاؤں۔ یہ اس کا جذبہ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے ہاں سے یہ مال لے جائے تو میری بھی اس کے دل میں یاد رہے میں اس کو اچھی چیز دوں اتنی قیمت میں دوں جتنی مناسب ہے۔ نہ غبن فاحش کروں، نہ بیک مار کیٹنگ کروں۔ بلکہ دیانت داری سے اصولی طور پر واجبی قیمت وصول کروں۔ جس کے اندر کوئی دغا و غیرہ نہ ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ ”غَفَرَ اللہُ لِمَنْ جُلَّ كَنَانُهُ إِذَا اشْتَرَى مِنْهُ لَوْحًا وَتَاغَ مِنْهُ لَوْحًا“ ① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیانت دار تاجر کو دعا دی ہے اور فرمایا، اللہ اس شخص کی مغفرت و بخشش کرے جو سہولت کے ساتھ بیچتا اور خریدتا ہے۔ انصاف کے ساتھ قیمت لگاتا ہے۔ گاہکوں کے ساتھ سہولت کا برتاؤ کرتا ہے۔ تنگی اور سختی نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہے کہ جب مال خریدے تو قیمت کم سے کم لگائے کہ میں اسے لوٹ لوں اور جب بیچنے پر آئے تو ساٹھ گنی لگائے کہ مجھے زیادہ ملے۔ ہر صورت میں اپنا نفع چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ بیچتے وقت اچھا مال دیتا ہے اور قیمت کفایت سے لیتا ہے اور خریدتے وقت کوئی کمی نہیں کرتا تاکہ بائع کو نقصان نہ پہنچے اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے یہ تاجر کون ہے؟ یہ وہی ہے جو دین کو پیش نظر رکھ کر تجارت کر رہا ہے۔

تو تجارت نے دنیا کو نہیں سنبھالا اور حقیقت تاجر کی دیانت داری نے سنبھالا۔ اگر بد دیانتی اور بے اصولی سے تجارت کرے ممکن ہے ابتدا میں کچھ بازار چل جائے اور کچھ فروغ ہو جائے۔ لیکن پھر جو خسارہ پڑے گا تو اس المال کی بھی مصیبت آ جائے گی کہ وہ بھی باقی رہتا ہے یا نہیں۔ تو اگر بد دیانتی شامل حال ہے تو وہ دکان بھی نہیں سنبھالے گی، دنیا کیا سنبھالے گی؟ اس سے واضح ہو گیا کہ تاجر نے دنیا کو نہیں سنبھالا، اسکی دیانت داری نے سنبھالا ہے۔ دیانت داری میں پھر ذکر اللہ آ جاتا ہے۔ تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھال رہے ہیں نہ کہ کوئی اور۔ نظام حکومت سیاست سے نہیں دیانت سے چلتا ہے۔ کرسی عدالت پر بیٹھنے والا بیچ یا کرسی پر بیٹھنے والا

① السنن للترمذی، ابواب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی استقراض الجہور، ج: ۵،

حاکم، بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جب کہ عدل و انصاف قائم کرے اور اگر وہ ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ پوری پبلک کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھتا اپنے اور پرانے کا فرق کرتا ہے وہ حکومت کو بھی تباہ کرے گا اور خود بھی تباہ ہوگا۔ لیکن اگر عدل سے کام لے رہا ہے جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿وَلَا تَجِدُ أُمَّةَ ظَالِمَةً﴾ (اے ایمان والو! "قوم بافلسط" بنو لعی بن عدل و انصاف سے فیصلے کرو، دیانت داری سے فیصلے کرو۔ اگر چہ دیانت داری سے تمہارے غم کے خلاف فیصلہ ہو۔ تو اپنے اوپر برداشت کرو۔ مگر فیصلہ حق کا کرو۔ اگرچہ تمہاری اولاد پر بن جائے ہمت پرواہ کرو۔ عدل سے کام لو۔"

امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریع چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) ہیں کہ میری ایک ذرہ جو میں جنگ کے موقع پر سر پر رکھتا تھا وہ قلاں یہودی کے ہاں ہے۔ اس نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہ دینا نہیں چاہتا دعویٰ بالکل سچا تھا۔

قاضی شریع نے امیر المؤمنین کو عدالت میں طلب کیا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ المسلمین ہیں۔ قاضی شریع ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور عدالت کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو یا خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح کثرت میں کھڑا ہونا پڑے گا وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ ان کے لئے تو کرسی بچھائی جائے اور غریب آدمی دعویٰ کر کے آئے تو وہ کثرت میں کھڑا ہو جب امیر المؤمنین مدعی بن کے آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا پڑے گا جہاں عام مدعی اور مدعی علیہ کھڑے ہوں گے۔

تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہوں آپ مدعی ہیں اور یہودی سے کہا کہ تو مدعی علیہ کی حیثیت سے حاضر ہو۔ دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا کیا، یہودی بھی کھڑا اور امیر المؤمنین بھی کھڑے ہیں۔ امیر المؤمنین کے مقابلے میں یہودی کی کیا حیثیت تھی۔ مگر قاضی اور عادل حاکم کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں برابر کھڑے کئے گئے۔ قاضی شریع نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟

امیر المؤمنین نے فرمایا: دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری ذرہ پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے دینا نہیں حالانکہ ذرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا کہ ان کی ذرہ نہیں ہے۔ یہ تو میری ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ یہودی کی واقعی ذرہ نہیں تھی۔ مگر قاضی شریع نے کہا کہ کوئی گواہ ہے؟

فرمایا جی ہاں تو ایک غلام کو پیش کیا اور ایک اپنے بیٹے حضرت حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو پیش کیا۔ قاضی نے فرمایا بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے اور دو گواہ کے بغیر دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور گواہ لاؤ۔ انہوں نے کہا اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، یہی دو گواہ تھے یا میرا بیٹا یا یہ میرا غلام۔ فرمایا، اگر گواہ ایک ہو تو آپ

کے حق میں ڈگری نہیں دی جاسکتی، یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ ذرہ اسی کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطہ کا ثبوت مہیا نہیں ہوا، اس واسطے فیصلہ ان کے خلاف ہوا اس عدل کا اثر کیا ہوا؟ یہودی نے اسی وقت وہیں کھڑے ہو کر کہا: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ"۔ سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور کہا جس دین کے اندر اتنا عدل و انصاف ہے کہ ایک امیر المؤمنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم ایک نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں وہ دین سچا ہے اور اس دین کی حقانیت کا قائل ہونا ہوں اور علی الاعلان کہا کہ میرا دعویٰ غلط تھا، سچے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور ذرہ ان کو دے دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اب مجھے ذرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرہ کا تو یہی مالک ہے ذرہ بھی تو رکھ تیرا دین جب اسلام بن گیا تو میرے لئے سب کچھ ہو گیا۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی حقانیت کھلی یہودی کو دین نصیب ہو گیا ذرہ اس کو مل گئی اسلام کی عظمت واضح ہو گئی ایک سچائی سے کتنی برکات اور فائدے ظاہر ہوئے افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ، اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

تو اسلام یہ چاہتا ہے کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر دیانت داری سے فیصلہ کر دیا جائے تمہارے خلاف فیصلہ ہو، چاہے تمہاری اوناد کے خلاف ہو، چاہے تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہو مگر عدل و انصاف ہو، چاہے (اگر ایک حاکم اس عدل سے فیصلے کرتا ہے۔ تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے مگر حاکم نے) نہیں اس کی دیانتداری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ تو وہی بات آگئی کہ ذکر اللہ کرنے والے نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ اے کم کوٹھانے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ اگر تاجدار اور کاشت کار دیانت چھوڑ دے اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے اگر بادشاہ وقت دیانت چھوڑ دے، یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔ اور اگر دین دیانت سے کام لیں گے تو دنیا کو سنبھالنے والے بنیں گے تو دنیا کو دیانت ذکر اللہ اور یاد خداوندی سنبھالتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کی خلافت کا دور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب اور دبہ بدہ ہے کہ ان کا نام سن کے دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جلیلہ ابن اسلم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا، وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا، اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ صحر ہوا اور حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا، جب وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف میں مشغول تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر کتنا ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت کے اندر طواف کرتے ہیں تو دھکے کئے بھی نکلتے ہیں، مگر وہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا سب جانتے ہیں کہ سب اللہ کی یاد میں مشغول ہیں۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو نہ برا ماننے میں نہ مقدمہ کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تھا۔ وہ فزاری طواف کر رہا تھا۔ اس وقت جلیلہ ابن اسلم بھی طواف میں

مشغول تھا۔ ترجمہ ابن اسہم کی لنگی پر اس دیہاتی کا چیر پڑ گیا اور لنگی کھل گئی وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا۔ یہاں وہ مسلمان ہو کر غریب الوطن تھا۔ جذبات اس کے وہی شاہانہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ میری لنگی پر ایک دیہاتی کا چیر پڑ گیا، اور وہ کھل گئی ہے تو اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کے گرا۔ اس کے بعد اس نے لنگی درست کی اور پھر طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں جا کے دعویٰ کیا کہ اس نے ناحق میرے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پتھر نہیں ڈالا تھا اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آ دی جان بوجھ کر پتھر ڈالے۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑی سی لے جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ میں اس کے اوپر پتھر بدعتی سے بھی نہیں ڈال سکتا تھا ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے کے میں میرا پتھر لگ گیا، تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی، مگر ارادی غلطی نہیں ہوئی، یہ مجھے سمجھ کر دینا، دھول جمانے کا کون سا موقع تھا۔ اس کا حق کیا تھا؟ یہ دعویٰ دائر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت سے جیلہ ابن اسہم کے نام سن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو، وہ حاضر ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو نے کیوں چپٹ مارا؟ اس نے کہا اس نے میری لنگی پر پتھر ڈالا، فرمایا لنگی پر پتھر ضرور پڑا۔ لیکن وہ موقع ایسا ہے کہ وہاں ارادے سے پاؤں کوئی نہیں ڈال سکتا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے تم سے تصام لیا جائے گا یا تو یہ دیہاتی تمہیں بھی اتنی زور سے دھول مارے گا یا پھر تم مالی طور پر فدیہ ادا کرو، اس نے جو چوٹ کھائی ہے اس کے بدلے میں کچھ مال دے دو، جیلہ نے کہا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر ہو گیا!!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اسلام میں سب برابر ہیں۔ یہاں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے خدا کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر برابر ہیں۔ ایک صف میں بادشاہ اور اس کے برابر میں غلام بھی کھڑا ہوگا وہاں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاسکتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں بندہ نواز تو اللہ ہیں، جو اپنے بندوں کو نوازتے ہیں۔ اس عدالت میں آ کر تو امیر المومنین اور دیہاتی سب برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں۔ اسے سخت ناگوار گزرا کہ اس دین کے اندر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکا جاتا ہے۔ وہ راتوں رات بھاگ گیا اور اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور بدستور پھر عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں کہ بادشاہ بھی ہمارا آ گیا اور اس کا قدیم دین بھی واپس آ گیا بہر حال اسلام نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

مردمین کہتے ہیں کہ ایک صحابی قطیفہ بلا ارادہ ہجرت، تمہارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے۔ جیلہ ابن اسہم کو خبر ہوئی کہ ایک صحابی آئے ہیں۔ آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا اور یہ بھی پہنچے اس نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے میں اسلام لے آیا تھا۔ لیکن وہ فزاری کے

ساتھ میرا مقدمہ ہوا تو میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر نہیں ہو سکتا، لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک نہ میرے دل کو سکھ ملانے چھین، کبھی بات وہی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ دین حق بھی وہی ہے اور سچا بھی وہی ہے اور میں اس پر تادم ہوں کہ میں مرتد ہوا گو مجھے ظاہری بادشاہت بھرنے لگی، لیکن میرے دل میں سکھ اور چین نہیں ہے۔ میرا اب جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام میں داخل ہو جاؤں، مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس واسطے میں اپنے وقار کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہوں کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں کہہ سکوں کہ بھی اگر میں نے اسلام قبول کیا تو کوئی بری بات نہیں کہ فلاں نعمت بھی مجھے ملی اور وہ یہ ہے کہ اگر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی سے میری شادی کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں، تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں، یا میں ہی انکار کر دوں، مگر میرے لئے ایک حیلہ اور نذر بن جائے گا۔ میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹی دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے ان کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ میں پھر اسلام قبول کر لیتا ہوں۔ ⑤

ان صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا، میں امیر المومنین کے پاس جا کے ذکر کر دوں گا اور اس کے بعد میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ متابہ ادا وعدہ ذکر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”تم نے کیوں نہ وہیں وعدے دے دیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اسلام کے مقابلہ میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہیں وعدہ کر لینا چاہئے تھا کہ ٹھیک ہے میرا وعدہ ہے“ ⑥

انہوں نے کہا، امیر المومنین! میں تو ڈر رہا تھا کہ میں کیسے وعدہ کر دوں؟ فرمایا نہیں فوراً جاؤ قسطنطنیہ کا سفر کرو اور کہو کہ ”عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر۔“

چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جلیل ابن اسلم کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام نہیں تھا۔ خاتما ایمان پر نہیں ہوتا تھا۔ صحابی رضی اللہ عنہم بے چارے واپس چلے آئے۔ تو میں نے یہ عرض کیا کہ حاکم عدالت جب بادشاہ اور غلام کو، فقیر اور حقیر کو، خادم اور اس کے آقا کو، کرسی عدالت پر بیٹھ کر ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ اصول اپنائے ہوئے ہے۔ تو یہی اصل دین و دیانت ہے۔ تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے۔ وہ امن جی تک قائم ہے جب تک دین و دیانت کے اصول کو برتے اور دین و دیانت کو برتانی الحقیقت یہی ذکر اللہ ہے۔ معلوم ہوا دنیا ذکر اللہ ہے قائم ہے، سیاست سے قائم نہیں۔ زراعت سے قائم نہیں۔ دعویٰ اللہ ہی کا سچا رہا کہ دنیا کو تھامنے والے وہ ہیں جو اللہ کو کھاتے ہیں اور کوئی نہیں۔ جنہوں نے دعویٰ کیا خواہ وہ تاجر، کاشت کار، حکام یا سیاسی لوگ ہوں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ دنیا کو

① تاریخ بعد اللہ خطب الہدای، ج: ۲، ص: ۱۹۳۔ ② مختصر تاریخ دمشق ”ابن عساکر“ ج: ۲، ص: ۲۵۳۔

تھانے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین و نیا بدلوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں..... ظاہر میں بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے ساتھ نہیں، مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اللہ کے ہاں مقبولیت ہے۔ قبولیت عند اللہ، یہ ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، جس کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر کہا ہے کہ۔

ہمین حقیر گدایاں عشق را کیس قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہیں یہ اللہ کے عاشق ہیں۔ یہ عاشقان خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو اگرچہ ان کے کپڑے معمولی اور پیچھے پرانے ہوں انکے پاس کوئی کٹھی، بگلم نہیں ہے۔ چھو پہڑوں میں رہتے ہیں، انہیں حقیر سمجھو یہ بادشاہ ہیں، اگرچہ سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں روپے کا پٹکا ان کی کمر پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک آدمی بادشاہ کی حکومت کے نیچے جبری طور پر ہوتا ہے۔ دل میں عظمت نہیں ہوتی دل میں لعنت بھیجتا ہے ویسے مجبور ہے۔ لیکن اللہ و انوں کی حکومت دل پر ہوا کرتی ہے۔ تنہائی میں بھی ہوگا تو بے ادبی سے ان کا نام نہیں لے سکتا، تو حقیقی عظمت وہ ہے کہ خلوت میں جائے جب بھی دل میں بھری ہوئی ہو اور مجمع میں آئے جب بھی، بادشاہان دنیا کی عظمت بھرے مجمعوں میں تو ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کو خطرہ ہے کہ اگر میں نے کوئی گستاخی کی، تو پولیس آ کے گردن ناپ لے گی، جیل چنانا پڑے گا اس ڈر کے مارے آدمی بادشاہ کی عزت کرتا ہے۔ تنہائی میں آ کر اس پر لعنت کرتا ہے۔ لیکن اللہ و انوں کی، سامنے بھی اور تنہا بیٹھ کے بھی گستاخی نہیں کرتا سمجھتا ہے کہ میری آخرت بگڑ جائے گی۔ اہل اللہ کی بادشاہت دنیا میں ان کی عدم موجودگی میں بھی قائم ہوتی ہے

ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ دینا میں بھی نہ ہوں پھر بھی تعظیم کی جاتی ہے۔ آج حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام آتا ہے، قلب جھک جاتا ہے آپ کہتے ہیں، رضی اللہ عنہ اللہ، ان سے راضی ہو آج، مابو ضیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے۔ تو آپ عقیدت سے گردن جھکا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، رحمۃ اللہ علیہم، جمیع اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے تو اتنی گرویدگی ہے کہ اگر امام ابو ضیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر کوئی گستاخی کرے، تو آپ جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے، اور اس کو برداشت نہیں کریں گے حالانکہ آج دنیا میں دونوں نہیں ہیں۔ مگر عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ ان کی بادشاہت و عظمت تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہ عظمت کا ہے کی ہے؟ ان میں سے کسی کے پاس دولت، تاج اور تہا، شاہی نہیں تھی مقبولیت عند اللہ تھی خدا کے مقبول بندے تھے۔ اس کی برکات ان کے قلوب کے اندر موجود تھیں۔ اس عظمت کی

جہ سے آج تک آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں، جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ، یہ سرسید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب ”پریچنگ آف اسلام“ (Preaching of Islam) لکھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے متعلق اس نے دور دکھائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح سے پھیلا عرب، ہندوستان اور چین میں کیسے پھیلا اسلامی طور و طریقے اور آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں اور جانفشانیاں اور ان کی جدوجہد، ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں اس نے ایک لطیفہ لکھا وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی جو دنیا میں اور جگہ دکھائی نہیں دی۔ (وہ اسے نہیں دکھائی دی ہوگی لیکن اور جگہ بھی ہے۔ مگر اسے کم از کم ہندوستان ہی میں نظر آئی)۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اجیر گیا، تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کا نام سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ یعنی حضرت خواجہ اجیری رحمۃ اللہ علیہ ان کو ہم امیر الہند، امام الہند اور سلطان الہند کہتے ہیں اس لیے کہ خواجہ اجیری رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں آکر اسلام کو پھیلا یا اجیر شریف میں پھیر کر ایک کئی ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہندو، مسلم اور غیر مسلم ان کے دربار میں حاضر ہوتے عقیدت سے بیٹھتے، ان کی زبان فیض ترجمان سے کلمات حقہ سنتے ان کی دینیت، ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے خود اسی آرنلڈ نے لکھا ہے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بلا واسطہ نانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے۔ ان کی تعداد الگ سے یعنی ایک کروڑ ہے۔ یعنی ایک کروڑ کے قریب افراد اسلام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پھر آگے جتنوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا ان کی تعداد الگ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اجیر میں یہ انوکھا واقعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ لوگ قبر پر آتے ہیں تو ان کی حکومت قائم ہے۔

اور بعضے تو جاہل شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں عظمت سہی ان کے دلوں میں مگر جب خلاف شرع عظمت ہوگی، اللہ کے ہاں مقبول نہیں، بعضے سجدے اور طواف کرتے ہیں۔ مقصد تعظیم تھا۔ مگر انہوں نے اس کو غلط طریق پر جاری کیا۔ ایک وہ ہیں کہ فاتح پڑھتے ہیں، استغفار کرتے ہیں اور پابند شرع بھی ہیں، اصول شریعت کے قیچ بھی ہیں۔ تو اتباع شریعت اور عدم اتباع شریعت تو الگ رہا مگر عظمت لے کے سب جاتے ہیں۔ حالانکہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے کہ اگر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا میں تشریف رکھتے اور ہم جاکے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اتنی ہی عظمت وہاں بھی کرتے، جتنی اب قبر پر ج کر کرتے ہیں۔ تو اس کی حقیقت کیا چیز ہے؟ یہی کہ ان کی حکومت دلوں کے اوپر قائم ہے تو اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ بدنوں، پہاڑوں، پتھروں اور زمین کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دلوں پر ان کی

عظمت و حکومت قائم نہیں ہوتی دل سے لوگ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے اور ہم آزاد ہو جائیں اور اللہ والوں کی نسبت دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت اور زیادہ مضبوط ہو جائے ان کی محبت میں اگر ہم فنا ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو گئے، ہماری دنیا بھی بن گئی، آخرت بھی بن گئی تو حجابی رحمت اللہ علیہ نے یہ کہا کہ

سین حقیر گدایاں عشق را کہیں قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلاه اند
اللہ والوں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو یہ بے تاج بادشاہ ہیں، موجود ہوں جب بھی اور موجود نہ ہوں تب بھی ساری دنیا ان کی رعیت میں داخل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو عقیدت سے کہتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم ان پر درود و سلام پڑھتے ہیں۔ ان کے صحابہ کا نام آ جائے تو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ان کے ائمہ کا نام آ جائے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں۔ کسی ولی مومن کا نام آ جائے مرحوم و مغفور کہتے ہیں۔ غرض دعاؤں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی محبت میں فنا ہوتے ہیں۔ قیامت یہ نکلے کہ ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں پر قائم کیوں ہے؟ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ یا دحق نے ان کو اللہ سے ملا کر ایسا کر دیا جیسے حدیث میں فرمایا گیا: اللہ والوں کی یہ شان ہے کہ ”إِذَا ذُكِرَ الْمَلِكُ“ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان لوگوں کا بھی ساتھ میں ذکر آتا ہے جب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی اللہ کا بھی ذکر آتا ہے گویا۔

خاصان خدا خدا نہ باشند لیکن از خدا جدا نہ باشند
خاصان خدا خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے جب اللہ کا ذکر آئے گا تو اہل اللہ کا بھی ذکر ساتھ آئے گا اور جب اہل اللہ کا ذکر آئے گا تو خدا و رسول کا بھی ذکر آئے گا ان کی عظمت دراصل اللہ سے ہے اسی ذکر سے آدم کی عظمت بھی قائم ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ ذکر اللہ ہی درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آ جاتی ہے تو ان کی حکومت قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ کی محبت ذکر اللہ کی وجہ سے ہے۔ اہل اللہ دنیا کو کیوں لات مار دیتے ہیں؟..... آخر کوئی دولت تو ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کی دولت کو لات مار دیتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے دنیا کی وقعت، نہ اس کی شوکت کی وقعت، نہ تاج و تخت اور عیالات کی وقعت کسی چیز کی بھی وقعت نہیں یہ جو ساری دنیا کو ٹھکرا دیتے ہیں، کوئی بڑی چیز ان کے پاس ہوتی ہے۔ جیسی تو ٹھکراتے ہیں معاذ اللہ، کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں کہ ساری دنیا کو لات مار دی بلکہ دنیا سے بڑھ کر سلطنت دی جاتی ہے۔ جب دوا آ جاتی ہے تو پوری کی پوری دنیا ان کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہے دنیا کو ضرورت سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اس کی عظمت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی چیز ان کے قلب میں موجود ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ ان کی خانقاہ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ذکر اللہ کرتے والے دس دس ہزار مہمان ایک ہی وقت میں خانقاہ میں ہوتے تھے اور لشکر کا کھانا تقسیم ہوتا تھا، حضرت شیخ سے بادشاہ

سنجری بیعت تھا۔ سنجر خراسان کے اندر جو کہ ایک بہت بڑا ملک تھا۔ اس ملک کا ایک صوبہ تھا۔ جس کو نمروز کہتے تھے۔ بادشاہ سنجری حکومت نمروز میں بھی تھی۔ چونکہ حضرت شیخ کے ہاں مہمانداری ہزاروں کی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ شیخ کے گھر نہ جائیداد نہ دولت کس طرح مہمانوں کی مدارات کرتے ہوں گے اس نے نمروز کا پورا صوبہ حضرت شیخ کے نام بہہ کیا اور لکھ کر بھیجا کہ یہ پورا صوبہ میں آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرنا ہوں اس کی آمدنی لاکھوں روپے سال کی ہے مہمانداری میں سہولت ہوگی آپ کے ہاں دشواری ہوتی ہوگی اس واسطے یہ پورا صوبہ اور جائیداد قبول فرمائیے۔

سبحان اللہ! حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواب لکھا تو وہ جو اس نے پرچہ لکھ کر بھیجا تھا اسی کاغذ پر حضرت نے بادشاہ سنجر کے نام جواب لکھ کر بھیجا اور دو شعر کا قطعہ لکھ دیا فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ ختم سیاہ باد دردل بود وگر ہوں ملک سنجرم
حاصل اس کا یہ تھا کہ بادشاہ سنجر کا جو چتر ہے۔ ایک تو بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا تھا اور اس کے پیچھے ایک سیاہ قسم کا چتر لگاتے تھے تاکہ اس کی سیاہی میں بادشاہ کا سفید و سرخ چہرہ نظر آئے وہ گویا عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ سر پر تاج ہوں کے پیچھے ایک چتر ہوں میں سونے کا کام ہو وہ چتر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ تو حضرت شیخ نے لکھا کہ بادشاہ سنجر کا جو سیاہ چتر ہے میرے نصیب پر بھی اسی طرح سیاہی آ جائے جیسے بادشاہ سنجر کے چتر کی سیاہی ہے اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ذرا بھی ہوں پیدا ہو تو میں بد نصیب اور سیاہ بخت بن جاؤں میرے دل میں کوئی ہوں نہیں۔ ہوں کیوں نہ آئے؟ اگلے شعر میں اس کا جواب دیا اور روجہ بیان کی ہے فرمایا:

زانکہ کہ یا فتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیم روز را یک جوئی خرم
جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک اتھ لگا ہے۔ اس دن سے نمروز کے صوبے کی میرے دل میں کوئی وقت باقی نہیں ہے۔ نیم شب کا ملک کیا ہے؟ یعنی وہ جو میں رات کو اٹھ کر دو چھوٹی چھوٹی رکعات پڑھتا ہوں وہ سلطنت جو مجھے ملی ہے اس کے مقابلے میں نمروز کا ملک میرے نزدیک جو کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا تو مجھے نیم شب کا ملک حاصل ہے۔ نمروز کے ملک کی کیا ضرورت ہے؟ آدھی رات کی سلطنت مجھے حاصل ہے تو آدھے دن کی سلطنت مجھے درکار نہیں ہے:

خلیل آسا در ملک یقین زن نوائے لاجب لافلین زن
حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے چاند اور سورج کو دیکھ کر فرمایا تھا، جب وہ غروب ہو گئے ﴿لَا بُحْسُ﴾^① یہ ابھی طلوع ہو کر غروب ہونے والے ہیں، ابھر کر گرنے والے ہیں مجھے ان سے کوئی محبت نہیں، مجھے اس ذات سے محبت ہے جو ہر وقت عروج، رفعت اور بلندی کے اوپر ہے۔ کم ہونے والی چیزوں سے مجھے محبت

① پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیہ: ۷۶۔

نہیں ہے اس نے اس اللہ کے ہاں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں یہ جو ساری دنیا پر بات مار دیتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے پورے صوبے پر بات مار دی اور ٹھکرا دیا۔ فرمایا اگر میں دل میں ڈرا بھی ہوں لاؤں تو بد نصیب بن جاؤں مجھے تیرے ملک سخر کی ضرورت نہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ دوسرا ملک ان کے ہاتھ میں ہے۔ جو اس سے بڑا ہے تو جب وہ ہاتھ آ جائے تو چھوٹے ملک کی کیا ضرورت رہی؟

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت..... حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ کا براولیا اللہ میں سے ہیں۔ ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا جب وہ طاری ہوا اور معرفت الہی کا ایک نشان پر طاری ہوا اور سکر میں گئے تو زبان سے نکلا "مَلِكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللّٰهِ" میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے۔ مریدین بے چارے پریشان اور دم بخود۔ جب شیخ کو ہوش آیا اور اتفاق ہوا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا فرمایا کفر کا کلمہ؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تم نے پھر سزا کیوں نہیں دی تم نے کفر کا کلمہ کیسے برداشت کیا اسی وقت سزا دی چاہئے تھی پھر کبھی کفر کا کلمہ نکلے فوراً سزا دو ایسا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے۔ فوراً اسے تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے مریدین بے چارے چپ ہو گئے شیخ پر دو چار دن بعد پھر وہ طاری ہوا پھر وہی کلمہ نکلا کہ "مَلِكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللّٰهِ" مریدین تو دھڑکے ہی تھے شیخ کا حکم تھا کوڑے لے کر شیخ کے اوپر برس نے شروع کر دیئے مگر شیخ جس مت پر تھے۔ وہ کوڑا ان پر تو نہ لگا جتنا مارا، وہ ان کی کمریوں پر لگنا شروع ہوئے اب ہمارے پر تو یوں مجبور کہ شیخ کا حکم ہے اور جتنا مارے ہیں خود پست رہے ہیں۔ مارے مریدین ابولہبان ہو گئے اور شیخ کا کچھ نہ گزرا۔ مارتے مارتے جب خود بھی تھک گئے اور ساروں کی کمریوں سے خون جاری ہو گیا اتنے میں شیخ کو ہوش آیا تو دیکھا کہ سب آدھ مرے پڑے ہوئے ہیں تو پوچھا کچھ بھی! تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ حضور! آپ کا حکم تھا کہ (ایسا کلمہ نکلنے پر مجھے مارنا) ہمارے کھڑے ہوئے تو بچے تو ہم حضور پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ① فرمایا آخر وہ کیا کلمہ ہے۔ جس کو تم کفر کا کلمہ کہتے ہو؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ آخرت! آپ کی زبان سے نکلا کہ "مَلِكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللّٰهِ" فرمایا: "ماتوا" مقتول! یہ کفر کا کلمہ کب ہے۔ یہ میں ایمان کا کلمہ ہے۔ اب تم نہ سمجھو تو میرے پاس اس کا کیا علاج ہے؟ تم نے سمجھنے کی کوشش میں کی لفظوں کو دیکھ لیا یہ تو میں کمال اور میں توحید کا کلمہ ہے۔ حضرت! آخر یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے کہ میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔ ② "هُوَ لَدُنْكَ اللّٰهُ اَكْبَرُ" ③ "هُوَ رَضَوَانِ مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" ④ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

فرمایا: اس کا مطلب سمجھو یہ بتاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ اللہ کا ملک زمین، آسمان، پہاڑ،

① تفسیر حصی تحت سورۃ الملک، ج ۵، ص ۲۳۱ ② بارہ ۲۱ سورۃ العنکبوت، الآية ۲۶،

③ بارہ ۲۰ سورۃ التوبۃ، الآية ۳۰،

ستارے ہیں، میں ہوں تم ہو، یہ سب اللہ کا ملک ہیں اور میرا ملک کیا ہے؟ اللہ کی ذات و صفات، اسی میں میں میر کرتا ہوں، اسی میں عروج کرتا ہوں رات دن اللہ کی ذات و صفات میں گھرا ہوا ہوں تو میرا ملک تو اللہ کی ذات ہے اور اللہ کا ملک میری ذات ہے۔ تلاذ پھر میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟ ① واقعی یہ بزرگ تو ایسے ہیں کہ ماریں اور مار کے رونے بھی نہ دیں۔ یعنی خود جو کلمہ کہہ دیں وہ تو عین حق ہو جائے اور ہم حق بھی کہیں تو وہ بھی کفر بن جاتا ہے اب اس کا علاج کیا ہے؟ تو لفظ ہر یہ کلمہ کفر تھا۔ مگر شیخ نے بتایا کہ یہ عین ایمان کا کلمہ ہے کہ ہمارا ملک اللہ کی ذات و صفات ہے۔ تو ہمارے ملک کے مقابلے میں سارے عالموں کی کیا حقیقت ہے؟ تو ملک میرا بڑا رہا۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جن کو یہ ملک ہاتھ آ جائے وہ اس ملک کا لالچ کیوں کریں گے؟ جنہیں یہ دولت و سلطنت ہاتھ آ جائے کہ اللہ کی ذات و صفات میں سیر کریں اور رات دن عروج کریں ذات و صفات کے عجائبات ان پر کھلیں، علوم و کمالات اور معارف نئے سے نئے کھلیں، وہ تو اس پورے جہاں کی طرف رخ نہیں کریں گے یہ دنیا تو دنیا ہے۔ وہ چاند اور سورج کو بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کی بھی کوئی عظمت نہیں ہے۔

اللہ کے نام کے بغیر بڑی سے بڑی مخلوق کوئی حقیقت نہیں رکھتی..... اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین کی دعوت دینی شروع کی پورے عرب کے اندر آپ کی دشمنی جیسے گئی خود آپ کے عزیز و اقربا و دشمن بن کے کھڑے ہوئے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کا دین پھیلانے والے تھے۔ کسی کی دوستی، دشمنی کی آپ کو کیا پروا تھی آپ دین پھیلاتے رہے اور ابوطالب تھے تو اپنے آبائی دین پر، مگر حمایت و مدد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے تھے۔ قوم کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، وہ جمع ہو کر ابوطالب کے پاس آئے اور کہا اے ابوطالب! تمہارے بھتیجے نے ہمارے ناک میں دم کر دیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں ہمارے آبائی دین کو یہ ترک کرانا چاہتے ہیں اور نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ ہم سے یہ برداشت نہیں ہوتا مگر ہم اس سے مجبور ہیں کہ تم ان کے حمایتی ہو تم ہمارے بڑے اور سردار ہو اس لئے ہم تمہیں واسطے بناتے ہیں کہ تم اپنے بھتیجے سے ایک دفعہ ہماری طرف سے کھل کر بات کر لو کہ وہ چاہتے کیا ہیں؟ جو وہ چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر خدا کے لئے اس کلمہ سے باز آ جائیں آپ ایک دفعہ ان پر رحمت تمام کر دیں تاکہ ہم لوگ بھی آزاد ہو جائیں پھر جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے جو انکا جی چاہے گا وہ کریں گے اب تم آڑے آ جاتے ہو تمہاری وجہ سے ہم مجبور ہیں۔

ابوطالب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بھتیجے! تیری قوم کے سردار سب کے سب جمع ہو کر میرے پاس آئے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ تمہاری قوم یہ کہتی ہے کہ اگر تمہارا مقصد دولت ہے، تو ہم پورے حجاز کی دولت سمیٹ کر ان کے قدموں میں لاکے ڈال دیتے ہیں۔ آج سے وہ اس

دولت کے مالک اور ہم ان کے تابع اور اگر ان کا مقصد حسن و جمال ہے تو حجاز کی جتنی بیٹیاں ہیں، تو وہ سامنے کئے دیتے ہیں جتنی چاہیں وہ پسند کر لیں ہم ان کی خدمت میں پیش کریں گے اور اگر وہ اقتدار و کھومت چاہتے ہیں تو ہم سارے مل کے آج سے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔ جو وہ چاہیں اس کے لئے ہم تیار ہیں دولت، اقتدار اور بیٹیاں حاضر ہیں۔ یہ لے لیں، مگر خدا کے لئے یہ کلمہ بلند نہ کریں، ہمارے بتوں کی توہین نہ کریں، اس سے باز آ جائیں اور ہم سب چیزیں دینے کو تیار ہیں۔ ابو طالب نے کہا کہ میرے بھتیجے! تیری قوم یہ کہہ رہی ہے اور مجھے کیا مہربانی کے بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا! آپ نے جو کہنا تھا کہہ چکے؟ کہا کہ ہاں کہہ چکا۔ فرمایا، اب میری سن نیچے ”خدا کی قسم اگر میری قوم میرے دائیں ہاتھ پر سورج نہ کے رکھ دے اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکے رکھ دے تب بھی میں یہ کلمہ نہیں چھوڑوں گا یا عالم میں اس کلمہ کو میں پھیلا کے رہوں گا یا اپنی جان قربان کر دوں گا۔“ ①

اس سے اندازہ ہوا کہ دنیا تو دنیا ہے چاند، سورج اور آسمان کی چمک دمک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکرا دیا یہ کلمہ جب تک میرے پاس ہے، نہ مجھے چاند عزیز ہے نہ سورج۔ معلوم ہوا یہ کلمہ چاند، سورج سے بھی زیادہ اونچی چیز ہے۔ یہ اللہ کا نام ہے۔ اللہ کے نام سے ہی تو عالم زندہ ہے چاند، سورج بے چارے کی حقیقت کیا ہے۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے۔ جس کے لفظ اس قسم کے ہیں کہ میں اس نام سے التجا کر رہا ہوں جو تو نے قرن طس پر لکھا ہے۔ آفتاب کے اوپر جو آپ نے نام لکھا ہے جس کی وجہ سے آفتاب کو زندگی ملی ہے میں اس نام سے تیرے سے دعا کرتا ہوں تو چاند اور سورج کی زندگی اللہ کے نام سے ہے۔ عرش عظیم اگر زندہ ہے۔ تو اس کے پایلوں پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسی نام سے وہ قائم ہے تو ذکر اللہ اور نام خداوندی سب سے اونچی چیز ہے۔ اس کے مقابلے میں سورج، چاند حتیٰ کہ عرش و کرسی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ عرش و کرسی کی عظمت بھی تو اللہ ہی کے نام سے ہے۔ اگر اللہ میاں عرش و کرسی سے اپنے نام کو جدا کر دیں تو ہزار عرش و کرسی ہوں، کوئی وقعت نہیں لیکن چونکہ اللہ کے نام سے لگ گئے ہیں، اس واسطے وہ با عظمت بن گئے۔

قلب محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ذکر اللہ کا خزانہ ہے..... اس سے اندازہ کیجئے کہ سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی اور لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی اس لئے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے اور ﴿وَلِلَّهِ الْغَنِيُّ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن ہائی نہیں رہتا۔

① فی خلال القرآن للسید لطیف المصری، ج ۶، ص: ۲۹۳، سورۃ الفلق

② ہارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآية: ۳۵

اللہ کے اسم مبارک کا وزن..... حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ میدانِ محشر میں ایک شخص حاضر ہوگا اور گناہوں کے ننانوے دفتر اسکے ساتھ ہوں گے یعنی اتنے گناہ کئے ہوں گے کہ ننانوے دفتر گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ایک ہی دفتر اتنا بڑا ہوگا کہ اسے پھیلایا جائے تو زمین و آسمان اس میں چھپ جائیں تو بتایا اٹھانوے دفتر کتنے بڑے ہوں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہ اتنے زیادہ ہوں گے کہ جہانوں میں اس کی سائی نہیں ہوگی۔ وہ میدانِ محشر میں حاضر ہوگا حق تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی وہ دفتر سامنے رکھے جائیں گے اور وہ دل میں یقین کئے ہوگا کہ میری نجات کی کوئی صورت نہیں ننانوے دفتر جو ہیں۔

تو یہ بتا رہے کہ حق تعالیٰ ابھی حکم دیں گے کہ اسے جہنم میں پانچاؤ ذیہای قابل ہے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے بندے! یہ گناہ تو نے کئے؟ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے کئے فرمائیں گے تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ کہے گا کہ اے اللہ! کوئی عذر نہیں، محض اپنی سیاہ بختی، شقاوت اور بد نصیبی سے میں نے یہ برے اعمال کئے۔ کوئی جنت میرے پاس نہیں میں نے اپنے نفس کی خواہشات پوری کی ہیں۔ لذاتِ نفس میں گرفتار تھا۔ کسی جنت اور دلیل سے میں نے یہ گناہ نہیں کئے۔ اب اسے یقین ہے کہ ابھی حکم ہوگا کہ اچھا پھر جا جہنم میں۔ حیران کانا ہمارے پاس نہیں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے، تیرے ان ننانوے دفتروں میں تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے۔ تو ایک جھوٹی سی پرچی نکلے گی کہ ساری عمر میں اس نے نیکی کیا کی؟ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ یہ کلمہ پڑھا گو یا بس مسلمان تھا۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھا، یہی ایک نیکی باقی کوئی اور نیکی اس کے پاس نہیں تو ننانوے دفتروں میں نیکی کی ایک جھوٹی سے پرچی پڑی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری ایک نیکی یہی ہے اور جا کر میزانِ عمل میں اپنا نامہ اعمال لکھو اور اپنی مگرانی میں لکھو وہ بندہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔

”زَبَّ مَضَلُّهُ الْبَطَافَةُ؟“ اے اللہ! ان ننانوے دفتروں کے مقابلے میں یہ ذرا سی پرچی کیا حقیقت رکھتی ہے؟ میں تو جہنم کے قابل ہوں، مجھے جہنم میں بھیج دیجئے میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے، نہیں ﴿لَا ظَلَمَ الْيَوْمَ﴾ ① ہمارے ہاں ظلم نہیں ہے۔ رتی رتی کا حساب ہوگا ان اعمال کو جو کلمہ اور اپنی آنکھوں کے سامنے لکھی تھے یہ خطرہ پیدا نہ ہو کہ میرے فرشتوں نے تیرے اوپر کوئی ظلم کر دیا یا ناپ تول میں کوئی کمی کر دی۔

یہ پھر عرض کرنے کا، یا اللہ! آپ مجھے کیوں رسوا کرتے ہیں۔ فرمائیں گے نہیں لکھا جا کے، یہ لکوائے گا تو ایک پلڑے میں ننانوے دفتر رکھے جائیں گے دوسرے پلڑے میں یہ پرچی رکھی جائے گی۔ جب تولیس گے تو ننانوے دفتر ہلکے پڑ جائیں گے اور پرچی کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور تول میں غالب آ جائے گا فرمائیں گے تیرے لئے

جنت اور نجات ہے اور جب بیان فرمائیں گے۔ ﴿وَلْيَذْكُرُوا اللَّهَ أَكْثَرَ﴾ ① اللہ کا ذکر سب سے وزنی چیز ہے تو لاکھوں برس کے گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ بھی توبہ کر لے اس توبہ کا وہ وزن ہے کہ لاکھوں برس گناہ کرتا رہے، لیکن ایک دفعہ بھی توبہ کر لے اس توبہ کا جو وزن ہے وہ عالم کی کسی چیز کے اندر نہیں ہے۔ اس کو نجات دے دی جائے گی تو یہ ہے ﴿وَلْيَذْكُرُوا اللَّهَ أَكْثَرَ﴾ ② کہ ایک ذرا سی پرچی تناوے دفتروں پر غالب آگئی خدا جانے اس نے کس اخلاص سے یہ اللہ کا نام لیا ہو گا کہ اس اخلاص کے وزن نے ہر چیز کو ہلکا کر دیا۔ ③

حضور قلب سے ذکر میں وزن پیدا ہوتا ہے..... اصل میں وزن جو ہے وہ اخلاص کا ہوتا ہے۔ بھرات دن اللہ اللہ کہتے جائیں لیکن غفلت کے ساتھ کریں۔ روح کے اندر بے داری اور دل میں خلوص نہ ہو، دنیا کے دکھاوے کے لئے ہو، تو اللہ اللہ تو کیا مگر یہ اللہ اللہ ڈھانچہ ہے۔ اس میں روح نہیں ہے جس سے قدر و قیمت بڑھتی ہے اور وزن قائم ہوتا ہے۔ یہ وزن درحقیقت دو یا وحی ہے صرف اللہ اللہ کہہ دینا کافی نہیں۔ جب تک کہ لفظ اللہ کے ساتھ دل کی یاد بھی شامل نہ ہو زبان سے اللہ اللہ ہو اور دل میں غفلت بھری ہوئی ہو جس کو مونا رومی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ۔

برزبان تسبیح ، درد دل محاذ فر
ایں چہیں تسبیح کے دارو اثر
زبان پر تو تسبیح جاری ہے، مگر دل میں مگر بار کے خیال بھرے ہوئے ہیں۔ بات دوکان کی سوچ رہا ہے اور زبان پر اللہ اللہ جاری ہے یہ ذکر توبہ ہے مگر قلبی ذکر نہیں، زبانی ذکر ہے۔ تو جو زبان سے اللہ اللہ کہا جائے، دس ساتھ نہ ہو، وہ کافی نہیں وہ بار و روح ڈھانچہ ہے۔ وہ ڈھانچہ کتنا ہی بڑا ہو، اس کی کوئی وقعت نہیں کسی پہلوان کا لاشہ پڑا ہوا ہو اور بڑا ڈیل ڈول کا ہو مگر انتقال ہو چکا ہو اس کی کیا قدرت و قیمت ہے؟ اور ایک دن زندہ مریض ہے۔ اٹھنے کے قابل نہیں مگر زندہ ہے اس کی وقعت ہے اگر اسے کوئی قفل کر دے گا تو پھانسی چڑھے گا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ صاحب! یہ تو ایک منٹ میں خود ہی مرنے والا تھا۔

آپ مجھے کیوں پھانسی دیتے ہیں یہ میرا ہی تھا میں نے لاشی مار دی سر گیا۔ کہا جائے گا کہ جاندار کو مارا ہے۔ جان پر حملہ کیا اس لئے تجھ سے قصاص لیا جائے گا۔ اور پہلوان کی لاش پر پچاس لاشی مار دے کوئی قصاص نہیں اس لئے کہ اس میں جان ہی نہیں تھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں پتھر کی زیادہ قیمت ہے لاش کی کوئی قیمت نہیں۔ ایک پتھر آپ کا چند روپے میں بک جائے گا۔ اور لاش دس پیسے میں بھی نہیں بکے گی۔ اس واسطے کہ پتھر کو ستون بنائیں کھڑا کر کے عمارت بنائیں گے۔ اور لاش کو آپ کہاں کا ستون بناویں گے؟ وہ کسی کام کی نہیں وہ یا تو دفنائی جائے، یا جلائی جائے، یا بہائی جائے، اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ تو اصل میں قدر و قیمت جان سے ہوئی۔ اللہ اللہ کرنا،

① ہمارہ: ۲۱۔ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ② ہمارہ: ۲۱۔ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔ ③ السنن لمترمذی، ابواب الايمان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب ما جاء فی من یحرف و هو مشہد..... ج: ۹، ص: ۲۳۴، رقم: ۲۵۶۳۔

نماز پڑھنا، ذکر و دعا، حج کرنا ایک ڈھانچہ ہے۔ اس کی روح ذکر اللہ یعنی یاد حق ہے۔ دل میں بے داری، تنہا اور اللہ سے لگاؤ یہ روح ہے جب یاد حق نہیں تو زبان سے کتنے ہی لفظ ادا کر لیں ان کی کوئی قیمت نہیں جب تک لفظ کے اندر معنی نہ ہوں معنی کی اصل میں قدر و قیمت ہے۔ تو قیامت کے دن ﴿وَلْيَذْكُرِ اللَّهُ الْحَبْرُ﴾ ① کا ظہور ہوگا کہ ایک اتنی سی پرچی ننانوے دفتروں پر غالب آئے گی اس لئے کہ اس نے صرف لفظ اللہ نہیں کہا تھا بلکہ اللہ کہنے میں اس کا اخلاص اور قلب کا لگاؤ شامل تھا۔ تو ذکر کے معنی اللہ اللہ کہنے کے نہیں، ذکر کے معنی دل کے بیدار ہونے کے ہیں کہ یاد رکھی ہوئی ہو اس یاد سے کلمات جو نکل رہے ہوں وہ کلمات یاد خداوندی کے اندر ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں وہ ذکر اللہ کہلاتے ہیں۔ وہ جب دل میں ہوگا تو چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی کہے گا اس کی بھی قدر و قیمت ہوگی۔

الفاظ میں جذبات قلب سے تاثیر پیدا ہوتی ہے..... اللہ والوں کے چھوٹے جملوں میں بھی جوتا حیر ہوتی ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں ہوتی وہ لفظوں کے اندر معنی اور دل کی یاد سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر ہوتی ہے۔ جو دلوں پر پڑتی ہے۔ ورنہ محض شاعری کی کیا تاثیر ہے کوئی بڑا اچھا فصیح و بلیغ کلام بول دے شاعروں سے بڑھ کر فصیح و بلیغ کون ہوگا۔ لیکن شاعر پچاس غزلیں پڑھ لیں اثر کچھ بھی نہیں ہوتا لوگ واہ واہ تو کر دیں گے لیکن آگے اس کا کوئی اثر نہیں لوگ دل میں کچھ نہیں لے کے جاتے اسلئے کہ اس کے اندر معنی نہیں ہیں محض لفاظی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شاعر کسی امیر کے ہاں گئے تھے۔ تو انہوں نے جا کے وہاں قصیدہ پڑھا اور شعر ہے: وہ جس میں جھوٹ زیادہ ہو اور سچ کم ہو اگر شعر کے اندر ساری سچی پکی باتیں ہوں، وہ شعر ہی کیا ہوا؟ تو جب تک اس میں مبالغے اور بہت سی باتیں جھوٹ نہ ہوں، شعر خفا نہیں کسی نے کہا ہے کہ شعر کی تعریف کیا ہے کہ ”أَحْسَنُهُ أَكْثَرُ ذُكْبَةٍ“ جو سب سے زیادہ جھوٹا شعر ہوگا وہ سب سے زیادہ عمدہ شعر ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں مبالغہ زیادہ ہوگا تو لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں۔ معنی اس کے اندر نہیں ہوتے۔ خیر وہ شاعر صاحب ایک لمبا جوڑا قصیدہ نواب کی شان میں لکھ کے لے گئے اور اس میں خوب ایران توران کی ہانگی کہ آپ کا جو تخت سلطنت ہے اس کا پایہ آسمان کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ اور آپ کی کلاہ تاج ہے اس کا کثر اساتوئیں آسمان تک پہنچا ہوا ہے، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے تریا بھی ماند ہے اور چاند کی کوئی روشنی ہی نہیں جو آپ کی آنکھوں میں چمک ہے اور آپ کے ہاتھ میں جو قوت ہے تو بجلی بھی وہ کام نہیں کر سکتی، جو آپ کا ہاتھ کرے گا غرض ایران توران کی ہانگی۔

امیر صاحب بہت خوش ہوئے کہ اس نے بڑی تعریف کی تو قصیدہ سنتے ہی کہا کہ پرسوں آنا تمہیں ہم دو ہزار روپیہ انعام دیں گے یہ بہت خوش ہو گئے اور جاتے ہی پانچ سو روپے قرض بھی لے لئے اور گھر میں مرغ بھی پک رہا ہے اور لہاس وغیرہ بھی خوب بنائے کہ پرسوں کو تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو قرضے کے ادا کر دیں گے تو ان میں سے پھر بھی باقی بچ جائیں گے مجھ سے زیادہ اب امیر کون ہوگا۔

چنانچہ وہ حسب وعدہ بڑی عمدہ شیر وانی پہن کر وہاں پہنچ گئے، اب وہ امیر صاحب بیٹھے ہیں، نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے، انہوں نے سلام کہا، انہوں نے گردن بھی نہیں اٹھائی، تھوڑی دیر تو یہ بیٹھے اس کے بعد کھانا شروع کیا، مگر امیر صاحب نے جب بھی کچھ نہیں سمجھا آخر یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضور میں حاضر ہوں۔ آپ کون ہیں؟ وہی جو پرسوں شاعر آیا، قصیدہ کہا تھا تو حضور نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دو ہزار دیں گے، میں اس وعدے کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، ارے بھائی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا تھا۔ ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا تھا۔ نہ ان لفظوں کے کوئی معنی تھے نہ ان لفظوں کے کوئی معنی۔ جو قصیدہ تم نے کہا تھا اس کے لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں تھے اور ہم نے جو دو ہزار کے لفظ کہے تھے تو ان لفظوں کے بھی کوئی معنی نہیں۔ بڑے بے وقوف آدمی ہو تمہیں صلہ چکا۔ اس نے کہا حضور! میں تو پانچ سو روپے قرض بھی لے چکا ہوں اگر تم نے لئے تو جھک مارا۔ کس نے تم سے کہا تھا؟ معلوم ہوا تم بے وقوف بھی ہو شاعر نہ ہوتے، عقلمند تو ہوتے عقل کی کچھ تو قیمت ہوتی۔

تو حقیقت یہی ہے کہ لفظوں کی کوئی قدر قیمت نہیں ہوتی جب تک لفظوں کے اندر معنی نہ ہوں اور معنی کے اندر دلی جذبات نہ ہوں اس وقت تک لفظوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہم جیسا کوئی اللہ اللہ کرے گا تو وہ محض زبان سے ہوگا وہ کی بیداری شامل نہیں ہوگی اور اللہ والے جو اللہ اللہ کرتے ہیں۔ تو دل کا ذکر، محبت و معرفت، وگاؤ نسبت اور تعلق اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس لئے جو لفظ نکلتے ہیں وہ قلوب کے اوپر تاثر کرتے ہیں۔

حضرت قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا رکن الدین پڑھنے کے لئے دہلی گئے۔ اور آٹھ دس برس کے بعد بڑے اچھے عالم بن کر آئے۔ مریدین نے عرض کیا، حضرت! صاحبزادے عالم بن کے آئے ہیں اگر وعظ کرا دیا جائے۔ فرمایا، ہاں بھی! ضرور وعظ کہلاؤ جب علم پڑھا ہے تو علم کا اثر ظاہر ہو، دوسروں کو مسائل معلوم ہوں۔ صاحبزادے کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ وعظ کیا تمام لوگ خوش ہوئے بہت سے مسائل بیان کئے لوگوں نے مسائل سیکھے، تعریف کی لیکن کوئی خاص اثر پیدا نہ ہوا کہ لوگ رونے لگے ہوں یا آپ سے باہر ہوئے ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں بس یہ ہوا کہ بہت اچھے صحیح مسئلے بیان کئے دل میں قدر و قیمت تھی۔

جب مولانا رکن الدین وعظ کر چکے، تو حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ منبر کے قریب کھڑے ہوئے ایک جملہ کہا فرمایا، ”بھائی! رات عجیب بات پیش آئی، رکن الدین کی ماں نے فقیر کے لئے کھیر پکائی تھی، وہ کھیر پکا کے کھونٹے پھر دی، ملی آئی اور کھاکے چلی گئی فقیر مرد رہ گیا۔“ بس یہ کہنا تھا کہ ایک دم جو لوگوں پر گریہ طاری ہوا اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور مسجد میں ایک طوفان پھا ہو گیا اب اس میں آخر کیا چیز تھی؟ کھیر پکی رکھی تھی، ملی آئی وہ کھا گئی تو یہ کون سے حقائق و معارف تھے؟ مگر حقیقت میں وہ جو قلب کی تاثیرات تھیں ان تاثیرات نے ان الفاظ کو آلود بنایا اور الفاظ نے کانوں کو کھٹکھٹایا اور دل کی تاثیر الفاظ کے راستے سے دل پر پڑی اور دلوں میں محبت الہی بھری اور

انہوں نے چیخا اور چلانا شروع کر دیا۔ تو یہ لفظوں کا اثر نہیں تھا۔ شیخ کے قلب کا اثر تھا۔ اصل میں اہل اللہ دل میں اثر لاتے ہیں۔ الفاظ محض ان کا آلہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی قیمت نہیں ہوتی۔ کسی اللہ واسلے کے پاس سے آپ قلب میں کوئی اثر لے کے جائیں کوئی آخرت کا دین کی عظمت و محبت کا وہ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا، وہ قلب کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اس کے قلب میں کوئی اثر نہ آتا وہ بہتر سے بہتر لفظ کہتا آپ اس سے کوئی بھی اثر نہ لیتے۔ غلط تو اثر نہیں کرتے، وہ معافی کرتے ہیں تو معافی لفظوں کے اندر وہی ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ وہی تاثیر و تصرف ہے جس سے قلوب جگمگاتے ہیں۔ قلوب کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَلْيَذْكُرِ اللَّهُ الْكُفْرَ﴾ ① سب سے زیادہ وزنی چیز، سب سے زیادہ پر عظمت چیز وہ اللہ کی یاد ہے کہ دنیا و فیما اللہ کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یاد حق دل میں آ جائے تو بندہ عرش پر ہو جاتا ہے..... جب بندے کے دل میں یہ یاد آ جاتی ہے تو انہوں کی عظمتیں ایک طرف اور یہ چیز ایک طرف، اس کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خفایہ میں سے ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانداری بہت تھی اور مریدین کا جھوم رہتا تھا۔ دواڑ حاکمی سو تک آدمی، ان کے مریدین میں سے نواب میر خاں جو ہندوستان میں ریاست ٹونک ہے، اس کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاں مہمانداری بہت ہے اور کوئی دولت، جاگیر، جائیداد ہے نہیں ہے تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک ضلع ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا کہ یہ میں آپ کو دیتا ہوں اس کی ہزاروں روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ مہمانوں کا خرچ چلے گا اور وہ پتیل کے پترے پہ لکھ کے بھیجا کہ یہ میں بنام حضرت شاہ غلام علی عطیہ دیتا ہوں۔ یہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ آپ کے مرید نواب میر علی خاں ہیں۔ انہوں نے یہ پورا ضلع ہدیہ پیش کیا ہے۔ اس کی پشت پر شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ایک شعر لکھ کے بھیج دیا جیسے حضرت شیخ عبداللہ درجیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ شعر یہ تھا کہ:

ما آبروئے فقر و قوت عت نمی بریم ہا میر خاں مجوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے اور وہ آسمان سے آ رہی ہے۔ تمہارے وضع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ یہ اتنی استغناء اور اتنی بیداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دل کے اندر کوئی دولت جمع نہ ہو وہ دولت یہی ذکر اللہ کی تھی۔ ﴿وَلْيَذْكُرِ اللَّهُ الْكُفْرَ﴾ ② اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے تو ضلع، صوبہ، پوری دنیا کیا چیز ہے، ذکر اللہ کے سامنے چاند اور سورج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب وہ قلب میں آ جاتا ہے تو بندہ پھر عرش بن جاتا ہے عرش کے اوپر کی باتیں کرتا ہے نیچے کی نہیں کرتا تو یہ ہے وہ

ذکر اللہ جو ساری شریعت اور کائنات کی روح ہے۔ اگر اس دنیا میں سے ذکر خداوندی نکل جائے، اسی دن قیامت آجائے اور یہ خیمہ ختم کر دیا جائے اور اگر کسی کے قلب میں سے نکل جائے اسی دن ایمان واسلام ختم ہے۔ کسی قوم میں سے نکل جائے، وہ قوم بھی بے عزت ہے، اس کی آبرو اور عزت بھی ختم ہو تو ہر چیز میں دولت، عزت حکومت کچھ بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین و دیانت، یاد الہی اور یاد خداوندی شامل نہیں ہوتی اس وقت تک عالم میں کوئی چیز زندہ نہیں ہوتی کیونکہ سب چیزوں کی روح یہ ہے۔

ذکر اللہ کا مظہر اتم..... اس کا سب سے بڑا مظہر اتم جس سے ذکر الہی ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ نماز تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سے پہلے فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① نماز فحش سے، بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے بچاتی ہے، جو شریعت میں گناہ ہیں۔ ان سب چیزوں سے نماز بچاتی ہے اور آگے بطور دلیل کے فرمایا، ﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ ② نماز کی روح ذکر ہے اور ذکر سب چیزوں سے بڑا ہے۔ ذکر کی روشنی جب آئے گی تو کوئی عظمت اور تار کی اس کے آگے ظہر نہیں سکتی گناہ ہو، کچھ ہو، سب ختم ہو جائے گا۔

اس سے ایک شبہ کا جواب نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو خوب پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، مسجدیں بھی بنواتے ہیں، لاکھوں روپے بھی اس میں لگواتے ہیں اور بچے بچے کو لاتے ہیں مگر اس کے باوجود منکرات میں مبتلا ہیں۔ بعض بے غیرتی اور بے حیائی کی باتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ نمازی بھی ہیں۔ مگر یہ حرکتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ نماز فحش اور منکرات سے بچا دیتی ہے۔ حالانکہ ہم نمازی بھی ہیں پھر بھی منکرات میں مبتلا ہیں۔

اس شبہ کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ آپ اس سے متبادلہ کیجئے جو بالکل نماز نہیں پڑھتا۔ اس میں کتنے منکرات ہیں اور نمازی میں کتنے ہیں۔ زمین و آسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نماز پڑھنے والا اگر مبتلا بھی ہوگا تو اتنی برائی نہیں ہوگی جتنی بے نمازی کے اندر ہوتی ہے۔ نمازی کے دل میں پھر بھی خوف خدا تھوڑا بہت موجود ہوگا تو ایک جواب تو یہ ہے، جو سرسری ہے کہ اللہ کا ذکر اور نماز بلاشبہ منکرات سے بچاتی ہے۔ آپ نہیں بچ رہے ہیں۔ تو یہ اصل میں زیادہ میں مبتلا نہیں، کم میں مبتلا ہیں۔ جو بالکل نماز نہیں پڑھتے وہ اس سے زیادہ میں مبتلا ہیں تو کسی نہ کسی حد تک تو آپ کو نماز نے بچا دیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، ہمارے مرشد بھی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی ہیں۔ ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے استاذ اور مولانا محمود رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ یہ دارالعلوم کا ابتدا یہ ہے کہ وہ محمودوں سے ابتدا ہوئی۔

اللہ عاقبت محمود گرواں

① پڑھا ۲۱، سورۃ الفصحت، الآیۃ ۳۵ ② پڑھا ۲۱، سورۃ الفصحت، الآیۃ ۳۵

جب ابتدا محمود ہے تو ان شاء اللہ عاقبت بھی محمود ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حضرت مولانا عزیز گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ سادات میں سے تھے۔ مگر ہیں سرحدی تو وہاں کے سادات کو بھی خان ہی کہتے ہیں۔ سب پٹھان کے لقب سے معروف ہیں۔ پٹھان اور خان گویا ان کے ہاں ایک عظمت کا لفظ ہوتا ہے۔

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں کے اخبارات نے شائع کیا کہ مولانا محمد طیب خاں حالانکہ میں پٹھان نہیں۔ مگر وہ خان عزت و عظمت کا لفظ ہے۔ تو مولانا عزیز گل صاحب گویا انہیں عرف کے لحاظ سے سرحدی پٹھان کہنا چاہئے یوں تو سادات میں سے ہیں۔ وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں بڑے دخل تھے اور بعض دفعہ اسنے جوش سے بات چیت کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے سے چھوٹے سے بات کر رہا ہو یعنی اسنے دخل تھے کہ بعض دفعہ بے ادبی کی بات ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح بخاری کے درس میں انہوں نے سوال کیا اور کہا حضرت! یہ مسئلہ کیسے ہے؟ حضرت نے سرسری جواب دے دیا بس کہنے لگے کہ خود کو نہیں آتا اور سرسری جواب دے کے آگے چل دیئے پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے اور جواب دینا آتا نہیں تو اس طرح سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ ان کی عام بات تھی کہ جب ہم لوگوں سے گفتگو شروع کرتے تو ”آپ“ سے شروع کرتے آپ نے یہ کہا، آپ نے یہ کہا۔ اس کے بعد جب جوش آتا تو ”تم“ کہتے تم نے یہ کہا، تم نے یہ کہا۔ اس کے بعد ”تو“ نے یوں کہا، تو نے یوں کہا۔ اور اس کے بعد یہ کہہ کر عیبیت تو نے یہ کیوں کہا۔ تو ”آپ“ سے شروع ہو کر ”غیبت“ پہانتا ہوتا تھی۔ ان کا ایک عام طرز تھا۔ تو بے تکلف بہت اور حضرت کی شان میں بعض جگہ بے ادبی کے کلمات کہہ دیتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عرض کیا کہ حضرت اسنے دنوں وہ آپ کی صحبت میں رہے اور انہیں تہذیب نہ آئی اسنے بے ہودہ اور بھدے کلمات کہہ دیتے ہیں۔ میں بچپن میں آپ کی صحبت اٹھائی اور پھر بھی آدمی نہ بنے۔

حضرت نے فرمایا: یوں خیال کرو، اگر یہ میں بچپن میں صحبت میں نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ جب رہ کر اترتے ہوئے، اگر بالکل نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ تو وہی میں کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھ کر اتنی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ بالکل نہ پڑھتے تو کیا ہوتے؟ اور کتنی برائیاں کرتے؟ تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ نمازی اگر مبتلا بھی ہوگا تو کم مبتلا ہوگا بے نمازی زیادہ مبتلا ہوگا۔

لیکن اصل جواب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اگر آدمی نفس سے نہیں بچتا، بے حیائی اور برائی سے نہیں بچتا اس نے نماز کا ڈھانچہ قائم کیا اور جو ذکر اللہ کی روح ہے، وہ قلب کے اندر نہیں ہے، روح ہوتی، یقیناً نکلتا جاتا۔ تو نماز بے حیائی سے بچاتی ہے۔ جب کہ نماز جاندار ہو اور اگر بے جان پڑھے جس کے اندر روح ہی نہ ہو تو لاشہ ورڈھانچہ کوئی چیز نہیں وہ تو کام نہیں کر سکتا تو نماز بھی کام نہیں آسکے گی نماز الھک، بیٹھک کا نام نہیں ہے۔ نماز عظمت خداوندی اور یاقین کا نام ہے کہ دل اللہ کی یاد میں غرق ہے دوسری چیزیں دل سے فاصلہ ہو جائیں تو جتنی

یاد زیادہ ہوگی، اتنا ہی بے حیائی سے بچے گا جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم بچے گا۔ بالکل نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے، جب بھی نہیں بچے گا اس لئے کہ جان تو ہے ہی نہیں تو صل جواب یہ ہے کہ نماز بلاشبہ بخش سے بچاتی ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کا کلام حق ہے۔ ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ ① یقیناً نماز بے حیائی سے اور منکرات سے بچاتی ہے۔ بچاتی کیوں ہے؟ ﴿وَلْيَذْكُرُوا اللّٰهَ الْأَكْبَرُ﴾ ② اس لئے کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ ③ نماز ذکر اللہ ہی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ذکر روح ہے اگر روح نہیں ہوگی تو نہیں بچائے گی۔

روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے..... لیکن میں اتنی بات عرض کئے دیتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھئے کہ پورا ذکر تو ہے نہیں، ہماری نماز تو صورت ہی صورت ہے۔ یہ برائی سے بچاتی نہیں، تو آج سے اسے بھی چھوڑ دو اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا نہیں اس صورت کو قائم رکھو اس لئے کہ جو صورت بنا رہا ہے تو وقت آئے گا کہ اس صورت میں ہی روح آجائے گی اگر صورت ہی نہیں بنے گی تو پھر روح کس میں آکر پڑے گی؟ اس واسطے اس صورت کو بھی قائم رکھو۔ اگر روح نہ ہو، شکل اس کی بنائے رکھو اچھی شکل میں، اچھی حقیقت آجاتی ہے۔ آج نہیں آئے گی، کل آئے گی پڑھتے پڑھتے کسی دن تو خیال ہوگا کہ ابھی ایہ جو محض رمی اور تصویر کی نماز پڑھ رہا ہوں، یہ بے کار نہ جائے۔ اس میں جان پیدا کرو تو پڑھتے پڑھتے چند دن کے بعد دھیان آسکتا ہے۔ اور روح بن جائے گی اس واسطے چھوڑنا اسے بھی نہیں چاہئے جیسے مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ نے کہا کہ۔

بہر دین و بہر دنیا و بہر ذم اللہ اللہ کردہ باید والسلام

تم اللہ اللہ کرو، دنیا کے لئے کرو، دکھ دے کے لئے کرو، نام و نمود کے لئے کرو، کرتے رہو اس لئے کہ کرتے رہو مگر وہی میں خلاص بھی آجائے گا اور بالکل ہی گھبرائے گا تو مسافر آکے ٹھہرے گا کہاں؟ تو گھر بنالے، ممکن ہے ذکر اللہ کا مسافر آجائے اور آکر اس کے اندر مقیم ہو جائے۔ تو چاہے ریاکاری کی نماز ہو، چاہے بے دھیانی کی ہو، قلب میں آچھ نہ ہو مگر فرض ادا کرتے رہو صورت ہی ان شاء اللہ چند دن کے بعد اپنی طرف کھینچ لے گی تو یہ دوسرے نہیں آنا چاہئے کہ جب اس میں روح نہیں تو پڑھنے سے فائدہ کیا؟ فائدہ ہے کم سے کم مفتی فتویٰ دے رہا ہے کہ نماز ہوگئی اسے دل کی خیر نہیں اور جب اللہ کی ہزاروں مخلوق نمازی کہے گی تو عند اللہ بھی معتبر ہوگی۔ تو جب سرکاری گواہوں نے گواہی دے دی کہ نماز آدمی نمازی ہے تو عند اللہ بھی نمازی ہے۔ تو کیا خبر ہے کہ یہ نمازی کی صورت ہی آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے اس لئے چھوڑنا نہیں چاہئے۔

بہر حال مجھے اس ساری آیت سے کلام کرنا نہیں تھا کہ میں نماز کی حقیقت بیان کر دی اور پھر یہ بیان کروں کہ نماز کس طرح منکرات اور بے حیائی سے بچاتی ہے بلکہ صرف ذکر اللہ کے بارے میں چند باتیں کہنی تھیں جو

① پارہ ۲۱، سورۃ الصکوت، الآیۃ ۳۵، ② پارہ ۲، سورۃ النکیرات، الآیۃ ۳۵، ③ پارہ ۱۶، سورۃ فتحہ، الآیۃ ۱۳۔

آیت کا دوسرا جز ہے ﴿وَلِذَٰلِكَ يَخْشَى اللَّهَ الْغَافِرُونَ﴾ ① وہ بھی اس لئے کہ وہی سارے عالم اور ساری شریعت کی روح ہے۔ شریعت سے ذکر اللہ نکل جائے تو شریعت کے اعمال و حانچہ بن جائیں گے۔ دنیا کے اندر ذکر اللہ نہ رہے، تو یہ دنیا بے جان لاش بن جائے گی اور ختم ہو جائے گی اس واسطے ذکر اللہ کی رعایت کرنی چاہئے۔

ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت اور اس کے لئے سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتلائے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی بچے کو وہ یاد کرادئے جائیں۔ موقع بموقع کی دعائیں ہیں۔ ان کو ذکرِ کثیر کہا گیا ہے تو جب وہ دعائیں پڑھائیں تو قرآن حکیم میں جو حکم ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾ (۱) اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثیر کرو تو کثرت ذکر کیا ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرت ذکر یہ کہ مختلف اوقات میں جو اذکار اور دعائیں آتی ہیں وہ ان اوقات میں پڑھی جاتی رہیں، تو ذکرِ کثیر ہو گیا مثلاً جب چار پانی پر سونے کے لئے لیٹیں تو اس کی دعا الگ ہے کہ ”يَا مُسْمِكُ اللَّهُمَّ افْرُثْ وَأَخْبِرْ“ (۲) یا سو کے انھیں اس کی دعا الگ ہے کہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ“ (۳) یا کھانا کھانے کے بعد کی دعا ہے کہ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَآوَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ (۴) یا استنجائے کے لئے جانے پانے میں یا یاں قدم رکھے اور کہے کہ ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخَبَائِثِ“ (۵) اور جب واپس آئے تو دایاں پاؤں پہلے رکھے اور کہے: ”عَفْرَانِكَ، الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذَى وَعَافَانِي“ (۶) یا جب لباس پہنتے پڑھئے: ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَسَانِي هَذَا وَزَوَّجَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةَ“ (۷) ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِهِ وَغَيْرِ مَا صُنِعَ لَهُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهُ“ (۸)

یاشٹا بھدی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے۔ کہ ”اللّٰهُمَّ حَبِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَبِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْنَا“ ⑪
 اولاد و قدر ہوگی تو صالح اولاد پیدا ہوگی۔ یاشٹا ہزار جاے تو ہزار میں جانے کی دعا یہ ہے۔ ”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ
 صَفْقَةً رَابِعَةً وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ صَفْقَةٍ خَامِسَةٍ“ ⑫ ”وَلَقَطْنَا: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ حَبْرَ هَذِهِ السُّورِ

① باره: ٢١، سورة العنكبوت، الآية: ٥٥. ② باره: ٢٢، سورة الاحزاب، الآية: ١٠. ③ الصحيح للبخارى، كتاب

البدعوات، باب ما يقول إذا قام، ج: ١٩، ص: ٤٣٧ رقم: ٥٨٣٤. (٣) الصحيح لبخاري، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا قام، ج: ١٩، ص: ٤٣٧ رقم: ٥٨٣٤. (٥) السنن لابي داود، كتاب الأضغفة، باب ما يقول إذا قام، ج: ١٠، ص: ١٠٠.

٣٣٣ رقم: ٣٣٥٢ (١) الصحيح للبخاري، كتاب الوضوء، باب ما يقول عند الخلاء، ج: ١، ص: ٢٧٧ رقم: ١٣٩.

④ السنن لابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب ما یقول اذا خرج من الخلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۶، رقم: ۲۹۷، (۵) السنن لابن ماجہ، کتاب اللباس، باب یاترجفہ، ج: ۱، ص: ۳۷۷، رقم: ۳۵۵، حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحیح ومعیف سنن ابی

١٩) الحسن لامي دازد، كتاب اللباس، باب اذا لبس جديدا، ج: ١١، ص: ٢٦، رقم: ٣٥٠٣.

⑩ الصحيح للبخاري، كتاب الإيمان، باب التسمية على كل حال، ج ١، ص ٢٣٣، رقم ١٣٨٠.

② المعجم الاوسط للطبرانی، باب من اسماء: محمد ج: ۱۲ ص: ۲۷۰. ظاهر انہی فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ

محمد بن ابان الجعفی ورو ضعیف؛ کنیت مجیب الزوائد، باب ما یقول اذا دخل السوق ج: ۳، ص: ۳۹۸.

وَحَسْرَ مَا فِيهَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا وَشَرَّ مَا فِيهَا، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُصِيبَ فِيْهَا صَفَقَةً خَاسِرَةً۔“ (اے اللہ! میں نفع کا سودا چاہتا ہوں اور گھٹانے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں)۔ یا سورج نکلے تو دعا بتلائی گئی ہے: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَنَا الْيَوْمَ غَالِبَةٌ وَجَاءَ بِالشَّمْسِ مَطْلَعَهَا۔“ (۱)

تو ہر موقع کا ایک ایک ذکر ہے۔ یہ اذکار علماء نے چھاپ بھی دیئے ہیں۔ اگر بچے کو ابتداء سے یہ یاد کرادیئے جائیں، تو یہ موتی ان کے قلوب میں بھر جائیں گے اور زندگی اسلام بن جائے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی کہ پانچ منے جاتے ہوئے یہ کھانے کے وقت یہ لباس پہننے کے وقت یہ دوستوں سے مصافحہ کرو، تو یہ کسی سے ملے تو یہ عادت پڑ جائے گی تو ایسی سے اسلامی زندگی بنتی ہے۔ یہ ذکر کثیر مفت میں ہاتھ آ جاتا ہے۔ تو بڑی آسان بات یہ ہے کہ بچوں کو یاد کرادی جائیں اور بڑے بھی اگر یہ کریں، تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں ساری یاد ہو سکتی ہیں۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ یہ دعائیں نہیں ہوں گی، زیادہ ہو تو سو ہو جائیں گی۔ تو ایک دن میں اگر ایک دعا یاد کر لے اور چار مہینے لگ جائیں، تو تین چار مہینے میں پورا دین حاصل ہو جائے یہ بڑے نفع کا سودا ہے، کوئی گھٹانے کی بات نہیں۔ تین مہینے نہیں، چار مہینے سہی اور بچے تو بہت جلدی یاد کرتے ہیں۔ چند دن میں یاد ہو جائیں گی اس طرح ذکر کثیر کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کر لیا جائے کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک آدھ گھنٹہ آدمی اللہ میاں کے لئے دے دے جو نہیں گھنٹے دنیا کی ضروریات کے واسطے اگر اس میں کچھ وقت اللہ کے نام پر نکال دے تو کون سے بڑی بات ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ساری زندگی اللہ کی ہوتی، چھوٹا مونا وقت دنیا کے کاموں کے لئے ہوتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں چوتھ سارا ہی وقت دنیا کے کاموں میں لگا دو تو ہوز اس وقت اللہ کے لئے دو۔ تو روزانہ صبح کے وقت بیٹھ کر ایک سو مرتبہ کہہ تجید، ”سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ۔“ (۲) سو مرتبہ استغفار، ”اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَآتُوْبُ إِلَيْهِ۔“ (۳) اور سو مرتبہ رُود و شریف پڑھ لیا جائے اور وہ مختصر یہ ہے: ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔“

یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ایک تین منٹ کی بات ہے۔ لیکن ذکر کثیر کی دولت مفت میں حاصل ہو جاتی ہے تو سوتے وقت بھی پڑھ لے اور صبح کو بھی پڑھ لے۔ دونوں وقت نہ سہی، چلو صبح کی نماز کے بعد پڑھ لو صبح نہیں تو سوتے وقت آدھ گھنٹہ دے دو تو آدمی ذکر اللہ کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا، درجہ و درجہ کسب اللہ اکبر (۴) کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ آدمی اگر دیر بننا چاہے تو دین بڑا آسان ہے۔ دنیا کمائی بڑی مشکل ہے۔ دنیا اس

(۱) مہیش کلکام ہے۔ عمل الیوم واللیلۃ، ج: ۱ ص: ۲۷۷، رقم: ۱۳۶۔ (۲) الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والنداء، باب فض النہیل والنسب، ج: ۱ ص: ۲۰۵، رقم: ۳۸۶۱۔ (۳) السنن لابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی الاستغفار، ج: ۳ ص: ۳۱۳، رقم: ۱۲۹۲۔ (۴) سورۃ الصکروت، الآیۃ: ۴۵۔

وقت تک نہیں آسکتی جب تک آپ چوبیس گھنٹے دن رات روکان میں نہ لگے رکھیں، ذکر اللہ اور دین آسکتا ہے۔ اگر ہمیں منٹ بھی دے دیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تو دنیا کمان مشکل، دین کمان آسان ہے۔ لوگوں نے آسان کو چھوڑ دیا اور مشکل کو اٹھیا کر لیا تو ﴿وَلْيَذْكُرِ اللَّهُ الْأَكْثَرُ﴾ کی تعلیمت یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ مختلف اوقات کی دعائیں یہ کی جائیں اور یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ صبح، شام یہ تین تسبیح پڑھ لیں اور نماز کی پابندی کی۔ تو انشاء اللہ بہت سی برکات اسی سے پیدا ہو جائیں گی۔

اس واسطے میں نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں گزارش کیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ذکر اللہ کرنے اور یہ دھواؤں کی توفیق عطا فرمائے اور حق تعالیٰ ہمیں اپنی مرغیات پر چلائے اور اپنے دین کی ہمیں محبت عطا فرمائے اپنی اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلوب میں ڈال دے۔ اس محبت سے عظمت پیدا فرمادے اور عظمت سے متابعت اور اطاعت و اتباع کی دولت نصیب فرمادے۔ (آمین)

”اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهْبَ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ. اللَّهُمَّ رَبَّنَا تُقْبِلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَأَوْرِثْنَا مَنَاسِكَكَ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ. وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ. بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ“

طریق اصلاح

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ خُرُوجِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَقْدِرِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللَّهُ إِلَى كَلَّةٍ لِنَسْأَسَ بَشِيرًا وَنَذِيرًا، وَذَاقُوا إِلَيْهِ بِأَذْنِهِ وَمِيرَاجًا مُبِينًا“
اُمّ یَعْلٰہ

دنیا کی ایک عام حالت، تمہید..... بزرگان محترم! اس دنیا کی بناوٹ اور ساخت پر ہم غور کریں، تو اس سے یہ
اندازہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دوسلے جاری ہیں۔ ایک خیر اور بھلائی کا، ایک شر اور برائی کا، ہر چیز میں یہ
دونوں باتیں موجود ہیں۔ انبیاء عظیم اسلام اور ملائکہ کی ذوات کو چھوڑ کر کہ وہ خیر محض ہیں دنیا میں جتنی چیزیں ہیں۔
ان میں کچھ بھلائی پائی جاتی ہے اور کچھ برائی۔ نہ کوئی خیر محض ہے نہ شر محض۔ ہر چیز میں سے ایک راستہ شر کا ایک اور
ایک بھلائی کا نکلتا ہے۔ روٹی جیسی نعمت جو ہم روز کھاتے ہیں، وہ جس طرح زندگی بناتی اور طاقت دیتی ہے۔ ذرا
بے اعتدالی ہو جائے، وہی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہی پانی، جس کے بارے میں فرمایا گیا، ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ
كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ① ہر چیز کو ہم نے پانی سے زندگی دی، یہی پانی اگر زیادہ پیاجائے تو تھکے پیدا کر دیتا ہے۔ یہی
موت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی ہوا حیات کا سبب ہے۔ اگر یہی زیادہ بکھج جائے، سانس اکٹڑ جاتی ہے۔ فنا کا
سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے زمین فرش بھی ہے اور قبر بھی بن جاتی ہے۔ موت کا بھی ذریعہ ہے، حیات کا
بھی۔ تو ہر چیز میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔

انسان کو دیکھا جائے تو جہاں اس سے بھلائیاں پہنچتی ہیں کہ جتنی بھلائیاں یہ کرتا ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی
جب شر پر آتا ہے تو اس سے اتنی شر پہنچتی ہے کہ شیطان بھی اتنی نہیں پہنچا سکتا، جتنی راتیں اس سے پہنچتی ہیں، اتنی
ایذائیں بھی پہنچتی ہیں۔ تو انسانوں میں کھانے میں، پہننے میں اور استعمال کی ہر چیز میں کچھ بھلائی ہے اور کچھ برائی۔
لیکن جہاں تک ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ برائی تو ہر شے کی ذات میں رکھی ہوئی ہے اور بھلائی باہر
سے لاکر اس کے اندر داخل کی جاتی ہے۔ ذات میں کوئی بھلائی موجود نہیں۔ جدوجہد اور محنت کرتے ہیں تو کچھ خوبی

① پلہ: ۷۱، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰۔

آ جاتی ہے۔ اگر محنت نہ کریں تو خرابی لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود اندر موجود ہے۔ فرض کیجئے کھانا ہے تو اس کی عمدگی یہ ہے کہ خوش ذائقہ خوش رنگ اور خوشبو ہوا ان صفات کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے کہیں آپ نعمت خاندان بنائیں گے، کہیں بہترین الماری بنوائیں گے جس کی جلد بھی ٹھنڈی ہو، ہوا بھی پھینکتی رہے۔ تاکہ کھانا خراب نہ ہو تو کھانے کی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر آپ کھانے کو سزا نا چاہیں کہ اس میں بد بو آنے لگے، خراب ہو جائے تو کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اپنی محنت چھوڑ دیجئے، دودن کے بعد سڑ جائے گا۔ بد بو آنے لگے گی، رنگ بھی بگڑ جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ برائی اس کھانے کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم ہوئی وہ اندر کی برائی خود بخود سامنے آ گئی۔

یا مثلاً ایک بہت عمدہ باغ ہے تو اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، ہر ابھرا ہو، شاداب ہو، درخت لہلہا رہے ہوں، ہنر چھایا ہوا ہو، ان خوبیوں کو دیکھ کر آپ بال بھی خرچ کریں گے، ملازم بھی رکھیں گے جو پانی بھی دے اور درختوں کی مگرانی بھی کرے تب جا کے باغ کی یہ خوبی برقرار رہے گی۔ لیکن اگر آپ باغ کو اجاڑنا چاہیں کہ وہ خشک ہو جائے اور جلانے کے قابل ہو جائے۔ تو نہ مالی اور تنخواہ دار ملازم رکھنے کی ضرورت، محنت بند کر دیجئے دس دن کے بعد وہ خراب، خشک ہو کر پتے جھڑیں گے، شاخیں ٹوٹیں گی۔ جلانے کے قابل ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ خرابی اس باغ کی ذات میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم کر دی۔ خرابی خود بخود اندر سے ابھر آئی۔ خرابی پیدا کرنے کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح مکان ہے۔ کئی لاکھ روپے لگا کر آپ نے بلڈنگ بنوائی۔ اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ملازم رکھتے پڑتے ہیں۔ تب مکان خوشنما اور بہتر طریق پر پاتی رہے گا۔ لیکن اگر آپ مکان کو اجاڑنا یا دیوانہ بنانا چاہیں، اس کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن کے لئے جھاڑو دینا چھوڑ دیجئے پہلے گرد بچے گا، پھر پلاسٹر گرے گا، پھر انٹیمس گریں گی۔ چند دن کے بعد مکان کھنڈر بن جائے گا، تو کھنڈر بنانے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں۔ عمدہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدگی کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ خرابی خود بخود بلا محنت اندر سے ابھر آتی ہے۔ یہ دنیا کی عام حالت ہے۔

برائی انسان کی ذات میں موجود ہے..... اسی پر اپنے آپ کو قیاس کیجئے۔ انسان بھی بہر حال دنیا ہی کی ایک چیز ہے۔ انسان کو کاٹل بنانے کیلئے محنت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی کو عالم بنائیں گے تو کسی مدرسہ میں بھیجتا پڑے گا، گھر پڑھائیں گے تو ایک عالم کو رکھنا پڑے گا۔ تنخواہ اسے الگ دیں گے خوشامد الگ کریں گے۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ الگ ہوگی کہ محنت کرے، تعلیم پائے تب جا کر وہ عالم بنے گا۔ لیکن جاہل بنانے کے لئے نہ آج تک کوئی مدرسہ کھلا نہ کسی معلم کو کھامیا کہ آپ ہمارے بچے کو جاہل بنادیں گے۔ جاہل خود ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا

ہے۔ علم کو لانے کے لئے معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہالت ذات میں موجود ہے۔ علم لا کر اسے چھپا دیا جاتا ہے جس کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگ خاراز آفتاب لعل گرد و درخشناں یا عقیق اندر یمن

سالہاں سال کی مدت چھپنے کہ سنگ خاراکا ایک پتھر آفتاب کی گرمی سے تپتے تپتے اور جلن لیتے جیتے صدیوں میں جا کر لعل بدخشناں اور یاقوت بنے گا۔ جس کی قیمت اٹھے گی تو یاقوت بننے کے لئے پتھر کو ضرورت پڑی کہ آفتاب کی گرمی کو سہے اس کی تپش کو جذب کرے تب جا کر لعل بنے گا۔ لیکن پتھر بنانے کے لئے وہ تو پہلے سے بنا بنایا پتھر ہے۔ لعل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ بے قیمت پتھر بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں تو شاعر نے خوب کہا کہ سینکڑوں برس ایک پتھر آفتاب کی کرنوں کو جذب کرے تب جا کے لعل بدخشانی بناتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ۔

ماہ ہا باید کہ یک پنبہ داند بعد کشت جامہ گرد و شاہدے رایا شہیدے راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ بخولہ کا ایک دانہ اسے زمین میں ڈالو مہینوں وہ مٹی میں دبے، اپنی ہستی کو ختم کرے، اس میں سے کوئل نکلے، درخت بنے، اس میں روئی لگے، پھر روئی کو صاف کیا جائے پھر دھن جائے، پھر کپڑا بنے والے کے ہاں بھیجا جائے کہ اس کے رہنے والے اور مشینوں پر لگائے کپڑا بنے تب جا کے کپڑا کسی محبوب کا لباس بنے گا یا کسی شہید کا کفن بنے گا۔ لیکن اگر یہ روئی کا دانہ محنت نہ اٹھائے۔ نہ اسے کپڑا بننا نصیب ہوگا، نہ جامہ محبوب بننا نصیب ہوگا۔ وہ محض ایک بخولہ کا دانہ ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تو بخولہ کے دانے میں یہ کمال آ جانا کہ اس میں سے نکلی ہوئی چیز محبوبوں کے سر پر جائے، جب ہوتا ہے جب بخولہ کا دانہ محنت اٹھائے مٹی میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کرے، اور کاشت کار کی محنتوں کو سہے تب جا کے اس رعبے پر پہنچتا ہے۔ کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑی اور بے کمالی پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ دانہ پڑا پڑا خود ہی خراب ہو جائے گا اور خوب کہا ہے۔ اسی شاعر نے کہا۔

سالہا باید تا یک کود کے از درس علم عالے گرد و نکو، یا شاعر شیریں سخن

سالہا سال کی مدت چاہئے کہ آدمی کا ایک نادان بچہ میاں جی کی مصیبتیں سہے۔ کتب میں جائے نو برس تک مصیبتیں اٹھا کر کورس کو حاصل کرے تب جا کے عالم یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔ لیکن اگر یہ محنت نہ اٹھائی جائے۔ تو جاہل رکھنے کے لئے کسی قسم کی محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ بے محنت جھوڑو، جاہل بنایا ہے تو جاہل بنانے کے لئے آج تک کوئی مدرسہ قائم نہیں ہوا۔ کوئی کہے کہ ہماری بچے کو جاہل بنادو۔ وہ کہے گا کہ جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ بنانا چاہتے ہو تو عالم بنادو گا بشرطیکہ یہ بھی محنت کرے اور میں بھی محنت کروں۔ تو خوبی محنت سے لائی جاتی ہے۔ خرابی کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خرابی ہر چیز کی ذات میں موجود ہے۔

بااخلاق بنانے کے لئے مربیوں کو محنت کرنی پڑے گی۔ مربیان دین کے سپرد کرنا پڑے گا، شیوخ طریقت محنت کریں گے، اپنے مرید سے محنتیں کروائیں گے۔ جب جا کے برہسہارس میں اس کے اخلاق درست ہوں گے۔ تو خانقاہ اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اخلاق کو درست کریں کیریئرز کی اصلاح کریں۔ انسان کو اعلیٰ انسان بنائیں۔ آج تک کوئی خانقاہ اس لئے قائم نہیں ہوئی کہ کسی بچے کو بد اخلاق بنادیا جائے بد اخلاق بناتا نہیں۔ آپ ذرا محنت کر کے اخلاق کو خراب کر دیجئے یہ کہے گا ارے الحق! یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی بد اخلاق پیدا ہوا ہے۔ محنت خوبی کے لئے کی جاتی ہے، خرابی کے لئے نہیں کی جاتی۔

تو انسان کے اندر دو ہی بڑے بڑے کمال ہیں: ایک علم اور ایک اخلاق۔ جس سے عمل درست ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کمال محنت سے لائے جاتے ہیں اور محنت نہ کی جائے تو علم کی جگہ جہالت ہے، وہ بھی پہلے سے موجود اور حسن اخلاق کی جگہ بد اخلاق، وہ بھی پہلے سے موجود۔ قرآن کریم میں علم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآخَرُ جَعَلَكُمْ مِّنْهُم مِّنْهُمْ لِيَتَعْلَمُونَ حَيْثُ وَجَعَلَ لَكُمْ الشَّمْعَ وَالْأَنْبِضَارَ وَالْأَفْنَادَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ① ”اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حالت میں کہ تم جاہل مطلق تھے۔ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا۔“ انسان کا بچہ ایک مہضہ گوشت پیدا ہوتا ہے۔ نہ اسے اچھے برے کی تمیز، نہ سیاہ کو جانتا ہے نہ سفید کو۔ حق تعالیٰ اس کے اندر سمجھنے، دیکھنے اور سننے کا مادہ رکھتے ہیں۔ جب سن بن کر، دیکھ دیکھ کر، سوچ سوچ کر برہسہارس میں جا کے وہ عالم بنتا ہے، محنت کرتا ہے تو عالم بن جاتا ہے۔ مگر غلطی طور پر جہالت لے کر پیدا ہوتا ہے تو علم انسان کی ذات میں نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں جہالت ہے۔

اخلاق کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا، حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ: ﴿وَمَا أَنبِئُ نَفْسِي ۖ إِنَّ النَّفْسَ لَأَفْوَازَةٌ بِالسُّوءِ﴾ ② میں اپنے نفس کی بریت نہیں کرتا۔ نفس جب حکم دے گا، برائی کا حکم دے گا۔ اس میں شرعی شر چھپا ہوا ہے۔ تو خیر لائی جاتی ہے، شر پہلے سے موجود ہے۔ اخلاق میں بھی بدی پہلے سے موجود، نیکی محنت سے لائی جائے گی۔ علم میں بھی جہالت پہلے سے موجود، علم محنت کر کے لایا جائے گا۔ دو ہی کمالوں سے آدمی آدمی بنتا ہے، علم سے اور اخلاق سے اور وہ دونوں اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ذات کے اندر بد اخلاق اور جہالت ہے۔ وہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے جتنے مادے ہیں۔ وہ سب گندے اور نجس ہیں۔ ان سے علم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے نیک اخلاقی بن ہی نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ جہالت اور بد اخلاقی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے ذکر کیا: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ نُّطْفَةٍ لَّا ذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾ ③ ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا اس گندے قطرے میں کوئی غریبی، شعور، بھلائی اور دانش مندی نہیں، بلکہ ناپاک قطرہ

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیہ: ۷۸۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیہ: ۵۳۔ ③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیہ: ۴۔

ہے۔ بدن سے نکل آئے تو قفل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو اس کا دھونا واجب، مسجد میں آنا جائز نہیں، ہزار آن پر دھنا جائز نہیں۔ اس درجہ گویا ناپاک اور نجس چیز ہے کہ عبادت سے آدمی جاتا رہتا ہے۔ مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے تو انسان کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض ائمہ کا اس بارے میں نہ ہب یہ ہے کہ وہ قطرہ پاک ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔
عام ائمہ کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ ناپاک ہے۔ مگر بعض اس کے قائل ہیں کہ وہ پاک ہے وہ انبیاء علیہم السلام اور
اولیاء اللہ کا مادہ ہے۔ تو اس کو شخص کیسے کہہ دیں۔؟ تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہو گیا۔

لیکن ماں کے پیٹ میں جا کر آگے کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن کے بعد خون بنتا ہے۔ خون کے پاک ہونے کا کوئی قائل نہیں مگر یا تا پاکی کی طرف بڑھا۔ اب تک اختلاف تو تھا کہ کوئی پاک کہتا تھا، کوئی ناپاک، لیکن حدیث میں ہے کہ وہی لطفہ چالیس دن کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خون بالاتفاق ناپاک ہے۔ اس کی پاکی کا کوئی قائل نہیں مگر یا دوسرا مادہ انسان کی پیدائش کا ایسا گندہ ہے کہ سب ہی اس کی گندگی کے قائل ہیں۔ چالیس دن کے بعد خون کی یہ بوند ایک تھوڑا بن جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی خرابی نہیں، کوئی نورانیت اور چاندنا نہیں۔ اس کے چالیس دن بعد ماں کے پیٹ میں اس میں ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں، اور ان پر گوشت ڈالا جاتا ہے، کھال بن جاتی ہے، ایک شکل بنا دی جاتی ہے اس میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک گندے یا خراب قسم کے مادے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے ایک موقع پر ذکر فرمایا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ﴾ ① ”ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔“

خاہری بات ہے کہ مٹی میں نہ شعور و عقل نہ تمیز و امتیاز نہ علو و شرف، ہر وقت پامال ہے، جوتوں میں روندی جاتی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مادہ ہے۔ مٹی کے خلاصے سے پھر گندہ قطرہ بنا، وہ نجس، اس گندے قطرے سے خون بنا، وہ نجس۔ اور فرمایا ﴿لَهُمْ جَعَلْنَاهُ نَظْفًا فَبُيَ لِقُرَابٍ مُّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَاهُ عِظْمًا مَّكَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَبَنَيْنَاكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ﴾ ① یہاں حق تعالیٰ نے دور بتلائے ہیں کہ پہلے انسان مٹی تھا۔ مٹی سے گندہ قطرہ، پھر مضعہ گوشت بنا، پھر ہڈیاں آئیں، پھر کمال پہنائی گئی تب جا کے کہیں اس میں جان پڑی۔ اسے ادوار میں جتنے مادے آئے۔ وہ سب گندے اور ناپاک۔ ان میں کوئی خرابی نہیں۔ اس سے انسان کی پیدائش عمل میں آئی جس مکان میں پیدائش ہوئی وہ بھی گندا ماں کے پیٹ میں کوئی چاند یا تھوڑا سی ہے۔ نہ ظاہری روشنی نہ باطنی روشنی۔ قرآن کریم نے ایک موقع پر فرمایا ﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ عَلَقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ ② ہم نے تمہیں

① هـ: ٨، سورة المؤمنون، الآية: ١٢، ② هـ: ٨، سورة المؤمنون، الآية: ١٣، ③

③ يارو: ٢٣، سورة الزمر، الآية: ٦.

ماں کے پیٹ میں تین اندھیری کوٹھڑیوں کے اندر پیدا کیا۔ ان میں ظلمت کے سوا نورانیت کا نشان نہیں۔ تو پہلے ماں کا پیٹ ہے۔ اس میں کون سا چاند تھا، پھر اس میں رقم مادر ہے۔ اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی اس میں اور زیادہ ظلمت پھر اس میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے۔ وہ جمنی جس میں بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اسے کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ گویا تین ظلمتوں میں انسان کو پیدا کیا گیا تو پیدائش کے مادے وہ بھی گندے، مکان پیدائش کے وہ بھی گندے۔ اتنے گندے مادوں میں سے علم کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ اخلاق کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ عجاستوں میں سے خونی نہیں نکلتی جب انسان کی پیدائش ہی ایسے، دوں سے ہے، اس میں خوبی کہاں سے آتی؟۔ انسان میں کمال منجانب اللہ ہے..... لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ دنیا میں جتنی خوبیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ انسان ہی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ انسان میں اولیاء علماء پیدا ہوئے انبیاء و حکماء پیدا ہوئے دنیا کو بھی انسان نے سجا یا اور آخرت کو بھی انسان نے بنایا تو خوبیاں بھی انسان میں ہیں۔ پھر اگر یہ ایسا گندہ تھا تو یہ خوبیاں کیوں اس کے اندر ظاہر ہو گئیں؟

اس کا جواب بھی اس لیے ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں انسان کی پیدائش کے مادے ذکر کئے وہاں ان گندی چیزوں کا ذکر کیا۔ لیکن ان گندی چیزوں میں سے نہ کوئی علم نکلا ہے نہ کمال علم کا تعلق اس کی روح، حقیقت اور روحانیت سے ہے۔ روح کا جب ذکر کیا، اسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا فرمایا ﴿وَنَفْخُثُ فِيهِ مِنْ رُوحِنَا﴾ ① ”میں نے انسان کے اندر اپنی روح ڈال دی۔“

﴿فَنَفْخُثُ فِيهِ مِنْ رُوحِنَا﴾ ② تو جہاں کمال کا ذکر آیا۔ اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ان کے اندر کمال میرا ہے۔ جہاں گندی اور گندے مادوں کا ذکر آیا وہاں انسان کی طرف نسبت کی ﴿وَعَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ﴾ ③ انسان کو ہم نے مٹی سے بنایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَلٍ مُسْنُونٍ﴾ ④ انسان کو سڑے ہوئے گارے سے بنایا تو جہاں انسان اور اس کے مادوں کا ذکر ہے۔ وہاں انسان کی طرف نسبت کی گئی۔ جہاں روح کا ذکر آیا۔ وہاں کہا کہ میں نے اپنی روح انسان میں ڈال دی۔

معلوم ہوا کہ کمالات جتنے آتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ عجیب جتنے ہیں وہ انسان کی ذات میں پہلے سے موجود ہیں۔ اسے واسطے اسے کمال پیدا کرنے کے لئے اللہ کی طرف جھکنے پڑے گا۔ وہیں سے کمال ملے گا۔ اس کی ذات میں کچھ نہیں ہے۔ علم اور اخلاق کے لئے محنت کرنی پڑے گی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، کیونکہ علم و کمالات اور اخلاق کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن کتنا ہی علم آ جائے، ذات تو انسان کی ذات ہی رہے گی۔ ذات میں وہی اور اپن وہی گندگی۔ یہی وجہ ہے کہ علم آ جانے کے بعد جتنا علم بڑھتا رہتا ہے،

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص: الآیہ: ۷۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ النحر: الآیہ: ۱۴۔

③ پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمن، الآیہ: ۱۴۔ ④ پارہ: ۱۳، سورۃ الحجر، الآیہ: ۲۶۔

اتنے ہی اہل علم تو وضع سے جھکتے رہتے ہیں، سر نہ پا کر کھتے ہیں، غرور نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ علم ہمارا کمال نہیں ہے۔ غرور آدمی کرے تو اپنی چیز پر کرے۔ دوسرے کی چیز پر آدمی کیا غرور کرے جو ابھی سکتی ہے، جھینٹی بھی جاسکتی ہے۔ یہ ہماری چیز نہیں ہے۔

آپ اپنے خزانے پر کسی خزانچی کو بٹھلا دیں اور خزانچی آپ کے امر سے دوسروں کو دینا رہے تو خزانچی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس خزانہ کا مالک ہوں اور میں دے رہا ہوں؟ وہ جانتا ہے کہ خزانے کا مالک دوسرا ہے۔ اس کی اجازت سے میں خرچ کر رہا ہوں۔ میں تو امین ہوں اور میں تو محض منتقل کر دینے کا ذمہ دار ہوں، مالک نہیں ہوں تو خزانچی کے دل میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے۔

اسی طرح سے انسان کتنا ہی عالم و فاضل بن جائے۔ مگر جب وہ یہ دیکھے گا کہ میری ذات سے یہ علم نہیں آیا۔ یہ تو باہر سے آیا ہے۔ یہ عمدہ اخلاق میرے نہیں ہیں۔ میرے ہاؤس تو گندے اور برے تھے۔ یہ کہیں اور سے آئے ہیں۔ اس لئے دانش مند آدمی کبھی شہی نہیں کرے گا۔ کبھی اترائے گا۔ نہیں باصلیت کو سمجھے گا اور یوں کہے گا کہ میں ان کمالات پر شکر تو کر سکتا ہوں۔ لیکن فخر نہیں کر سکتا خزانچی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے اہی نہیں۔ جتنے بڑے لوگ، علماء، اولیاء اور حکماء گزرے ہیں جتنا اونچے بنتے گئے، اتنا ہی سر جھکاتے گئے ہیں کہ ہم کوئی چیز نہیں، ہم سچ اور سچ ہیں، ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ اس لئے کہ ان پر اصلیت منکشف ہوتی ہے۔

اہل کمال میں تو وضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے۔..... اس عالم میں سب سے بڑے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مخلوقات میں آپ کے برابر کا کیا ہوتا؟ کوئی آپ کے لگ بھگ بھی نہیں ہے۔ سب سے بالا اور برتر آپ کی ذات عالی ہے۔ اللہ کے بعد اگر درجہ ہے تو بس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اتنی بڑائی عالم میں کسی کو نہیں دی گئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اگر غرور فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، اگر اترا ہٹ ظاہر فرماتے تو آپ فرماتے۔ لیکن آپ سے زیادہ تو وضع ظاہر کرنے والا بھی عالم میں کوئی نہیں۔ آپ سے زیادہ سر کو جھکانے والا بھی کوئی نہیں۔ قدم قدم پر اپنی تو وضع ظاہر فرماتے۔ کبھی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ننگے چیر کھانا کھاتے اور فرماتے ”أَتَحْمِلُ خَعْمًا يَا نُحْلَى الْعَبْدُ“ ① میں ایسے کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں۔ میں کوئی بادشاہ اور سلطان نہیں ہوں۔ میں ایک غلام ہوں۔ جیسے غلام کھانا کھاتے ہیں، میں کھاتا ہوں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ میں کوئی چیز ہوں۔

اسی طرح سے جب آپ چلتے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ فرمائیں کہ میں آگے آگے رہوں، بقیہ سب پیچھے رہیں۔ وہاں بھی کمال تو وضع کے صحابہ آگے پیچھے، دائیں بائیں چل رہے ہیں۔ آپ کوئی ایسا امتیاز ظاہر نہیں فرماتے۔ یہ کمال تو وضع ہے لیکن یہ آگے اللہ کی دی ہوئی بزرگی ہے کہ آپ اپنے کو لوگوں میں کتنا ہی رلاتے ملا تے اور مل ملا کر

① المصنف لعبد الوفاق، ج: ۱، ص: ۱۵۰، رقم: ۹۵۳۳، حدیث صحیح، ج: ۱، ص: ۸۲۔

لوگوں میں چلتے۔ لیکن سب سے اونچے آپ ہی نظر پڑتے تھے، حالانکہ بہت سے صحابہ ہیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ تھا نہ بہت قد تھے نہ بہت لمبا قد۔ نہایت موزوں اور خوبصورت قد تھا۔ جب آپ چلتے تو سب سے اونچے آپ دکھائی دیتے تھے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔ آپ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

جنس میں جب آپ بیٹھتے تو اور لوگ بھی بیٹھتے۔ صحابہ آگے پیچھے اور دائیں بائیں بھی ہیں۔ کبھی اپنے لئے کوئی امتیازی مقام تجویز نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ لمبے لمبے قد کے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں مگر سب سے اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر پڑتے تھے۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے بلند اور ہاں آپ ہی نظر پڑتے تھے تو آپ کی ذات ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تواضع آپ ہی فرماتے تھے۔ کہیں فرماتے ہیں، "لَا تَنْظُرُونَنِي نَحْمًا أَطْلُوبُ النَّصْرَةَ يَحْسَبُنِي ابْنُ مَرْيَمَ" ① اے لوگو! میری تعریف میں مباہلے مت کرنا، مجھے میری حد سے مت گزرا، جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مباہلے کئے کہ انیس خدا کا بیٹا بلکہ خدا تک کہہ دیا۔ میری بزرگی یہ ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو "إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ"، نہ میں خدا ہوں، نہ خدا کی اولاد، وہ اولاد ہونے اور باپ ہونے سے بڑی ہے۔ "إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ" میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ ہاں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنا رسول بنایا، مجھے اپنا پیغمبر بنایا اور اتنی عظمت مجھے عطا کی۔ یہ اس کی دین ہے، میں بندہ ہی ہوں، تو جگہ جگہ فرماتے ہیں۔ "إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ" (صلی اللہ علیہ وسلم)

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو کہا کہ "مَا سَبَدْنَا" اے ہمارے سردار! حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سردار ہی تھے۔ آپ تو جہانوں کے سردار ہیں۔ لیکن فرمایا، "الْمُسَبَّدُ اللَّهُ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ" ② سردار اللہ ہے۔ میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔ تو را اصلاح فرمائی کہ ایسے خطاب بھی مت دو جس سے مباہلے چکے ہوں۔ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "لَا تَخْبِرُونَا أَنَا خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ ابْنِ مَتَّى" ③ اے لوگو! یہ کبھی میری نسبت مت کہو کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر اور برتر ہوں۔ حالانکہ آپ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ لیکن روکا یعنی اس طرح تعریف مت کرو کہ دوسرے کی تنقیص و توہین ہونے لگے۔ مقابلے ڈال ڈال کر میری بڑائی مت بھان کرو، کہ میرے مقابلے میں دوسرے کم رتبہ ہیں اور میں زیادہ درجے والا ہوں۔ یہ ادب کے خلاف ہے۔ گستاخی کی بات ہے۔ یہ کمال تواضع ہے تو کہیں ہدایت فرمائی کہ میری تعریفوں میں مباہلے

① الصحيح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ واذکری فی الکتاب مریم، ج ۱۱، ص ۲۶۲، رقم: ۳۱۸۹۔

② السنن لاہی والہ، کتاب الادب، باب فی کراہیۃ التصادح، ج ۱۲، ص ۴۳۹۔

③ الصحيح للبخاری، کتاب احادیث، انتہاء باب قول اللہ تعالیٰ وَاَنْ يُّنْسَ لِمَنْ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ، ج ۱۱، ص ۲۶۳، رقم: ۳۱۹۳۔

مت کرو اور کہیں فرمایا کہ دیکھو میری حیات طیبہ میں ادب کرو۔ مگر مبالغے مت کرو اور وفات کے بعد فرمایا، ”لَا تَجْعَلُوا قَبْرِیْ وَفَنًا یُعْبَدُ“ ① میری قبر کو بت مت بنالینا کہ پوجا شروع کرو، بعد سے شروع کرو دیا جھٹکا شروع کرو، بت مت بنالینا۔ اور کہیں فرمایا: ”لَا تَجْعَلُوا قَبْرِیْ عِیْدًا“ ② میری قبر کو عید گاہ مت بنانا کہ وہاں میلے ٹھیکے کرنے لگو، وہاں جماعتیں بن کر آئیں۔ یہ مت کرنا۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری زیارت کرنے کے لئے آؤ۔ روضہ اقدس پر حاضر ہو۔ حدیث میں فرمایا: ”مَنْ حَجَّ وَلَمْ یَزِدْنِیْ لَقَدْ جَفَانِیْ“ ③ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ میرا حق ہے کہ وہ میرے پاس آئے۔ اگر زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آدی سفر کر کے جائے۔ تو اس کا حق ہے کہ سفر کرے اور زیارت کرے اور روضہ اقدس پر حاضر ہو اور صلوٰۃ و سلام پڑھے۔

بہر حال وفات کے بعد اور وفات، سے پہلے جتنے آداب تلائے ان میں اپنی عہدیت و بندگی ظاہر فرمائی کہ میرے ساتھ نہ زندگی میں مبالغے کرو، نہ وفات کے بعد کہیں فرمایا، ”لَا تَقُوْهُوْا لِیْ سَمَیْعًا یَقُوْهُمُ اِلَّا عَاجِجًا“ ④ میرے دربار میں میرے پاس آ کر یہ مت کرو کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور لوگ سیرے سامنے کھڑے ہوئے ہوں۔ جیسے نجی بادشاہوں کے سامنے لوگ کھڑے رہ کر تھے اور درباری بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ چاہے دو گھنٹے ہوں یا تین گھنٹے بادشاہ بیٹھا تھا۔ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا: یہ مت کرو جیسے سلاطین دنیا کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ بھی تعظیم ہوتی ہے۔ حقیقی ادب نہیں ہوتا حقیقی ادب یہ ہے کہ دل میں عظمت اور عقیدت گہری ہوئی ہو اور بیٹھے رہو۔ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اس سے منع فرمایا تو یہ بھی کمال عہدیت کا اظہار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میری بندگی پیش نظر رکھو۔

رسالت و بشریت..... حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے رسول بھی ہیں اور رسالت کی بزرگی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر کراتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ تو ایک طرف تو یہ کرامت کہ اشارہ فرمادیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں اشارہ فرمائیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے سامنے آ جائیں۔ شست میں انگلیاں ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے جاری ہو جائیں اور چودہ سو آدمی سیراب ہو جائیں ایک طرف تو یہ۔ اور ایک طرف یہ کہ غزوہ احد میں پتھر پشانی مبارک پر لگا تو خون مبارک بہ نکلا، گھوڑے سے آپ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک طرف تو عظمت کے تعارفات آسمان تک پہنچے ہوئے

① اسئل السلام، کتاب الجنائز، باب المنہی عن النساء والنحیب، علی القیور، ج: ۳، ص: ۱۴۸، رقم: ۵۴۳

② السنن لاہی داؤد، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القیور، ج: ۵، ص: ۱۳۱، رقم: ۱۴۴۶، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۵، ص: ۳۴، رقم: ۲۰۳۲، ③ کنز العمال، ج: ۱، ص: ۶۶، رقم: ۱۴۳۶۹، علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی وغیرہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ لیکن اس حدیث کو موضوع قرار دینا مناسب نہیں دیکھئے: کشف الحفص، ج: ۲، ص: ۲۳۳، ④ السنن لاہی داؤد، کتاب الادب، باب قیام الرجل للرجل، ج: ۴، ص: ۴۶۶، رقم: ۳۵۵۳

لائیں۔ انبیاء کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ایمان لائیں اس سے فرماتے ہیں کہ۔ ”اَنَّا نُبَشِّرُكَ الْاٰمِنِيْنَ“ اور نبی امتوں کے لئے نبی ہیں، میں نبیوں کے لئے نبی بنایا گیا ہوں۔ تو اتنی بڑی ذات اقدس کہ انبیاء میں بھی آپ کا اتنا اونچا درجہ کہ خاتم انبیاء بنائے گئے۔ اگر عیاذ باللہ غرور یا تکبر کرتے، تو آپ کرتے مگر سب سے پہلے زیادہ تواضع فرماتے ہیں۔ اس سے معصوم ہوا کہ جتنے کمالات ہیں وہ اللہ کے ہیں، ادھر سے آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں کمال نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے، عمل سے یہ بتلادیا کہ انسان اپنے کو کورا سمجھے اور اللہ کا شکر مانے کہ اس نے جسہیں کمال دے دیا۔ اس سے دنیا میں جتنے بھی بڑے گزرے ہیں۔ جتنے بڑے ہوتے گئے، اسنے ہی تواضع میں بڑھتے گئے۔ اتنی خاکساری اور عجز دنیا ز برسنے لگے۔ اس لئے کہ ان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ کمال ہمارا نہیں، اللہ کا ہے۔ اور جب آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ کہاں دینے والا دیتا ہے۔ لیکن جب لینے پر آتا ہے لے بھی لیتا ہے۔ انسان کے بس میں نہیں کہ روک لے۔ جیسے ایک طرف یوں فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے علم و ہنر اور اخلاق لے کر نہیں آتا۔ ہم دیتے ہیں۔

اسی طرح آخری عمر کے بارے میں فرمایا ﴿فَمَنْ بُوذُ إِلَىٰ اَرْذَلٍ اَلْعَصْرِ لِكَيْلَا يَغْلِبَ عَلَيْهٖ شَيْنًا مِّنْۢ بَٰرِءٍ﴾^① انسان آخر میں جب اُردن عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو عمر بہت ہی گرمی ہوئی ہے۔ سو یا سو سے زیادہ برس کا ہو گیا تو ایک ایک کر کے اس کا علم ٹھون شروع ہو جاتا ہے۔ آج آنکھوں میں فرق آ گیا تو دیکھنے کا علم ختم ہو گیا، دماغ کمزور ہو گیا تو سوچنے سمجھنے کا علم ختم ہو گیا، کانوں کے سننے میں فرق آ گیا تو سننے کا علم ختم ہو گیا۔ نیا علم نہیں آ رہا۔ پرانا علم حافظہ میں محفوظ تھا۔ آج حافظہ کمزور ہو گیا، تو کچھلی معلومات ختم ہو گئیں، ابھی معلومات کا دروازہ بند ہو گیا۔ کچھلی ختم ہو گئیں انسان جیسا آہ تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ حق تو ملی بتلا دیتے ہیں کہ علم تیری چیز نہیں جب چاہا ہم نے دے دیا، جب چاہا ہم نے چھین لیا۔ پھر ایسا انسان کس طرح سے غرور کر سکتا ہے؟ اگر اس کے پاس علم و کمال آ جائے۔ وہ جو نے گا کہ علم و کمال میرا نہیں، میرے۔ کد کا ہے، میں خزانچی اور امین ہوں۔ خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دھری کرے کہ یہ مال میرا ہے۔ یہ مال تو مالک کا ہے۔

علم و اخلاق کے حصول کا طریق اول، فیض صحبت..... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں ہنر نہیں ہے اور کچھ محنت کرے گا تو آئے گا۔ اب علم و اخلاق کے آنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اتنی بات تو واضح ہو گئی حاصل کرنا پڑے گا۔ بلا حاصل کئے نہ علم آئے گا نہ اخلاق پیدا ہوں گے تو پھر اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ سب سے بہتر طریقہ علم اور اخلاقی کمال حاصل کرنے کا فیض صحبت ہے۔ اہل اللہ اور کاروبارین کی خدمت میں رہ کر ان کی زبان سے جب آدمی سنتا ہے تو محم آدمی کے دل میں اترتا ہے۔ ان کے فیض صحبت سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ حضرات صحابہ کو صحابہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔ صحابہ

اس طرح علم حاصل نہیں کرتے تھے کہ کوئی کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے رات دن مطالعہ کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے فیضِ صحبت حاصل کیا۔ فیضِ صحبت کی برکت سے علماء، عرفاء، کامل، زائد اور دورویش بن گئے۔ علم و اخلاق کے سارے کمالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ ترین طریقِ فیضِ صحبت ہے کہ اعلیٰ اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ ان کے قلب کا اثر انسان کے قلب پر پہنچتا ہے۔ ان کے قلب میں اگر علم ہے تو قلب سے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے اندر اگر پاکیزہ اخلاق ہیں تو اخلاق منتقل ہوتے ہیں، قلب پر اثر پڑتا ہے۔ اس واسطے تاکید کی گئی ہے کہ اچھی صحبت حاصل کرو، بری صحبت سے بچو، اچھے ماحول میں رہو، بُرے ماحول سے پرہیز کرو۔ مولانا روٹی نے کہا کہ۔

صحبتِ صالح ترا صالح مند صحبتِ طالح ترا طالح مند

”نیک صحبت تجھے نیک بنا دے گی، بری صحبت تجھے برا بنا دے گی“۔ تو صحبت و مصیبت کا اثر پڑتا ہے۔ اور انسان تو انسان میں کہتے ہوں کہ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کپڑوں کے صندوق میں گلاب کے پھول بھر دیں۔ ہفتہ بھر بعد جب نکالیں گے، سارے کپڑوں میں سے گلاب کی خوشبو آئے گی۔ تو کپڑا گلاب نہیں تھا۔ گلاب کے پھول کی صحبت حاصل کی، خوشبو ادھر بھی منتقل ہو گئی اور کپڑوں میں سے وہی خوشبو آنے لگی۔ جو گلاب کے پھول میں سے آتی تھی۔

آپ جب گرم کپڑے کپڑے کے ڈور کی وجہ سے صندوق میں بند کرتے ہیں تو کافور کی گولیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یا تمباکو ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کپڑا نہ گئے۔ اب جب سردیوں میں کپڑے نکالیں گے تو کپڑوں میں سے تمباکو کی بو آتی ہوگی۔ حالانکہ خود کپڑا تمباکو نہیں تھا۔ مگر تمباکو کی صحبت میں رہ کر کپڑے نے بھی وہی خوبی پیدا کر لی۔

لوہے کو آپ بھی میں ڈال دیں۔ پندرہ منٹ آگ کی صحبت میں رہنے کے بعد جو آپ نکالیں گے تو شکل بھی اس کی آگ جیسی، وہی سرخ رنگت، کام بھی وہی کرے گا۔ جو آگ کرتی ہے۔ اس میں روشنی گرنی بھی ہے۔ اس کا سرخ رنگ ہو گیا۔ جیسے آگ کا ہوتا ہے اگر آپ اس جلتے ہوئے لوہے کو کسی چھپر میں ڈال دیں تو دو منٹ میں سارا گھر چھوٹک دے گا۔ جو کام آگ کرتی ہے، وہی لوہا کرے گا۔ اسلئے کہ آگ کی صحبت میں رہ کر وہی خوبی اس نے اختیار کر لی۔ بلکہ شکل بھی وہی بنائی جو آگ کی شکل تھی۔

صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ، اکابر اولیاء اللہ اور بڑے کاملین میں سے ہیں۔ دہلی میں ان کا حزر ہے۔ حضرت مجذد صاحب کے شیوخ میں سے ہیں۔ ان کے یہاں اتفاق سے مہمان آئے اور شیخ کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے لاقہ ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ پریشان کہ کس طرح عادات کروں گھر میں ایک دانہ نہیں، مہمانوں کو کیا کھلاؤں؟ اسی گھبراہٹ میں کبھی گھر میں جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں۔ پریشان ہیں کہ کس طرح سے مہمان کو کھلاؤں پلاؤں۔ گھر میں تو ایک دانہ بھی نہیں۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک بھٹیاریہ، جو کھانے کی دکان کرتا تھا۔ آج اسے ہوٹل اور ہوٹل مالک کہتے ہیں۔ کل وہ بھٹیاری سرانے اور بھٹیاریہ کہلاتا تھا، کھانا پکاتا تھا اور بیچتا تھا۔ وہ بھٹیاریہ سمجھ گیا کہ شیخ کے مہر فائدہ ہے اور کھانے پینے کو کچھ ہے نہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو فوراً مجلس سے اٹھا۔ اپنی دکان پر گیا اور عمدہ عمدہ کھانے، جو اس کے ہاں کپے ہوئے تھے ان میں سے کھانے لے کر دسترخوان تیار کیا۔ کئی آدمیوں کا اور کئی قسم کا بڑا عمدہ کھانا، سر پر رکھ کر لایا اور ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بے حد خوش ہوئے۔ مہمانوں کو بڑی عزت اور مدارات سے کھانا کھلایا اور خوشی سے چہرہ کھل گیا کہ ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ“ میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور میں مدارات کر سکا۔ جب مہمان رخصت ہو گئے۔ تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جوش میں آ کر بھٹیاریہ سے فرمایا، تو نے آج مجھے اتنا خوش کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو آج مانگے گا، تجھے ملے گا۔

بھٹیاریہ کی زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! مجھے اپنے جیسا بنا دو۔ اب یہ چیز بڑی بھاری تھی کہ بھٹیاریہ یعنی خواجہ باقی باللہ بن جائے، خواجہ باقی باللہ کی استعداد اور صلاحیتیں، اور بھٹیاریہ بے چارہ معمولی آدمی۔ نہ اس میں علم کی وہ صلاحیت نہ اخلاق کی استعداد۔ گویا اس نے درخواست اپنے حوصلہ سے بڑھ کر کی۔ یہ کہتا کہ دعا کیجئے مجھے اللہ نیک اور صالح بنادے، اللہ مجھے جنت دے دے، یہ نہیں۔ بلکہ فرمایا اس اپنے جیسا مجھے بنا دیجئے۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ تو نے اپنے حوصلہ سے بڑھ کر درخواست کی ہے۔ کوئی اور چیز مانگ۔ اس نے کہا نہیں۔ میں تو یہی مانگتا ہوں۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متاثر ہوئے کہ اس کو آخر میں اپنے جیسا کیسے بنادوں۔ اور اگر میں کوشش بھی کروں تو اس میں اتنی استعداد کب ہے کہ اتنا علم اٹھا سکے تحمل بھی کر سکے اور ان اخلاقی کمالات کو برداشت کر سکے، جو میرے اندر اللہ نے دیئے ہیں۔ ہر انسان کی صلاحیت الگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استعدادیں اور ہیں۔ جو نبوت کے کمالات برداشت کرتے ہیں۔ امت میں کسی بڑے سے بڑے قلب، غوث اور ولی کی مجال نہیں کہ ان کمالات کی برداشت کر سکے، وہ ولایت کے کمال کا تحمل کریں گے۔ جو ولی نہیں ہے، معمولی عالم ہے، وہ ولایت کے کمالات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ عوام الناس میں سے ہے وہ اہل علم کے کمالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو ہر ایک کی استعداد صلاحیت الگ ہے۔ اگر پیالہ پاؤ بھر کا ہو، جس میں پاؤ بھر غلہ آ سکے۔ وہ یوں کہے کہ میرے اندر روغن بھردو، کیسے بھردیں؟ اس کے اندر کب صلاحیت ہے اتنا بھردینے کی؟ تو بھٹیاریہ کا یہی قصہ تھا کہ استعداد تو پاؤ بھر کی بھی نہیں تھی اور مانگ لیا اس نے کہ دس من میرے اندر بھردو۔ اب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے اندر کیسے بھردیں؟

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پھر فرمایا، تو نے اپنی ہمت سے بڑھ کر درخواست کی ہے میرے اندر تحمل اور قوت نہیں ہے۔ اتنی بات مانگ جتنی تو برداشت کر سکے۔ اس نے کہا نہیں، اب تو میری زبان سے نکل گیا۔

اب تو مجھے اپنے ہی جیسا بتا لو۔ اب بھر خوبصورت صاحب رحمۃ اللہ علیہ متاثر ہوئے۔ فرمایا، اچھا اللہ کے نام پر رہنا، اٹھ میرے ساتھ، اسے اپنی کونجری میں لے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر اس کے اوپر توجہ ڈالنی شروع کی۔ اس کی روح میں تصرف کرنا شروع کیا۔ اس درجہ تصرف کیا اور اس درجہ اس کی روح کے اندر نسبت و کمالات کو بھرنا شروع کیا کہ وہ ساری چیزیں بھر دیں جو اپنے اندر تھیں۔ اور کیفیت یہ ہوئی کہ بھٹیاریے کی شکل بھی ویسی بن گئی۔ جیسی حضرت خولجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ اب جب کونجری سے باہر نکلے تو دو خولجہ باقی باللہ آ رہے ہیں۔ ایک اس طرف، ایک اس طرف شکل بھی وہی، صورت و رنگ بھی وہی۔ اپنی استعداد و صلاحیت سے اس طرح اس کے باطن کو بھرا کر اس کی ظاہری شکل بھی ویسی بن گئی۔ لوگوں نے پہچانا کس طرح سے؟ ایک خولجہ باقی باللہ تو بڑی قوت اور متانت سے آ رہے تھے اور ایک خولجہ باقی باللہ اس طرح کہ پیر لڑکھ رہے ہیں، بدن لرز رہا ہے، جیسے بوجھ ہے برداشت نہیں ہوتا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھٹیاریہ ہے۔ جس کی صورت خولجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بن گئی۔ تین یا چار دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ بے چارہ برداشت نہیں کر سکا تو

آرزوی خواہ دلے دہانہ ازہ خواہ

آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اتنی آرزو کرو، جتنی آدمی برداشت کر سکے، جتنی اندر صلاحیت ہو۔ میں نے کس وجہ سے یہ واقعہ ذکر کیا؟ اس لئے کہ خولجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دس منٹ صحبت اٹھائی، دوسرا باقی باللہ بن گیا۔ تو صحبت کا اثر پڑتا ہے اچھے آدمی کی صحبت سے قلوب کے اندر اچھا نیاں بکست ہوتی ہیں۔ اس سے انسان میں صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو حضرات صحابہ کو جو کمالات حاصل ہوئے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے۔

فیض صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ہیں..... میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر نظر کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار ہا معجزات ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزوں سے الگ معجزے ظاہر ہوئے۔ چاند سورج پر الگ معجزات ظاہر ہوئے اور دنیا کی ہر چیز پر آپ کے معجزات نمایاں ہوئے۔ پتھروں نے آپ کی قوت کی شہادت دی اور بول پڑے۔

حدیث میں ہے کہ آپ کو استنجہ کی ضرورت پیش آئی ریگستان تھا۔ میلوں تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ بیٹھ سکیں۔ میل بھر پر ایک اور دوسرے میل پر ایک درخت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر اشارہ فرمایا۔ دونوں درخت دوڑتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ دو میل کی مسافت طے کر کے آئے اور آ کر اس طرح کھڑے ہوئے کہ اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ جیسے خیمہ اور پردہ بن گیا استنجہ فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ چلے جاؤ وہ درخت اپنی جگہ چلے گئے تو درختوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔ جانوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بھلا تا ہوا اور تا ہوا آیا۔ آنکھوں میں اس کے آنسو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آ کر سر ڈال دیا اور بلہلا رہا ہے۔ آنکھوں سے پانی جاری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے مالک کو بلاؤ۔ مالک حاضر ہوا۔ فرمایا، یہ شکایت لے کر آیا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ اس کے اوپر بوجھ ل دتا ہے۔ تجھے غیرت نہیں آتی؟ حیرا زریہ معاش یہ ہے، تیری کمائی اس کے ذریعے ہے۔ پھر اس پر رحم نہیں کھاتا؟ واقعہ سچ نکلا۔ اس نے تو یہ کہ یا رسول اللہ! آئندہ میں ظلم نہیں کروں گا، اس کا حق پہچانوں گا، اسے غذا دوں گا، اتنا ہی بوجھ لا دوں گا جتنی اس میں طاقت ہے۔ تو جانور کے شکایتیں کرتے ہیں۔ حضور فیضے فرماتے ہیں تو یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح پتھروں نے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دی۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آتی شروع ہوئیں۔ ساری مجلس والوں نے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں صدقہ لے کر برضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں۔ تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دے دیں پھر تسبیح جاری رہی، پھر انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں دے دیں تو تسبیح بند ہو گئی۔ بہر حال یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ کنکریوں سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں آتی شروع ہوئیں۔

تو چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، پتھروں کا شہادت دینا، درختوں کا دوڑ کے چلے آنا، آسمان مبارک (الکلیوں) سے پانی کے چشمے بہہ پڑنا، یہ عظیم معجزات ہیں جو نمایاں ہوئے۔ لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معجزات ایک طرف اور یہ ایک معجزہ ایک طرف کہ ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے کیوں؟ اس واسطے کہ پتھر کو موم بنا دینا آسان ہے۔ لوہے کو نرم کر دینا آسان، لیکن انسان کی روح میں انقلاب پیدا کر دینا یہ بڑا مشکل ہے۔ انسان کو انسان بنا کر اس کے دل کو پھیر دینا یہ بڑا مشکل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ ہے کہ ایک شخص مجلس مبارک میں آتا ہے، وہ کافر بھی ہے مشرک بھی ہے۔ بدعتیدہ بھی ہے اور بد عمل بھی ہے۔ ساری خرابیاں اسی میں ہیں۔ لیکن جو نبی دسبہ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوتا ہے تو اس حالت میں واپس ہوتا ہے کہ لہ بھی ہے۔ عارف بھی ہے، کامل بھی ہے، زاہد بھی ہے، عابد بھی ہے اور متقی بھی ہے۔ ایک دم دل کے اندر انقلاب پیدا ہو گیا تو پتھروں میں انقلاب آسان ہے۔ مگر انسان میں انقلاب پیدا کرنا بڑا مشکل ہے تو ہر ہر صحابی رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ ہے یہ اعجاز کیسے ظاہر ہوا؟ یہ فیض صحبت کی ہی برکت تھی۔ آپ کی صحبت مبارک میں منتوں میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ دوسری جگہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیعت کرتے ہی ہر شخص کامل ہو جاتا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے کہ مشرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ لیکن آ کر جو نبی دسبہ مبارک پر بیعت کی۔ اسلام قبول کیا۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ چھپ کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ کل تیرہ آدمی مسلمان تھے۔ دارا رقم میں

اندر سے زنجیر بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پہنچے، بیعت کی، اسلام قبول کیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں ہیں؟ عرض کیا پھر چھپ کر نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا چلو آگے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے پیچھے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں۔ مسجد حرام میں پہنچے۔ مشرکین کی مجلسیں جلی ہوئی تھیں۔ اعلان سے کہا کہ جو جانتا ہے، دو جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ اب جان لے میں عمرہوں اور میں کلمہ پڑھ کر آیا ہوں "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ" ① یہ کہنا تھا کہ تم مشرکین، رہنے پینے پر پل پڑے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی آستینیں کھینچی، مار پٹائی سب کچھ ہوئی، بڑائی بھی ہوئی۔ مگر اللہ پر بھروسہ ایک منٹ میں اتا پیدا ہو گیا کہ یہ کفر میں پڑے ہوئے تھے یا ایک دہ ایمان میں بڑھ گئے۔ یہ فیض صحبت ہی کا اثر تھا۔ بہر حال نبوت کی صحبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بنے اور صحابہ کے بارے میں اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اس امت میں صی بڑے بڑھ کر کوئی مقتدر نہیں۔ کوئی ولی قلب بن جائے، غوث بن جائے۔ مگر صحابیت کی گرد گولیں پہنچ سکتی۔ صحابہ کی جوشان ہے، وہ کسی کی نہیں بن سکتی۔ وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ دوسروں کو یہ شرف میسر نہیں ہے۔ تو سب سے بڑی بنیاد وہی چیز جس سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ وہ فیض صحبت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اخلاق اور اپنا علم صحیح کرنا ہو تو جو نیک اور صالح لوگ ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنا چاہئے چاہے کچھ بولیں۔ نہ بولیں۔ لیکن پاس بیٹھنے سے ہی ایک اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔

بے شعور اشیاء کی صحبت..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی اور بری صحبت کی مثال دی ہے فرمایا، نیک صحبت کی مثال تو عطار کی دکان جیسی ہے۔ عطر بیچنے والے کی دکان پر جب آپ بیٹھیں گے، چاہے عطر نہ بھی خریدیں۔ مگر از کم دماغ میں ہی خوشبو آ جائے گی۔ دماغ تو معطر ہو جائے گا، کپڑوں میں خوشبو کی ہوا بھرے گی۔ گھر پہنچیں گے تو گھر والے کہیں گے۔ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بدن کوئی خوشبو لگ جائے گی، تاک میں ہی پہنچ جائے گی اور اگر کہیں عطر خریدی لیا اور مل نیا، پھر تو سبحان اللہ۔ مگر عطار کی دکان پر محض جانے سے کم از کم دماغ تو معطر ہوئی جاتا ہے۔ ②

اور بری صحبت کی مثال ایسی فرمائی کہ جیسے لوہار کی دکان کہ بعض دھندلو ہا گرم ہوتے ہیں۔ کتا ہے تو اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی کالک ہی کپڑے کو لگ جائے گی، لوہا بننے کی تھوڑی سی بدبو ناک کے اندر آ جائے گی۔ ③ غرض آدمی کوئی نہ کوئی کدورت دماغ میں لے کر آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کالک اور یہی کپڑے کو لگ آئے گا۔ بری صحبت کی

① المطالب العالیہ، کتاب السیرۃ المغازی، باب اسلام عمر، ج: ۱، ص: ۵۸، رقم: ۳۳۳۳

② ③ النسخن لابی داؤد، کتاب الادب، باب منہو من یعالیہ... ج: ۱۲، ص: ۵۷، رقم: ۳۱۹۰، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح و ضعف سنن ابی داؤد ج: ۱۰، ص: ۳۲۹، رقم: ۴۲۹

مٹاں یہی ہے کہ برے کے پاس بیٹھ کر یا تو برا بنے گا، برا نہیں بنے گا تو کم سے کم برائی کی برائی دل سے نکل جائے گی۔ کل کو برائی پر آمادہ ہو جائے گا۔ نیکوں کے پاس اگر بیٹھے گا، اگر دیندار نہیں بنے گا، تو کم سے کم دین کی محبت تو پیدا ہوئی جائے گی محبت نہ بھی پیدا ہو، کوئی کلمہ سن کے دل کی برائی ہی جاتی رہے گی تو راستہ درست ہو جائے گا۔ جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ۔

ایک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت ہے ریاء

”اللہ کے کسی ولی، مقبول اور دوست کے پاس ایک گھڑی بیٹھنا، یہ سو برس کی عبادت سے بہتر ہے۔“ اس لئے کہ ایک گھڑی بیٹھنے سے بعض دفعہ دل کی گریں ایسی کھل جاتی ہیں کہ سو برس کی عبادت کا راستہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ جودں میں جھٹک پڑی ہوئی ہوتی ہے، وہ نکل جاتی ہے تو فائدہ سے خالی نہیں ہوتے اس واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔ مثل مشہور ہے کہ ”خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پڑتا ہے۔“ ہر چیز اپنا اثر کرتی ہے۔ آپ روز دریا کے کنارے دو چار گھنٹے جا کر بنفیس مزاج میں رطوبت پیدا ہو جائے گی، نرمی آ جائے گی، نرمی آ جائے گی۔ اس لئے کہ پانی کی صحبت، خفیہ رکی۔ آپ آگ کے پاس بنفیس مہید بھر سکتے ہیں۔ مزاج میں جھنجھلاہٹ اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مٹی پر بنفیس، بیوست اور خشکی پیدا ہو جائے گی۔ مٹی کا اثر یہ ہے۔

جب یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے جان کہلاتی ہیں۔ یہ بھی اثر کرتی ہیں۔ کسی جاندار کے پاس بنفیس کے قوس کا اثر کیوں نہیں ہوگا؟ اور ایماندار کے پاس بنفیس یا کسی فاسق و فاجر کے پاس بنفیس۔ آپ کے اندر وہی جذبات پیدا کر دے گا۔ جو اس کے اندر تھے تو اصل چیز اخلاق درست کرنے کی یہ ہے کہ صحبت صالح اخصیار کی جائے کہ ان کے پاکیزہ اخلاق کا اثر آپ کے قلب پر پڑے گا چند دن کے بعد آپ کو فرق محسوس ہوگا کہ اخلاق کچھ صحیح ہونے لگے۔ دل کا راستہ بدل جائے گا۔ دل ادھر ہی کو چس پڑے گا، جدھر کو اس صالح اور نیک آدمی کا چل رہا ہے۔ اس لئے سب سے اعلیٰ طریقہ علم و معرفت اور اخلاق حاصل کرنے کا اہل اللہ، اہل دل اور بچوں کی صحبت ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں امر فرمایا گیا **اتَّقُوا اللَّهَ وَتُحِبُّوا مَعَ الصَّالِحِينَ** ﴿۱﴾ اے ایمان والو! اللہ کے سے ڈرو اور بچوں کی معیت اختیار کرو۔ یعنی ڈر تبار سے دل میں قائم نہیں رہے گا۔ جب تک ڈرنے والوں کی معیت نہ اختیار کرو۔ ان کے پاس بیٹھو تو ڈر دل میں اثر کر جائے۔ تقویٰ دل کے اندر اثر کر جائے گا۔

دین اہل اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اصل یہی ہے کہ دین محض کتابوں کے ورقوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ اہل اللہ کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابیں کوئی فاکھ پڑھ لے۔ صحبت نہ ملے، دین اثر نہیں کرے گا۔ قلب کے اندر رنگ نہیں پیدا ہوگا۔ محض کتاب یا کلمہ سے مراد نہیں، اہل دل کے پاس بیٹھ کر دل میں اثر پیدا ہوگا۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی یوٹی کا بزرگ شاعر گزرا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ وہ اکثر علی گڑھ کا گج کے ٹکوں سے خطاب کیا کرتا

تھا۔ جو چوٹیں ہوتی تھیں۔ ان پر طعن بھی کرتا تھا۔ ساتھ میں انہیں سمجھاتا بھی تھا۔ تو کالج کے لڑکوں سے اس نے خطاب کر کے کہا کہ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہر در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا اہل اللہ کی نظر پڑتی ہے، دین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہ کتاب سے آتا ہے نہ در سے کے دروازوں سے اہل دل کے دل سے آتا ہے۔

از دل خیزد ببول ریزد

دل سے بات اٹھتی ہے تو دل ہی سے جا کے نکراتی ہے۔ اس واسطے اعلیٰ ترین طریقہ دین اور ربی اخلاق حاصل کرنے کا وہ فیض صحبت ہے خواہ علماء رہائی کی صحبت میسر نہ ہو یا کوئی دھانی درویش اور اہل اللہ میں سے ہو۔ اس کی صحبت میسر ہو وہ بھی نہ ہو، تو کسی نیک آدمی کی صحبت میسر ہو۔ عوام میں بھی نیک ہوتے ہیں، تاجروں میں ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں اللہ کے نیک بندے ضرور ہوتے ہیں۔ آدمی چھانٹ لے کہ یہ مقبول ہے اور مقبولیت اعمال سے معلوم ہو جاتی ہے، بلکہ صورت سے نظر پڑتی ہے کہ یہ آدمی مقبول ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا، مگر دل سے پڑھ لیتا ہے کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایمان کی نرمائی، ایک بھول پن، ایک سادگی، اللہ پر محروم اور توکل ہوتا ہے، نہ چالاکی اور عیاری برستی ہے، بلکہ سچائی برستی ہے۔

جیسے فرمایا گیا: ”الْمُؤْمِنُ غَرْمٌ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ وَأَنَا وَلِيُّ الْعَالَمِينَ“ ① مومن کی شان یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا، سیدھا سچا ہوتا ہے۔ بھولے پن کے معنی یہ کہ عیاری، مکاری، چالاکی نہیں سیدھی سیدھی بات ہے اور ایک بے وقوفی ہے یہ اور چیز ہے۔ مومن بے وقوف نہیں ہوا کرتا جس درجے کا ایمان ہوگا۔ اس درجے کی عقل مندی بھی اس کے اندر ہوگی۔ ہاں ایمان ہی کمزور ہو، عقل بھی کمزور ہوگی۔ ایمان قوی ہے تو عقل بھی قوی ہوگی۔ ان کے چہروں پر بھول پن ہوتا ہے۔ یعنی فریب کاری نہیں ہوتی۔ سیدھی سیدھی جو دل میں ہے، وہی زبان پر، جو زبان پر ہے وہ دل میں۔ تو چہرہ مہر و ملا دیتا ہے کہ یہ آدمی سچا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں۔ تو اول سندھ میں داخل ہوئے ہیں۔ سندھ کے راستے سے پنجاب بھر پنجاب کے راستے سے ہندوستان پہنچے ہیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم سندھ کے بازاروں سے گزرے۔ تو ہزاروں آدمیوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے اور کہا کہ یہ جھوٹوں کے چہرے نہیں۔ ان چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کے چہرے دلیل ہیں کہ ضرور اسلام حق ہے۔ اسلام ان کے چہروں پر برستا ہے۔ ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے زیر دست محدث، عالم، عارف باللہ تھے۔ ان کے چہرے پر نورانیت برستی تھی۔ مظہر مگر میں مسلمانوں کا آریوں سے مناظرہ ہوا۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب العشرة، ج ۱۲، ص ۳۱۱، رقم: ۴۱۵۸.

ادھر ہندو آ رہے تھے، ادھر مسلمان تھے، تو آئینچ پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ نہیں فرمایا۔ مناظرہ دوسرے عشاء کر رہے تھے۔ مگر صدر کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ تشریف رکھتے تھے۔ تو آ رہے مناظرے کیا کرے۔ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسام قبول کیا جاسکتا تھا۔ تو میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے، اس کے چہرے پر ایمان کھل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس شخص کا دل، ایمان و علم اور کمال سے بھرا ہوا ہے۔

مرد دکھائی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

مرد دکھائی کی حقانیت چہرے پر آ جاتی ہیں۔ یہ چہرہ اصل میں چغل خور ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، چہرہ چغل کھا دیتا ہے کہ یہ چیز دل میں بھری ہوئی ہے۔ اگر بدعتی بھری ہوئی ہے، چہرے پر برستا ہے کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور سچائی بھری ہوئی ہے تو چہرہ بول دیتا ہے کہ یہ سچا مادی کیفیات ہوں یا روحانی چہرے پر برستے لگتی ہیں۔ اگر کسی کے دل میں خوف بھرا ہوا ہے تو چہرے پر ایک زردی اور پریشانی ظاہر ہوگی۔ دیکھتے ہی آپ کہیں گے کہ بھی! تم ذکر رہے ہو؟ حالانکہ ذکر چہرے میں نہیں۔ ذکر دل کے اندر ہے مگر دل کے اثرات چہرے پر آتے ہیں۔ چہرہ آئینہ ہے۔ دل کی چیز چہرے پر کھل جاتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں خوشی بھری ہوئی ہے، کسی تقریب سے مسرت ہے۔ چہرہ خوشی سے دمکا ہوا ہوگا لوگ دیکھ کے کہیں گے کہ بھی! بڑے خوش نظر آ رہے ہو، کیا بات پیش آئی حالانکہ خوشی تو دل میں بھر رہی ہے۔ مگر چہرہ چغل کھا دیتا ہے کہ دل میں خوشی ہے۔ اگر دل میں غمی ہے چہرہ اداس پریشان ہوگا۔ لوگ کہیں گے کہ بھی! کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو؟ حالانکہ پریشانی دل میں ہے، چہرے میں تھوڑی سی ہے۔ مگر چہرہ آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی اوپر آ جاتا ہے۔ جب قلب میں نور ایمان چمکتا ہے۔ تو اس کی چمک دکھ چہرے کے اوپر نمایاں ہوتی ہے۔ کفر اندر بھرتا ہے تو چہرے پر فساد اور سخت دلی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایمان کا نور چہرے پر آتا ہے۔

مرد دکھائی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

آدمی نوراً پہچان لیتا ہے۔ بہر حال "أَلَمْ يَكُنْ لَهُمُ الْغُفْوَانُ الْغَافِلِينَ" ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے۔ جو باطن میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ ظاہر کھول دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر نور ایمان برس رہا تھا تو ہزاروں آدمی ان کے چہرے دیکھ کر مسلمان ہو گئے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سہمان فارسی رضی اللہ عنہ، یہ خیر سن کے عرب میں آئے کہ کوئی نبی پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ پچھلی کتاب میں بڑی تھیں۔ دنیا کو انتظار لگا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ وہ عوامتیں جو اس نبی کی ہیں، پائی جاری ہیں۔ تو جب دعویٰ نبوت سنا۔ یہ نور اگلے کہ میں جا کر دیکھوں۔ آپ صحابہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ پاس نہیں پہنچے، تو اچانک دور سے چہرہ مبارک پر نظر پڑی، تو چلا کر کہا کہ:

”وَاللّٰهُ لَیْسَ هٰذَا الْوَجْهَ الْكَذَّابُ“ خدا کی قسم یہ چہرہ جسو نے کا چہرہ نہیں ہے۔ چہرہ خود بتلا رہا ہے کہ اس کے اوپر سچائی برس رہی ہے۔ اس کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ اس کے قلب کے اندر نور نیت بھرا ہوا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صحبت سے وہ قلبی نور منتقل ہوتا ہے جو دوسروں کے قلب کے اندر ہے۔ اس لئے دین میں کمال پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اللہ، اکابر دین کی صحبت ہے کہ کتاب سے وہ چیز حاصل نہیں ہوگی، جو قلوب سے حاصل ہوگی۔ بلکہ کتاب کا مضمون بھی آپ سمجھیں گے تو شخصیتوں کی بدولت سمجھیں گے۔ اگر معلم اور مرئی کتاب کا مطلب نہ سمجھائیں، وہ مطلب آپ کا اپنا مطلب ہوگا، کتاب والے کا مطلب نہیں ہوگا، خدا کا مطلب نہیں ہوگا، کتاب والے کا مطلب تب سمجھیں گے، جب کتاب والا خود بتلائے یا کسی کو بتلا کر بھیجے تو اللہ نے اپنی کتاب کا مطلب اپنے رسول کو سمجھایا، رسول نے اپنی صحبت سے صحابہ کو سمجھایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی صحبت سے اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ محض کتاب سے کام نہیں چلا، جب تک مرتبوں کی شخصیت سامنے نہ ہوئی۔ ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی۔ تو بڑا ذریعہ فیض صحبت ہے۔ جس سے دین اور دینی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

علم و اخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواخاۃ فی اللہ..... اس لئے بڑی چیز فیض صحبت ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب ہم ایک ایسی بستی میں ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی اچھا آدمی نظر نہیں پڑتا۔ جس کی صحبت میں بیٹھا کریں نہ ہماری بستی میں کوئی عالم ہے، نہ کوئی درویش ہے اور ویسے ہی اچھے تو خود ہم بھی اچھے ہی ہیں۔ ہم کس کے پاس جائیں؟ اتنے اچھے ہم بھی ہیں۔ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی صحبت اٹھائیں کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ کیا ہمارے اخلاق درست نہیں ہوں گے؟ اس لئے کہ آپ نے بتلایا کہ دین، علم اور اخلاق کے کمال کے لئے صحبت اصل چیز ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فیض صحبت سے دین و اخلاق حاصل کر لیں تو ہماری اصلاح کی کوئی صورت نہیں رہی۔ کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ میں اس کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نہیں آپ کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ اگر نیک صحبت مینر نہ ہو، پھر ایک اور تہہ میر ہے۔ جس سے آپ اپنے دین میں کمال پیدا کر لیں۔ اخلاق درست کر لیں اور سیدھے راستے پر پڑ جائیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کسی ایک آدمی سے دوستی پیدا کر لیں۔ اور دوستی اللہ کے لئے پیدا کریں معاہدہ یہ ہو کہ ہم اس لئے دوستی کر رہے ہیں کہ میں تمہارے دین کی حفاظت کروں گا، تم میرے دین کی حفاظت کرنا۔ اگر میں نماز میں سستی کروں گا تو تم سے پکڑ کر گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے جانا اور تم نے اگر سستی کی، میں لے جاؤں گا۔ تم اگر برے راستہ پر گئے میں زبردستی ہٹاؤں گا۔ اگر میں چلوں تو تم ہٹانا۔ ہم اس لئے آپس میں دوستی کرتے ہیں کہ اس دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دین کی حفاظت ہو جائے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اگر آپ نے کسی ایک شخص سے دوستی کر لی اور اس میں روک ٹوک شروع ہوئی اور روک ٹوک دوسرا ہی کر سکتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اپنا عیب انسان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا فوراً پرکھ لیتا ہے کہ یہ عیب

کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ”دوسرے کی آنکھ کا دکھا بھی ٹھہرے ہو کے نظر پڑتا ہے اور اپنی آنکھ کا ٹھہرے بھی آدمی جکا نہیں سمجھتا“۔ اپنی برائی کو آدمی خود محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا فوراً سمجھ لیتا ہے یہ برائی ہے۔ اپنے ساتھ آدمی کو بڑا حسنِ ظن ہوتا ہے کہ میں تو اچھا ہوں۔ میرے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس حسنِ ظن سے جب دیکھتا ہے اپنی ہر حرکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کوئی برائی کی۔ دوسرے کو اتنا حسنِ ظن ہوتا نہیں اس واسطے وہ نگاہ رکھتا ہے۔ پھر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ برائی ہے اور ہے وہ دوست، تو فوراً نوکے گا کہ بھئی! اس برائی کو چھوڑ دو۔ اس دوست کو شریعت کی اصطلاح میں مواخات کہتے ہیں۔ یعنی دین کی خاطر بھائی چارہ قائم کرنا۔ کہ بھئی! جب میں کسی اچھی جگہ جاؤں گا، تمہیں ساتھ لے جاؤں گا، تم کہیں جاؤ تو مجھے ساتھ لے جانا تم برائی کرو، تو میں روک دوں گا۔ میں برائی کروں تو تم مجھے روک دینا۔ غرض ایک دوسرے کے دین کے حفاظت کریں گے۔ اس لئے بھائی بندی اور دوستی اختیار کرتے ہیں۔ اس کو مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

یہ اصول خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپ تشریف لائے تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کو ملا کر دونوں میں آپ نے بھائی چارہ قائم کیا۔ جتنے تھے سب کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔ یہ تمہارا دینی بھائی، یہ تمہارا دینی بھائی۔ اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، رہ گئے انصاری، تعداد ختم ہو گئی۔ سب مہاجرین کا بھائی چارہ قائم ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو اب کوئی انصاری باقی نہیں تھا کہ ان کی بھائی بندی کسی سے کرائی جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کچھ آزدگی پیدا ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اَنَا اَخُوْكَ لِيْ اَللّٰهُ“ ① تیرا دینی بھائی میں بننا ہوں اور میرے ساتھ معاہدہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے۔ اس سے بہتر کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھائی بنیں۔ بہر حال اس کو مواخات فی اللہ یعنی اللہ کے لئے بھائی بندی قائم کرنا کہتے ہیں۔ اس طرح سے اگر آپ بھائی بندی اختیار کریں تو چالیس دن میں پتہ چلے گا کہ کتنی برائیاں دور ہو گئی ہیں۔ اس واسطے کہ وہ دوست آپ کی برائیاں دیکھ دیکھ کر آپ کو مطلع کرے گا۔ آپ متنبہ ہوں گے۔ بہت سی برائیوں کی اصلاح ہو جائے گی بہت سے برے اخلاق چھوٹ جائیں گے، اس کے بھی چھوٹ جائیں گے، آپ کے بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو بھائی بندی کے اصول سے آپ نے وہ چیز کمائی۔ جو کسی شیخ و دت سے کما تے، کسی عالم ربانی کی صحبت سے کما تے یا کسی درویش ربانی کی صحبت میں بیٹھ کر کما تے۔ اب یہ عذر باقی نہیں ہے کہ صاحبِ امیری بہشتی میں نہ کوئی عالم ہے نہ درویش نہ سچے لوگوں لوگوں میں سے کوئی ہے، میرے اخلاق درست نہیں ہو سکتے تو دوسرا طریقہ مواخات کا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اپنے اخلاق درست کریں۔ اس اصول پر چل کر چالیس دن کے بعد فرق محسوس کریں گے۔ اگر اسی طرح برسوں گزر جائیں۔ اس وقت تک آپ ولی بن جائیں گے۔ اس لئے اصل چیز فیضِ صحبت ہے۔ دوسرے درجے کی چیز مواخات ہے۔

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ج ۱۲، ص ۱۸۳، رقم: ۳۶۵۳

علم و اخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، اعتدال بالغیر..... لیکن اگر آپ پھر کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی بستی میں ہوں جہاں کوئی اچھا آدمی نہیں کہ میں اسے دوست بنائوں۔ سب برے ہی برے پھر رہے ہیں۔ یہ عقل سے تو بعید ہے کہ کوئی ایسی بستی ہو جس میں کوئی بھی اچھا آدمی نہ ہو۔ یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہو گا سو چاس ہوں گے۔ تو علماء یہ لکھتے ہیں کہ چالیس آدمی جمع ہو جائیں ان میں کوئی نہ کوئی مقبول الہی ضرور ہوتا ہے۔ تو ایک بستی کی بستی ہو اور کوئی اللہ کا مقبول نہ ہو یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتا ہوں کہ بستی کے اندر کوئی بھلا آدمی نہیں اور دوست ہونے کے بجائے سارے آپ کے دشمن ہی دشمن پھر رہے ہیں، بدخواہ ہی بدخواہ ہیں کوئی بھی نیک انسان نہیں۔ میں کس سے بھائی چارہ قائم کروں؟

میں اس کے لئے ایک تیسری تدبیر بتاتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کیسے؟ اس کو اعتدال بالغیر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں سے عبرت لے کر اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کی ٹوہ لگائیں۔ کہ آپ کے دشمن آپ کے حق میں کیا کہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ دشمن آپ کی بھلائیاں تو پھیلانے سے رہے۔ وہ تو چھانٹ چھانٹ کے آپ کی برائیوں کو شہرت دیں گے۔ فلانے میں یہ کھوٹ ہے، یہ برائی ہے۔ اگر آپ کی بھلائیاں شائع کرنے لگیں، وہ دشمن ہی کیا ہوئے۔ وہ تو آپ کے دوست ہوئے۔ مگر دشمن کا کام یہی ہے کہ برائیاں جن جن کر پھیلانے، بدنام کرنے کی کوشش کرے، برسا کرے، آپ اس دشمن سے شیخ وقت کا کام لیں۔ وہ یہ کہ آپ یہ سنیں کہ میرے دشمن کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے جائیں آپ اسے چھوڑتے جائیں۔ جتنی برائیاں وہ بیان کریں، آپ اسے ایک ایک کر کے چھوڑ دیں۔ چالیس دن تک آپ عمل کر کے دیکھیں۔ بیسیوں برائیاں آپ میں سے ختم ہو جائیں گی۔ تو دشمن سے آپ نے وہ کام لے لیا، جو شیخ وقت سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کام لینا چاہیں، دشمن سے بھی لے سکتے ہیں۔ تو پہلی چیز فیضِ محبت، دوسری سواغات فی اللہ اور تیسری اعتدال بالغیر ہے کہ غیر سے نصیحت حاصل کرنا۔ تو دشمن سے آپ نے شیخ وقت کا کام لے لیا۔ اس لئے اگر کوئی اپنے دین کو درست بنانا چاہے تو راستہ نہیں نکال سکتا۔

علم و اخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبہ نفس..... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ جہاں نہ کوئی عالم و عارف نہ کوئی دوست، نہ دشمن گویا یہ بعید بات ہے کہ دوست نہ ہو۔ لیکن دشمن بیسیوں مل جاتے ہیں۔ دشمن تو کئے سیر ملتے ہیں اور دوست سیکڑوں روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ کئے سیر بھی زیادہ قیمت ہے۔ دشمن تو مفت بھی مل جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ آدمی بڑھان لکھا تو جہالت کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنیاں ہی کرے گا۔ دوست علم و اخلاق سکھاتے ہیں۔ جب علم و اخلاق حاصل نہ کرے تو آدمی دنیا میں دشمنی اور حسد ہی کرتا پھرے گا۔ برائی چاہے گا، بھلائی نہیں چاہے گا۔ اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں بالکل تنہا ہوں۔ میرے اخلاق کی درستگی کا کوئی طریقہ نہیں۔ اس لئے کہ سفر کر کے یوں نہیں جاسکتا کہ میرے پاس چیمہ نہیں۔ مگر میں

میرے پاس کوئی عالم اور ردائش نہیں۔ اپنے ماحول میں میرا کوئی دوست اور دشمن نہیں۔ میرے لئے اب تحصیل علم و اخلاق اور کمال پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو میں چوتھی تدبیر بناتا ہوں کہ آپ اس کے باوجود بھی اپنے اخلاق درست کر لیں۔ اور وہ بھی صحیح طریقہ ہے، فرضی نہیں ہے۔ اس طریقہ کا نام محاسبہ نفس ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ آپ عشاء کی نماز کے بعد دس منٹ مقرر کر لیں اور اس میں یہ سوچیں کہ آج دن میں، میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں کی ہیں، تو عمر بھر کی بھلائی برائی یاد نہیں رہے گی۔ لیکن دن بھر کی بھلائی برائی یاد رہے گی کہ آج کس کو فائدہ پہنچایا، سخاوت کی، کس کی غیبت کی، کس کی چٹلی کھائی، میں نے کوئی جھوٹی گواہی دی، کتنوں کا میں نے مال دیا، بدعتی کر کے کس کا قرضہ دیا۔ جب کتڑی، غرض جو بھی بری حرکت دن میں کی ہے، رات کو ضرور یاد رہے گی۔ اتنا بد حافظہ کوئی نہیں ہوتا کہ دن بھر کی باتیں عشاء کے بعد بھول جائے۔ تو محاسبہ کر کے شمار کر لیجئے کہ دس میں نے نیکیاں کی ہیں اور دس ہی بدیاں۔ دس نیکیوں پر اللہ کا سچے دل سے شکر ادا کیجئے۔

کہ اے اللہ! میں قائل نہیں تھا کہ نیکی ادا کروں۔ یہ تیرا فضل اور احسان ہے تو نے مجھ سے نیکی کرا دی میرے میں کہاں اہلیت تھی۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے نیکی کی تو ارادہ بھی تو ہی پیدا کرنے والا ہے۔ میں ارادے سے نیکی کرتا۔ لیکن اگر عمل کرنے کے سامان نہ ہوتے، عمن کیسے کرتا؟ وہ سامان تو نے ہی پیدا کئے، تو یعنی تو نے دی، بدن میں طاقت تو نے دی۔ تیرے فضل و کرم سے یہ نیکی ہوئی۔ میں شکر کرتا ہوں اور تیرا احسان مانتا ہوں۔ وعدہ خداوندی ہے ﴿لَبِئْسَ شُكْرًا لِّمَن لَّا يَذْكُرُنَّ﴾ ① جس نعت پر شکر ادا کرو گے۔ اس نعت کو بڑھاؤں گا، ترقی دوں گا۔ لہذا جب آپ نیکیوں پر شکر ادا کریں گے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق نیکیاں بڑھتی شروع ہوں گی۔ مال پر شکر ادا کرو گے، مال بڑھے گا، دین پر شکر کرنے سے دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے، محنت ترقی کرے گی۔ قوت پر شکر ادا کرو گے، قوت بڑھے گی۔ دین پر شکر ادا کرو گے، دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کرو گے عمل صالح ترقی کرے گا۔ اس لئے کہ آیت عام ہے ﴿لَبِئْسَ شُكْرًا لِّمَن لَّا يَذْكُرُنَّ﴾ ① یہ نہیں فرمایا: "لَبِئْسَ شُكْرًا لِّمَن لَّا يَذْكُرُنَّ" مال پر شکر کرو گے میں بڑھاؤں گا اور کسی چیز پر وعدہ نہیں۔ تو کوئی قید نہیں لگائی اور جب بلا قید کے فعل آتا ہے تو ہر چیز اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے نیکیوں پر شکر ادا کیا۔ تو وعدہ خداوندی کے مطابق اس میں ترقی ہوگئی۔

اور دس ہی برائیاں یاد آئیں کہ کچھ چٹلی کھائی تھی، غیبت کی تھی، کچھ کہہ کیا، کچھ وہ کیا، کسی کا مال مار لیا، کچھ ناپ تول میں کی کر دی، ڈنڈی ماری اور مال کم دیا، پیسے گا ہک سے پورے لے لئے یا مال خراب دے دیا دام پورے کر لئے۔ تو ایک تو حقوق اللہ ہیں و یا امت کے باسے میں۔ اس میں توبہ سے معاف ہو جانے کی توقع ہے۔ تو

جب بدیاں یاد آئیں ان سے توبہ کر لیں دس بدیاں نہیں چاہیے دس دفعہ توبہ نہ کریں۔ ایک دفعہ ہی توبہ کر لیں دس بدیاں معاف ہو جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وعدہ خداوندی ہے۔ اَلْاَثَابُ بَيْنَ الْمَلْتَبِ مَخْفَنٌ لَا قَنْبَ لَهٗ ① ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں“۔ بالکل پاک صاف ہو گیا تو نیکیوں پر شکر کیا، وہ بڑی شریعت شروع ہو گئیں۔ بدیوں پر توبہ کی وہ نئی شروع ہو گئیں۔ چالیس دن اگر آپ اس عمل کو روزانہ کریں گے۔ اور دس بدیاں روزانہ کا حساب لگائیں تو چالیس دن میں چار سو بدیاں کم ہو گئیں۔ حالانکہ چار سو آپ کرتے بھی نہ مگر بالکل مٹ گئیں شیخ وقت اتنی بدیاں نہ مٹا سکتا۔ جتنی آپ نے محاسبہ نفس سے مٹا دیں۔ آپ نے اپنے اخلاق درست کر لئے۔ اب آپ کے لئے کوئی جنت باقی نہیں رہی کہ صاحب امیرے ہاں نہ کوئی شیخ ہے نہ عالم نہ دوست نہ دشمن۔ مجھ سے اللہ میاں پوچھیں گے کہ تو نے اخلاق کیوں نہیں درست کئے؟ میں کہہ دوں گا، حضور اخلاق کو درست کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کیسے درست کرتا اور پیسہ میرے پاس نہیں تھا کہ سفر کر کے کسی بزرگ کے پاس جاؤں اس واسطے میں بد اخلاق رو گیا۔ فرمائیں گے نہیں تو تنہا پہاڑ پر تھا۔ جب بھی اخلاق درست کرنے کا طریقہ تھا اور وہ محاسبہ تھا۔ اپنے نفس کا حساب لینا تھا۔ اگر آپ عشاء کے بعد دس منٹ روز ان مراقبہ کو کر لیا کریں اور پھر اندازہ کریں چالیس دن کتنے بعد کتنے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ کتنی بد اخلاقیاں مٹتی ہیں، کتنی نیکیاں بڑھتی ہیں۔ آپ جتنا کام ایک شیخ وقت سے لیتے۔ آپ نے شیخ وقت اپنے نفس کو بنا لیا۔ نفس نے وہی کام کیا جو ایک شیخ وقت اور مربی دین کرتا ہے۔

اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں..... حاصل یہ نکلا کہ اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے تیار دیئے ہیں، کر سکتے ہیں۔ نہ چاہیں، خود پیغمبر بھی نصیحت کریں۔ آدمی درست نہیں ہو سکتا۔ جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی۔ اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی فاروق رضی اللہ عنہ بنا، کوئی ذی القورین رضی اللہ عنہ بنا، کوئی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بنا اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی تو کوئی ابو جہل بن گیا، کوئی ابولہب بن گیا، کوئی مسیلہ کلاب بن گیا۔ غرض مجھ سے ہی رہے اور نبی وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھی۔

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جب تمہیں ہی مقصود نہیں کہ اپنی اصلاح کرو تو دس تا دہائیں کر لو گے، دس باتیں بنا لو گے۔ مگر اللہ کے ہاں تا دہائیں نہیں چلیں گی۔ دنیا کو آدمی دھوکہ دے سکتا ہے۔ تو خدا کی جنت بندے پر پوری ہو چکی۔ کسی بھی حالت میں

① السنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الخیر، ج: ۲، ص: ۱۰۱، رقم: ۴۲۳۳۔ علامہ حلی فرماتے ہیں: ہمارے شیخ (ابن جریر) نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے لیکن اسے شہد کی جگہ سے منقطع کیسے المقاصد الحسنہ ج: ۱، ص: ۸۴، حرف اللام۔

ہوں اصلاح اخلاق کا راستہ موجود ہے۔ دوست و دشمن میں ہوں جب بھی تجلیا جماعت میں ہوں تب بھی۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ دنیا میں ہر چیز میں شر اور برائی اس کی ذات میں کھسی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ تو انسان کا بچہ بھی پیدا انکی طور پر برائیوں سے بھر پور ہے۔ جب تک اصلاح کی جدوجہد نہیں کرے گا۔ اس میں خوبی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کی طبی جہالت رفع نہیں ہوگی۔ جب تک علم حاصل نہ کرے اس کے اخلاق پاکیزہ نہیں بنیں گے جب تک کسی بااخلاق کی صحبت نہ اٹھائے یا قلب کا محاسبہ نہ کرے۔

آدی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

جب آدمی اپنی اصلاح خود نہ چاہے، کوئی اصلاح نہیں کر سکتا۔ خود اپنی خواہش سے آدمی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ مَّنْ بَيْنَ عَشْمَةٍ﴾ ① ”اے پیغمبر اقامت سے آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں، جو دل میں ڈرنے کا ارادہ رکھتا ہے“، جو اپنے دل میں ڈرنے کا مادہ رکھتا ہے اور جس نے یہ تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو مجھے نہیں ڈرنا، اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ وہ جب قبر میں جائے گا جہی اسے ڈر لگے گا۔ دنیا میں اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے۔ بڑے سے بڑا عالم آجائے لیکن وہ نہ چاہے کہ مجھے علم پہنچے، کبھی بھی علم نہیں پہنچے گا۔ بڑے سے بڑا درویش اور دیوانہ آجائے اور اس کا جذبہ نہ ہو کہ میں اخلاق درست کروں، کبھی بھی اخلاق درست نہیں ہوں گے اور اگر اپنا جذبہ ہو کہ اخلاق درست کروں تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ آپ اپنے نفس سے درست کر لیں گے۔ اصل میں آپ کا جذبہ اور آپ کا عزم ہے۔ یہ اصل چیز ہے۔ عارف رومی نے کہا ہے کہ۔

آب کمر جو، تھنکی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو، اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس ہوگی تو پانی خود آجائے گا۔ پیاس تو ہے نہیں اور آدمی یوں چاہے کہ پانی آجائے، تو اوپر سے دل سے پانی کی تلاش کرے گا۔ اوپر سے دل سے طلب کرنے پر کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ دل کے جذبے سے جب طلب ہوتی ہے، جہی ملتا ہے۔

اگر بیوی یوں کہے کہ فلاں زلیخا کے دے اور خاوند کے دل میں جذبہ پیدا ہو تو خاوند چوری کر لے گا، ڈیکھتی کرے گا۔ مگر اسے بنا کے دے گا۔ اس لئے کہ جذبہ پیدا ہو گیا اور جذبہ نہیں ہے تو وہ لاکھ چلائے، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کام تو اپنے جذبے سے چلتا ہے جب تک دل میں طلب نہیں ہوگی، محض کہنے سننے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ حال ایمان اور دین کا ہے۔ لاکھ وعظ کہتے والے وعظ کہیں۔ لیکن جب تک آپ کا عزم نہیں ہوگا کہ ہم درست ہوں۔ کبھی بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر آپ وعظ میں اس نیت سے آئیں کہ بھی ادیکھیں کون کیا بولتا ہے۔ گویا آپ تماشا دیکھنے آئے کہ بھی امداری کا تماشا تھا۔ فلاں نے اچھا کہا اور فلاں نے غلط۔ کبھی بھی فائدہ نہیں

① ہزارہ ۳۰، سورۃ النازعات، الآیہ ۳۵۔

ہوگا اور اگر اس لئے آئے کہ مجھے بھی کچھ دین کی بات لے کے جانی ہے، مجھے زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی جاہل آدمی بھی سچی بات کہے گا۔ تو اس سے بھی آپ جبرت پکڑیں گے۔ اپنے دل کی خود ہی اصلاح کر لیں گے۔ تو پھر اپنے اوپر بات رہی۔ اپنے اندر طلب صادق پیدا کیجئے اپنے اندر پیاس پیدا کیجئے پانی آ جائے گا۔ اپنے اندر زر کی طلب پیدا کیجئے۔ دولت آنے لگ جائے گی۔ اس کے لئے دس چیلے کریں گے۔ دوکان پر بیٹھیں گے، زمین پر جائیں گے، صنعت و حرفت کریں گے دولت آ جائے گی اور اگر آپ کے دل میں طلب نہیں ہے، سست پڑا رہنا آپ کو گوارا ہے کہ بس چار پائی پر پڑے رہو، اس سے کیا ملے گا؟

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے ایک کاشت کار ہو۔ برسات کی ہوائیں چلیں اور پانی پڑنا شروع ہوا۔ تو اس وقت بیج ڈالا جاتا ہے، بیج ڈالتے ہیں تو کھیتی آتی ہے۔ مگر کاشت کار نے کہا، کبھی عہد ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ چار مہینے ٹھنڈی ہواؤں کے ہیں۔ میں پز کے آرام سے سوؤں گا۔ کون جائے کھیت پر؟ کون بیج ڈالے؟ برسات کے چار مہینے اس نے چار پائی پر پڑ کے گزارے۔ یہاں تک کہ برسات ختم ہو گئی، گرمی آئی اور لولہ چلنی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر میں گئے لے آئے اور یہ اب منہ تک رہا ہے۔ بیج ڈالا تو غلہ لے آتا؟ مگر اس نے سونے میں اور آرام طلبی میں سارا وقت گزار دیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اب تو جو بیج پڑا ہوا ہے، اس کے بھی مارے جانے کا اندیشہ ہے، لو چل رہی ہے، آگ کی سی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اب کھیتی باڑی کا کیا کام؟ تو جیسے اس وقت سُست کاشت کار کو پیشانی اور ندامت ہوگی۔ مگر وہ ندامت کام نہیں دے گی اس لئے کہ وقت گزر چکا۔ اس طرح سے اگر ایک دین کے طالب میں سچی طلب نہیں ہے اور یہ دنیا کی عمر اس نے لہو و لعب اور کھیل کود میں گزار دی اور یہ سمجھ کے کہ آج تو چار پائیاں بھی ہیں، بستر بھی ہیں اور کھانے کی نعمتیں بھی ہیں۔ اب کون جائے نماز کو؟ اور کون روزے رکھے؟ کون دین کی تلاش کرے؟ یہ مزے پھر کہاں ملیں گے۔ تو جب موت کا وقت آئے گا۔ اس وقت کہا جائے گا۔ ﴿اَخْسِرُ جُؤًا اَفْقَسْتُكُمْ الْيَوْمَ نَخْزُوْنَ عَذَابَ الْهُوْلِ﴾ ① "اس نفس کو حوالے کر دو، یہ تمہاری ملک نہیں ہے۔ آج کے دن عذاب چکھنا پڑے گا"۔ اب ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو اس وقت ندامت نہ فائدہ دے گی نہ عمل کا وقت ہوگا۔

دنیا کا ہر ذرہ واعظ ہے..... حدیث میں ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت ملک الموت سے کہیں گے کہ اے ملک الموت! مجھے تھوڑا سا وقفہ دو کہ میں توبہ کر لوں اور میں اللہ کی طرف رجوع کر لوں۔ ملک الموت حیرت سے کہیں گے کہ کیا حیرے پاس میرے قاصد نہیں پہنچے؟ انہوں نے تجھے موت کا پیغام نہیں پہنچایا؟ جو آج توبہ کے لئے مجھ سے وقت مانگ رہا ہے؟ میرے بیسیوں قاصد اسی لئے پہنچے کہ توبہ کرے، وقت موجود تھا۔ اتنے قاصد اس پر جب توبہ نہ کی۔ میں تو آج آخری قاصد ہوں۔ اس کے بعد توبہ کا زمانہ ہی نہیں۔ وقت گزر

گیا۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی قاصد نہیں پہنچا۔ ملکہ الموت کہیں گے: قاصد نہیں پہنچا؟ میں نے بہت سے اپنے پیامبر بھیجے۔ جنہوں نے اطلاع دی ہوگی کہ میں تیرے پاس آنے والا ہوں۔ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں پہنچا۔ فرمائیں گے کیا تیری داڑھی میں سفید بان نہیں آئے؟ کیا تیرے سر کے اندر بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہوئے؟ یہ بڑھاپا میرا ہی تو قاصد تھا، جو خبر دے رہا تھا کہ میرے آنے کا وقت آ رہا ہے۔ موت کا پیغام آ چکا ہے۔ موت قریب آنے والی ہے وہ میرا قاصد ہی تھا۔ فرمائیں گے کیا تیرے پوتے نہیں پیدا ہوئے؟ نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی قاصد تھے کہ ان کا زمانہ آ گیا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کا وقت ختم ہو چکا۔ ان کے لئے جگہ خالی کرو۔ یہ میرے ہی تو قاصد تھے، جو خبر دے رہے تھے۔ ﴿وَجَاءَ كُمْ فَذُكِّرُوا﴾ کی ڈرنا والے تیرے پاس نہیں آئے؟ یہ سارے میری طرف سے آئے تھے۔ اور فرمائیں گے، کیا یہ دن رات کا موت پھیرا اس نے تجھے دھتکا نہیں کیا؟ سورج طلوع ہوا، طلوع کے بعد عروج کرتے کرتے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب گرنا شروع ہوا، یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ سورج کا چہرہ فنی ہوا، روشنی زرد پڑ گئی اور آخر میں غروب ہو کر چھپ گیا۔ گویا فسم ہو گیا۔ روز طلوع اس کی حیات ہے اور غروب اس کی موت ہے۔ جب اتنی بڑی ہستی روز اند آتی بھی ہے اور فنا بھی ہے، فنا بھی ہے، چھپ جانا بھی ہے۔ تو سورج بھی ایک وعظ ہے۔ جو وعظ نصیحت کہتا ہے۔ لیکن کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھے۔ تو اس کے وعظ کو سنے گا۔ اور اگر بیلوں کی نگاہ سے دیکھے، تو بیل کے سامنے بھی سورج چھپتا ہے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اس لئے کہ نہ عقل ہے نہ علم۔ اگر انسان بھی کائنات کے واقعات کو بیلوں کی طرح دیکھنے لگے کہ واقعات کی صورت تو دیکھ نے۔ عبرت نصیحت حاصل نہ کرے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ گیا۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ جانور واقعات کی صورتوں کو دیکھتا ہے۔ انسان ان کی حقیقتوں میں گھس کر ان سے کچھ علم اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی: ﴿قَالَ يَا آدَمُ اسْكُنْ مِنْ هَذِهِ الْجِبْتَيْنِ﴾ ایتہ فی السموات والاذحض بصرؤن علیہا وھم عنہا معروضون ﴿وَمَا يُولُؤْمِنْ أَكْثَرُ ھُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَھُمْ مُنْشَرِكُونَ﴾ ① کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گزرتی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے اور آنکھ بند کر کے چنا جاتا ہے۔ اس سے عبرت نصیحت حاصل نہیں کرتا اور فرمایا، بہت سے وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ مومن بن گئے ہیں، مگر شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز سے کٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ہر حادثے کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور مالک کو پہچانتے۔ لیکن یہ پھر بھی اپنے ہی نفس کی رضا میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہی نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی آرام کی فکر میں ہیں۔ نہ آخرت، نہ عبرت، نہ نصیحت، پیش نظر تو مومن بھی ہیں مگر ساتھ شرک بھی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے، کہ سورج کے طلوع و غروب کے واقعات حیوان کے اوپر بھی گزرتے ہیں اور انسان بھی دیکھ رہا ہے۔

حیوان فقط شکل کو دیکھتا ہے، انسان اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہے تو کون سا ذرہ خالی ہوگا، جس میں تغیرات نہ ہوں۔ ہواؤں کا چلنا، زمین کی تغیر و تحریک موسموں کا آنا جانا، پھلوں کا آنا اور مٹ جانا۔ ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ عالم موت اور حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیداؤں میں بھی ہے اور موت میں بھی ہے، عروج بھی ہے زوال بھی ہے۔ ترقی بھی ہے، تنزلی بھی ہے، تغیر بھی ہے، تحریک بھی ہے۔ جو چیز پیدا ہوئی وہ موت کے منہ میں ضرور جائے گی۔

عیسیٰ بن مریم نے فرمایا: ”بَلِّغُوا لِلْمَوْتِ وَابْتَغُوا لِلْخَرَابِ“ ① جو موت کے لئے بچوں کو مرنے کے لئے پیدا کرو، تعمیریں بناؤ و دھانے کے لئے جو تعمیر بنے گی، ایک دن اس کی تحریک بھی ہوگی۔ دنیا میں ہر تعمیر کے لئے تحریک اور ہر بناء کے لئے خلائق لازم، ہر حیات کے لئے موت لازم، ہر آغاز کے لئے انجام لازم ہر ابتداء کے لئے انجام لازم۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔

ہمارے مرشد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے ذرات کو اور حالات کو دیکھو کہ وہ اعلان کر رہے ہیں کہ ”فَافْهَمُ فَافْهَمُ.....“ اب بھی سمجھو، اب بھی سمجھو، غفلت کی نیند کو چھوڑ دو، ان تغیرات کو دیکھ کر اب بھی متوجہ ہو لو، کہ تم میں بھی تغیر آنے والا ہے۔ تم بھی اس دنیا کے جز ہو۔ جب دنیا کے ہر جز میں تغیر ہے اور تغیر کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ تو تم بھی فنا کی طرف جارہے ہو۔ انسان پر جو بیماریاں آتی ہیں۔ یہ علامت ہے کہ جب یہ تغیر صحت سے پیدا ہوا تو صحت والے پر بھی ایک دن تغیر آنے والا ہے، طاقت بدن میں آتی ہے ایک دن اس کے ٹھنسنے کا زمانہ بھی آتا ہے۔ غذائیں ہضم کرنے کی قوت ہوتی ہے، ایک دن ضعف تغیر کا زمانہ ہے، جوانی آتی ہے، ایک دن بڑھاپے کا دور آنے والا ہے۔ جب انسان کے عوارض میں تغیرات ہیں تو ذات میں بھی تغیر ہوگا۔ یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ سارے واعظ و مقرر ہیں۔ سارے نصیحتیں کر رہے ہیں۔ آپ اس تلاش میں ہیں کہ کسی واعظ، مقرر یا عالم کو بلائیں اور تقریر سنیں میں نے ہزاروں واعظوں کا پتہ دے دیا کہ گھر بیٹھے اور واعظ سنئے جاسیئے۔ سورج زمین، ہواؤں کا چلنا، دنیا کے تغیرات۔ انگریز ذرہ ذرہ واعظ ہے، سنئے والا اور عبرت پکڑنے والا ہونا چاہئے وہ ہر جز سے عبرت پکڑے گا۔ تو گھر میں واعظ موجود ہے اور گھر چھوڑ کر آپ کے بدن کے اندر واعظ موجود ہیں۔ اپنے اندر کے تغیرات کو دیکھئے کہ ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ استاد و داغ بڑا شاعر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ۔

ہوش و حواس، تاب و توان داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا
سامان تو چلا گیا۔ اب مسافر بھی روانہ ہو رہا ہے۔ روزانہ سامان جاتا رہتا ہے اور ہمیں عبرت نہیں کہ ایک

① المطالب العالیہ، کتاب الرقاق، باب الوصایا النافعة ج: ۹ ص: ۱۳۶ رقم: ۳۱۹۹

وقت آ رہا ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں نوشیرواں کا واقعہ لکھتے ہوئے خوب کہا ہے کہ ۔

خبر سے کن اسے فلاں و غنیمت شمار عمر ز اں بیشتر کہ باجم در آید فلاں نمائد

اے عزیز! کچھ نہ کچھ خیر اور بھلائی کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ یہ موتیوں جیسے دن ہیں۔ جو جا رہے ہیں افسوس موتی ہیں۔ جو قیمت سے نہیں، اللہ نے بلا قیمت دے دیئے ہیں۔ تو کوئی خیر کر لے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ اس سے پہلے کہ یہ آواز دی جائے کہ آج فلاں نہیں رہا۔ ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ ① اس سے پہلے کچھ کرنا ہے تو کر لے۔ آج ہم قبرستانوں سے گزرتے ہیں۔ ہزاروں وہ آدمی جو ہمارے دوست، احباب، والد، عزیز، اقرباء تھے آج وہ قبر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیں اور خاک کا جز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افسوس! یہ آدمی تھے اور آج نہیں۔ کل کو ہم پر بھی یہی وقت آنے والا کہ گزرنے والے ہمارے اوپر سے گزریں گے اور کہیں گے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں تھے۔ مگر آج ان کا نشان اور پتہ نہیں تو ہر شخص اس راستے پر جانے والا ہے کچھ اس راستے کی بھی فکر کر لینی چاہئے۔

شیطان دھوکہ دے..... بعض آدمی کو دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرے اندر قوت ہے۔ جب بڑھا پا آئے گا تو بہ کر لیں گے ابھی تو کھانے پینے لہو و لعب اور قوت کا دور ہے۔ موت کے کچھ آثار و نشانات نہیں ہیں۔ جب بڑھا پا آئے گا اور یہ بات سامنے آ جائے گی کہ اب چند دن باقی رہ گئے۔ اس وقت تو بہ کر لیں گے اب حیرے اڑالیں۔ عیش میں رہیں۔ مگر یہ محض دھوکہ شیطان و وسوسہ ہے۔ اس لئے کہ موت کے لئے بڑھا پا، جوانی، بیماری شرط نہیں ہے۔ بلا بیماری کے آدمی جیسے بٹھائے چلا جاتا ہے۔ جوان بھی مرتے ہیں، بچے، بوڑھے بھی مرتے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے سب کو آ رہی ہے۔ اس دوسرے کو تب آپ دل میں جگہ دیں کہ بڑھا پے کے بغیر آدمی مرانی نہ کرتا۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھی موت کا وقت ہی نہیں آیا۔ لیکن جب بڑھا پے سے پہلے موت آ جاتی ہے پھر دل میں یہ خیال کیسے گزرا کہ بڑھا پا آ بیگا جب تو بہ کر لیں گے۔ کیا خبر ہے کہ بڑھا پا آئے گا ابھی کہ نہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں، میں تو یوں کہوں گا کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ جوانی میں موت زیادہ آتی ہے۔ بوڑھا پے میں کم آتی ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ مجموعوں کو دیکھیں، بازاروں میں گھومیں۔ آپ کو بوڑھے کم نظر آئیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو دنیا میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سارے سفید داڑھی کے نظر پڑا کرتے۔ لاکھ جوان زیادہ نظر پڑتے ہیں، بوڑھے کم نظر پڑتے ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ بڑھا پے تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ پہلے ہی ختم ہو جاتے

ہیں۔ تو جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم موت آتی ہے۔ یہ محض ایک دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا تو بہ کر لیں گے۔ بڑھاپا شرط نہیں اور تو اور ماں کے پیٹ میں بھی مر جاتے ہیں۔ دنیا میں آنے ہی نہیں پاتے۔ اس کی بھی نظیریں ہیں تو موت کے لئے کوئی خاص سبب متعین نہیں ہے۔ پھر اس میں اس دھوکے میں پڑنا کہ جب غلام بات ہوگی، تب تو بہ کریں گے۔ آج نہیں کل کریں گے یہ جو کل پر بات ٹالنے کا عادی ہو گیا ہے۔ جب وہ کل آئے گی تو اگلی کل پر ڈال دے گا۔ وہ آئے گی تو اس سے اگلی کل پر۔ اسی کل کل میں رہے گا اور موت کا وقت آ جائے گا۔ تو بہ نصیب نہیں ہوگی۔ جسے تو بہ کرنی ہے۔ وہ آج کرے اور اس عمر کو قیمت سمجھے۔

عمل کا زمانہ جوانی ہے۔۔۔۔۔ بلکہ یہ خیال کرے کہ عمل کرنے کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپے کا زمانہ عمل کا نہیں ہوتا بڑھاپے کا زمانہ پنشن کا زمانہ ہے اور حق تعالیٰ کے ہاں پنشن دی جاتی ہے۔ جیسے گورنمنٹ کے ہاں پنشن سال کی عمر ہو جائے تو پنشن دے دیتے ہیں۔ مگر گورنمنٹوں بے چاریوں کے خزانے چھوٹے ہیں۔ اس واسطے وہ آدمی پنشن دیتے ہیں۔ دو گنی اور بھی تو کیا؟ پوری تنخواہ بھی نہیں۔ آدمی تنخواہ دیتے ہیں۔ اللہ میاں کے ہاں سے پوری پنشن ملتی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جوانی میں کوئی عمل کرتا تھا۔ بڑھاپا آ گیا، ملاقات رہی نہیں اور عمل نہیں کر سکا حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔ کہ نامہ اعمال میں ثواب برابر لکھتے رہو۔ اس واسطے کہ اس نے خود نہیں چھوڑا بڑھاپا ہم نے بھیجا ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لہذا عمل برابر لکھتے رہو۔ گویا آج بھی عمل کر رہا ہے۔ جو دس سطلے پڑھتا اور آج وہ نہیں پڑھ سکتا مگر ثواب دس ہی کا لکھتے جاؤ اس لئے کہ اس کے ارادے کا قصور نہیں ہے۔ لہذا جوانی میں عمل اور بڑھاپا پنشن کا زمانہ ہے۔ جس نے جو کچھ کیا، جوانی میں کیا ہے۔ اس واسطے جوانی کے اندر یہ لیت و فعل کہ جب بڑھاپا آ جائے گا، جب تو بہ کر لیں گے۔ "اے ہنس بریلی کو" یہ تو اندر حاکم ہے کہ جب پنشن ملے گا زمانہ آئے جب آدمی کہے کہ میں کام کروں گا۔ جیسے کوئی آدمی گورنمنٹ سے کہے کہ صاحب! ابھی تو میری پندرہ برس کی عمر ہے۔ ابھی آپ مجھے ملازم نہ رکھیں۔ جب میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں، جب ملازم رکھیں۔ گورنمنٹ کہے گی کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ ارے ملازمت کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپا پنشن کا اور عمل کے چھوڑنے کا زمانہ ہے۔ تو عمل کا زمانہ سمجھ رہا ہے۔ یہی دین میں بھی بات ہے۔ جس نے جو کچھ بھی کیا ہے، جوانی میں کیا ہے بڑھاپے میں تو ثواب لوٹنے کا زمانہ ہے۔ وہ کسی شاعر نے کیا خواب کہا ہے کہ۔

من نمی گویم کہ زیاں کن، بایند سود باش
اے زفر مت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

میں یوں نہیں کہتا کہ کوئی نفع یا نقصان کا کام کرو۔ یہ کہتا ہوں کہ جو کرتا ہے جلدی کر لو۔ اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا۔ تو عمل کا زمانہ یہی ہے جسے تو بہ کرنی ہے آج کرے، کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اس واسطے وعظن کر یا دنیا کے ان ذروں سے وعظن کر یا دیکھ کر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کرے۔ ممکن ہے کل کو یہ جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر

میں لکھا ہے اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ میں ایک پیرہ اللہ کے راستے میں مدتہ کروں، فوراً کر دے۔ اس لئے کہ ممکن ہے گھنٹہ بعد قلب کی وہ کیفیت نہ رہے کہ ایک پیرہ دے کے کیا کروں گا اور ہزار دینے پر قادر نہیں۔ پھر یہ نہ ایک کرے گا نہ ہزار کرے گا۔ محرومی اس کے سر پر پڑے گی۔ اس لئے جب کسی نیکی کا جذبہ پیدا ہو فوراً کر گزرے، نیکی کے اندر مشورہ طلب کرنے یا استخارے کرنے کی ضرورت نہیں۔ استخارہ مشورہ ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جن میں حق واضح نہ ہو کہ بھی مشورہ کر لو، حق واضح ہو جائے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دے دیا۔ اس میں استخارہ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو۔ آپ نے کہا، میں ذرا گھر والوں سے مشورہ کر لوں کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں، تو لوگ کہیں گے، احمق آدمی! خدا کے حکم کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے کہا زکوٰۃ دو کر حتیٰ میں ذرا استخارہ کر لوں۔ اگر استخارہ اللہ سے پوچھنے کو کہتے ہیں تو وہ خود کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں حکم دے رہے ہیں۔

در کار خیر حاجت بیج استخارہ نیست

کار خیر میں استخارہ کی ضرورت نہیں۔ جس میں آدمی کو تذبذب ہو اور اس کا خیر ہونا پوری طرح ثابت نہ ہو۔ اس میں استخارہ و مشورہ کرے۔ آج اگر کسی وعظ و نصیحت سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو، فوراً کر گزرے، کل پراٹھا کے نہ رکھے۔ اللہ پر بھروسہ کرے۔ پھر وہ جاری بھی ہو جائے گی۔ "ثَبِّتْ وَ تَقْلُ" میں نہ پڑے کہ کل کر لوں گا، پرسوں کروں گا۔ یہ شیطان کی طرف سے ڈھیل کرائی جاتی ہے کہ اس کے دل سے یہ جذبہ نکل جائے پھر میں اس سے نشت لوں گا۔ تو جب جذبہ خیر، جذبہ حق آ جائے۔ اسے خدا کی طرف سے امر سمجھو، اسے کر ڈالو۔ تو اپنی اصلاح کا تھوڑا بھی جذبہ پیدا ہو، آدمی کر گزرے۔ اپنے اخلاق کو درست کرنے کا جذبہ خواہ نفس کے محاسبے سے ہو یا مواخات فی اللہ سے ہو یا غیروں سے عبرت پکڑنے سے ہو یا بچوں کی صحبت اختیار کرنے سے ہو، آدمی کر گزرے۔ اس لئے یہ جیلہ کام نہیں دے گا کہ صاحب اکوئی درویش، عالم نہیں ہے، کوئی دوست نہیں ہے، کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں بھی، اکوئی بھی نہیں تو خود موجود ہے۔ اپنے نفس سے ہی کام لے سکتا ہے۔

تو یہ ایک نسخہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ جو چار دواؤں پر مشتمل ہے۔ صحبت صالحین، مواخات فی اللہ، اتعاظ بالغیر اور محاسبہ نفس۔ اب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مل جائے۔ وہ بھی ان شاء اللہ کارآمد ہے۔ بعض نسخے ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی ایک دوا بھی مل جائے۔ تو وہ بھی صحت کے لئے مفید ہوتی ہے اور اگر چاروں دوائیں مل کے عجوبہ مرکب بن جائے، تو سبحان اللہ کہ صحبت ایک بھی منیر ہو مواخات فی اللہ کہ دینی بھائی بندی بھی ہو جائے، دشمنوں سے عبرت بھی پکڑے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے۔ چاروں دواؤں کا نسخہ اگر پہنچے تو بڑا مشرقی ہو گا۔ جس نسخہ کا ایک ایک جز شفا کا ذریعہ ہو۔ اس نسخے کے اگر سارے اجزاء مل جائیں، وہ تو اکسیر بن جائے گا۔ اس واسطے یہ چند چیزیں میں نے ذکر کیں تاکہ ان سے عبرت بھی ہو۔ ان سے اپنی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہو

اور ان سے اپنے اخلاق بھی درست ہوں اور آدمی یہ سمجھ لے کہ میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ خوبی کی میں جتنی محنت کروں گا آجائے گی برائی محنت سے نہیں آتی۔ وہ میرے اندر پیدا ہونے لگی ہوئی ہے۔ اسے زائل کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہے اور اس کے زائل کرنے کے یہ چار طریقے ہیں۔ جو میں نے عرض کئے۔ بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ اب وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کی اصلاح کرنے، اپنے اعمال و اخلاق کو درست کرنے اور اپنے عقائد کو سچا بنانے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا نصیب فرماوے، اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور ہماری دنیا کو درست فرماوے، ہماری آخرت کو بھی درست فرماوے، ہم میں جتنے کھوٹ ہیں۔ اللہ ان کو نکال دے، نفس میں جتنی بیماریاں تھسی ہوئی ہیں، ان کو زائل فرماوے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے زعمے سے محفوظ رکھے، حق تعالیٰ ہر مشکل سے ہمیں بچائے، ہماری راہ درست فرماوے۔

”اللَّهُمَّ رَبَّنَا نَقُبلُ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَأَرْفَعُ مَنَابِعَنَا وَرُبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَأَعِزُّ دَعْوَانَا إِنَّ الْخَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“

وقت نزع کا خطاب..... اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت و نزع کے وقت خطاب کیا جائے گا۔ جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جیسے شرعی خطابات زندگی میں کہے گئے ہیں کہ ”صَلُّوا“ نماز پڑھو۔ یا ”عَلَيْكُمْ بِالصَّيَامِ“ روزے رکھو یا ”عَلَيْكُمْ بِالْحَجِّ“ حج ادا کرو وغیرہ۔ یہ زندگی کے خطابات ہیں اور یہ زندگی کے خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔ اور اسی وقت کی یہ بشارت ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اور اسی وقت ایک انعام کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُنْتَبِئَةُ﴾ ① یہ خطاب کس وقت ہوگا؟ حدیث میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ جب مومن پر اس کا آخری وقت آتا ہے اور اس کا نزع شروع ہوتا ہے تو ملک الموت کے احوان و انصار اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں جو حالت نزع میں ہے اور اس کی موت کی ابتداء ہو رہی ہے۔ ملک الموت کے دو قسم کے احوان مددگار ہیں۔ ایک اصحاب یمن اور ایک اصحاب شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بیض الوجہ ہیں۔ یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے۔ تاریک اور سیاہ اور زراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔

مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحاب یمن کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ بندہ جس کی موت قریب آچکی ہے۔ یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر ستکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسے ایک قسم کا تحیر پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمن اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لئے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے، نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے۔ ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے اور جزع فزع میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔

یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر ایک عالم تحیر طاری ہے کہ سورج اور چاند ہیں، کیا چیز؟ آہستہ آہستہ قریب آرہے ہیں، یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں، اب شخص ہوتا ہے کہ یہ شخص روشنیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شکل و صورت سب شخص ہو کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر و مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ اتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں۔ بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ”اٰخِرُ حَسْبِيَ اَقْبَلُ النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ تَخَانَتْ فِي الْجَنَّةِ الْعُظْمَى اَخْبَرُ جِيْءَ اِلَى رَوْحٍ وَ

زَيْحَانٍ وَرَبِّ غَيْرِ غَضَبَانٍ ① اے پاک روح اور نفس! نکل اس بدن میں سے کہ تو نے اپنے عمل سے اسے پاک بنادیا تھا۔ تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک۔ کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب نہ کر نہیں ہوگا۔ بلکہ رحمت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرف چل یہ گویا ایک قسم کا وعظ ہوتا ہے جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس میں دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم و الم اور نہ پریشانی ہے۔ بلکہ بشارتیں، راحتیں اور انبساط ہے۔ ادھر چل اور آخر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی، نکلتیں اٹھا لیں۔ اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ و ترغیب ہے تاکہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرزا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے عالم کی طرف ٹکنا سہل ہو جائے گا۔

ملا نہ موت مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ غرض پیسے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر طبعی طور پر انسان کو موت شائق ہے کہ اس عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لئے جیسے بدن کا چھوڑنا بھاری ہے۔ اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے۔ اس لئے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت عوارض نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے۔ مگر وہ طبعی کراہت اور ہتھکڑی غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فانی کر دیا تھا وہ فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، میں ایک دن ان کی مجلس میں حاضر تھا۔ دو یا تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ عام مجلس نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے حضرت کی طبیعت میں کچھ جوش سا پیدا ہوا۔ تو ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ایسی آدمی تو نہیں جیسے گویا کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتے ہوں، تو ادھر ادھر دیکھا تاکہ کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو۔ جب مطمئن ہو گئے تو ہم سے خطاب کر کے فرمایا کہ: ”الحمد للہ! میں موت و آخرت کے لئے اتنا تیار بیٹھا ہوں کہ اگر ابھی پیغام آ جائے تو خوشی خوشی چلا جاؤں۔“ یہ بات فرمائی یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ کون سی ایسی نئی بات ہے جس شخص کے پاس بھی موت کا پیغام آئے گا، خواہی انھوں ہی اسے تو جانا ہی پڑے گا۔ یوں کہنا میں تیار بیٹھا ہوں۔ اس سے کیا حاصل؟ یہ تیار ہو یا نہ ہو جب موت آئے گی تو جانا ہی پڑے گا اس میں تیاری کی کیا بات ہے؟

گویا ہمیں ایک استہجاب سا ہوا کہ یہ کون سی ایسی راز کی بات تھی کہ حضرت نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی ایسی آدمی اور بیگانہ نہ ہو۔ مگر بعد میں واقعی معلوم ہوا کہ ایک تو موت کا آنا کونینی محور پر ہے۔ جب آ جائے گی تو آدمی جائے گا۔ جیسے پیدا ہونے میں مجبور ہے۔ جب اللہ کسی کو دنیا میں لانا چاہے ہے۔ وہ چاہے نہ چاہے اسے آنا پڑتا ہے۔

① التسنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر النعمت والاسعاد لہ، ج ۱۲، ص ۳۱۴

اسی طرح جب آخرت میں لے جانا چاہیں گے۔ وہ جو ہے نہ جو ہے جانا ہی پڑے گا۔ تو ایک فعل خداوندی ہے کہ نکوین الہی کے سامنے انسان مجبور ہے۔ ایک رضا ہے کہ اپنی خوشی سے چائے۔ یہ جب ہوگا جب اللہ سے انس و محبت غالب آجائے۔ آخرت کی نعمتوں کی رغبت غالب آجائے وہاں کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت بیچ معنوم ہو۔ قرآن کریم کی ایک آیت دنیا وہ فیہا سے زیادہ اوپٹی اور برتر نظر آئے اور یہ سمجھے کہ اگر نیک آیت کا مفہوم میرے ذہن میں آگیا اور کیفیت یہ طاری ہوگئی کہ پوری دنیا مجھ سے چھین لی جائے، یہ نعمت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ جب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ اور دین اسلام کی محبت کا غلبہ ہو جائے۔ اس وقت پھر انسان کے دہن میں موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ کس طرح سے دنیا سے نکلوں جیسے بعض عارفین کا قول ہے کہ خرم آل روز کزین منزل ویزاں بردیہ تادر میکندہ شاداں و غزال خوال بردیہ

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس آباد دیار میں پہنچیں گے اور اس شہر مصوب میں پہنچیں گے۔ جہاں کے ہم سے وعدہ کئے گئے ہیں۔ اس لئے موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔

مومن کو عند الموت حق تعالیٰ براو راست بھی خطاب فرماتے ہیں..... حدیث میں موت کی تمنا کی ممانعت فرمائی گئی۔ فرمایا "لَا تَسْتَعِزُّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ" ① کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اس لئے کہ موت آخر زندگی اور عمل کو بھی قطع کر دے گی۔ جتنی زیادہ زندگی تنگی کے ساتھ ہوا اتنی بہتر ہے۔ اس لئے موت کی تمنا نہ کرو اور ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّي رَأَيْتُ الْمَلَائِكَةَ لَبُّوْا مِنْ ذُرِّيَةِ النَّاسِ فَتَمُوتُوا الْمَوْتُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ ② "اے یہود! اگر تمہیں، اولیاء اللہ اور ولی کمال ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔ بظاہر ایک تعارض محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو۔ یہ دو باتیں آپس میں ٹکرائیں لیکن ایک دوسری حدیث نے اس مضمون کو صاف کر دیا۔ فرمایا گیا: "لَا تَسْتَعِزُّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ بَصْرًا نَزَلَ بِهِ" ③ کوئی شخص کسی مصیبت سے استعا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ بے عبری اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آ جاتی۔ اگر موت آگئی اور وہیں بھی مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ انعام خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے عبری ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔ لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا

① الصحيح للبخاری، کتاب المرضی، باب تعنی المرضی للموت، ج ۱ ص ۲۹۱ رقم: ۵۲۳۵.

② پارہ ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۶.

③ الصحيح للبخاری، کتاب المرضی، باب تعنی المرضی للموت، ج ۱ ص ۲۹۱ رقم: ۵۲۳۹.

ہو۔ یہ عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، رازمی کا ایک ایک ہال کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا تو کہ خوشی ان کے دل سے الٹی پڑتی تھی۔ فرمایا: "غَدًا نَلْقَى مُحَمَّدًا وَ أَصْحَابَهُ" کل ان شاء اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے۔ اس لئے اگر موت کی تمنہ ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنایہ خلاف مطلوب ہے۔ بہر حال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنہ ہوتی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلَيَّ مَنْ يَّعْمَلُ اَنْبِيََا رَسُوْلُكَ" ○ "اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کر دے جو میرے نبی اور رسولوں ہونے کا قائل ہے۔"

اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے: "الْمَوْتُ مُحَقَّقَةُ الْمُؤْمِنِ" ○ موت مومن کے لئے تختہ ہے۔ "يُؤْتَى الْمَحْبِبُّ اِلَى الْحَبِيبِ" ○ جو ایک عاشق کو اس کے محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے۔ اگر عاشق ہو تو محبوب کے پاس جانا مصوب ہوتا ہے یا مکروہ؟ جو عاشق خداوندی ہے اس کو اللہ سے ملنے کی تمنہ ہوتی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے۔ تو موت درمیانی واسطہ ہے۔ اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا۔ بہر حال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنہ ہوتی ہے۔ اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو دائمی موت کے شائق ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔

ملائکہ علیہم السلام اور ملک الموت کے اعوان و انصار آ کر انہیں موت کی ترقیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح در بھان ہے اور اس رب کی طرف جو کبھی نہ مہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دہائی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہو جاتا ہے۔ پھر رزق شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آباد نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آباد کر کے نکالنی ہے۔ گویا خدا بری طور پر جبراً اس کو کھینچتا نہیں ہے۔ یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھاتے ہیں۔ یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم اڑا کر دو۔ تو

○ شمس المکبر للطنطاوی ج ۳ ص ۷۸۔ علامہ بیہقی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی و ابیہ محمد بن

اسماعیل بن عیاض و هو ضعيف دیکھئے: مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۰۶ ○ مرقاۃ المفاتیح، کتاب المدعوۃ، باب ذکر اللہ عزوجل ج ۸ ص ۱۷۰ روایت ضعیف ہے، دیکھئے کشف الخفاء و فہم ۲۶۶۔

○ یہ بیان اسود کا قول ہے دیکھئے: فیض القدير ج ۳ ص ۳۰۷۔

غیر اگر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا۔ اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ اِزْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّاتٍ﴾ ①

تو بواسطہ ملائکہ پیغام دیتے ہیں کہ اُنخُرْجِيْ اَيْتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ كَمَا نَتَّ فِي الْجَنَّةِ الطَّيِّبَةِ اُنخُرْجِيْ اِلَىٰ رَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَزَيْتٍ غَيْرِ غَضْبَانٍ ② اے پاک روح، چلی آ۔ تیرا بدن بھی پاک تھا اور خود بھی تو پاک ہے۔ یہ تو ملائکہ عظیم السلام کے واسطے سے بشارت ہوتی ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست پیغام دیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ خود پکارتے ہیں يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ اِزْجِعِي اِلَىٰ رَبِّكِ ③ اے نفس مطمئنہ آ۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿اِزْجِعِي اِلَىٰ رَبِّكِ﴾ ④ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف کہ تو خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی۔ یہ اس وقت کا خطاب اور بشارت ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کو ہوگا۔ یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مومن کے لئے ہوگا۔

مومن کے لئے اعلانِ رضا کی بشارت..... بشارت اس میں کیا ہے؟ ﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ⑤ یہ بشارت ہے۔ یعنی اے نفس مطمئنہ آ اور ہماری طرف لوٹ۔ اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔ اعلانِ رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟

بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے۔ سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس سے راضی ہونے پر ہے۔ کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہوں؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا کہ میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہ بھی کہی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مومن کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہی ہیں۔ مومن کی کیا خصوصیات ہے؟

احادیث کے اندر اس رضا کی تفسیر فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ ایمان کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں۔ جب تک ان افعالِ الٰہیہ کے ساتھ رضا مندی نہ ہو، جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ حق تعالیٰ شانہ، جیسے خالق و مالک ہیں، رب بھی ہیں۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، السنن لابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الموت ولاسعادۃ

ج: ۱۲، ص: ۳۱۳، ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸، ③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸، ④

رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔ پال پرورش کے اندر وہ افعال بھی کئے جاتے ہیں، جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے۔

ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چکارنی ہے تھپڑ بھی تو مارتی ہے۔ جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے۔ باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب میں نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے۔ کبھی جو بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا دل میں محبت موجود ہے مگر کہہ رہا ہے کہ گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اب اگر تو نے کوتاہی کی تو دیوار سے دے کر تجھے ماروں گا۔ کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار میں دے مارے۔ صرف ذرا نلے دھمکانے کے لئے ایسا کہتا ہے۔ غرض جیسے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔

اگر بچہ ماں کے دودھ پلانے پر خوش ہو جائے روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ برا بھلا معقول اور ناخلف بیٹا ہے۔ جیسے اسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہئے تھا ویسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصیبت کے لئے ہے۔ کیوں کہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں محبت کا ہے۔ اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی۔ خلف صارحہ وہ کھلائے گا جو باپ کے چکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے۔ کھانا کھلانے پر بھی راضی اور جب سزا دے کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا۔ ایک وقت کی روٹی بند کر دے۔ تو بھی راضی ہے اس لئے کہ وہ چاہتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے لئے ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی وہ ماں کی گود میں جاتا ہے۔ جب طمانچہ مارتی ہے تو رونا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس گود کے سوا میرے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔ بہر حال جب کھانا پانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے۔ تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تربیت ہے۔ بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو۔ اگر وہ تو گھر بنادے تو بتاتا اس وقت راضی ہو، اس پر بھی اتنی ہی راضی ہو جب وہ ساری نعمتیں جھین کر مفلس بنادے۔ جب کہا جائے گا کہ یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے جتنی رضا مندی نعمت میں ہو، اگر وہ مصیبت بھیج دے تو اتنی ہی رضا مندی مصیبت میں بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ بندہ کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔

بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے۔ مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، لیکن بندے نے اس کو غلط طریق سے استعمال کرنا شروع کیا۔ بجائے اس کے شکر گزاری سے رات دن اپنے پروردگار کے آگے جھٹکا اس

نے قمیٹ میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بتالیا۔ تو انصاف اور عقل سے سوچنے کہ چھڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے۔ اس لئے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں۔ حقیقت وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی کی قمی۔ لاؤ اس سے چھین کے بھر لو بلکہ ایک تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ شاید یہ اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آ جائے اور جس برائی کی طرف جا رہا ہے۔ پھر توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن کریم میں ایک موقع پر فرمایا گیا ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ لِيَاخُذَهُمْ بِالْأَسْوَءِ وَالظُّلْمِ ۖ فَلَوْ أَنَّهُمْ يَفْعَلُونَ﴾ ① "ہم دنیا کی قوموں کو کبھی کبھی مصیبت سے آزماتے ہیں، کبھی کبھی خوف میں مبتلا کرتے ہیں، کبھی دشمنوں کو مسلط کر کے آزماتے ہیں۔ تاکہ یہ دوبارہ تضرع اور زاری کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں ہماری پناہ و حمایت۔"

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کے جھک جاتی ہیں۔ پھر ان پر مزید انعاموں کی بارش ہوتی ہے لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ آگے اس کا ذکر کیا ﴿فَلَوْ لَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ② "ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہماری طرف سے مصیبت بھیجی جائے۔ توبہ جھک کر تضرع اور زاری اختیار کریں۔" ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ عبرت قبول نہیں کرتے۔ نصیحت کا اثر ان پر نہیں ہوتا۔ اور شیطان نے یہ زندگی ان کے سامنے اتنی آراستہ کر دی ہے کہ اگلی اور دوسری زندگی کا وہ ہم ہی نہیں گزرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو جتنے کی زندگی ہے۔ اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے۔ اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزیں ہو جاتی ہے، اس کی رنگینوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔

﴿لَقَدْ أَنشَأُوا مَادًّا يَكْرِوهُ ابْنُ﴾ ③

جب نصیحتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں اور غشی یا درہانی کی مٹی سب اکارت جاتی ہے تو ﴿فَنُفِخَ فِي سُورٍ مَّكَانَ سُنْبُكٍ﴾ ④ ہم بھی آزمائش کے لئے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہر طرف سے دروازے کھل گئے۔ عزت، آبرو، رزق کے، اشیاء اور سامانوں کے، اولاد کے بھی۔ ﴿وَخَشِيَ إِذْ أُنْزِلَ حُورًا بِمَنَآئِلٍ﴾ ⑤ جب وہ مطمئن ہو گئے کہ اب تو وسائل زندگی تابو میں ہیں۔ اب چھیننے والے نہیں ہیں۔ کون ہے جو اہم سے لے لے؟ ﴿وَخَشِيَ إِذْ أُنْزِلَ حُورًا بِمَنَآئِلٍ﴾ ⑥ گمن اور مطمئن ہو گئے، انجام کو بھلا چکے۔ پھر ﴿وَأَخَذَهُمُ بَغْتَةً﴾ ⑦

① بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ② بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ③ بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ④ بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ⑤ بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ⑥ بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴، ⑦ بارہ: سورۃ الانعام، الآية: ۴۴،

اچانک ہم پھر پکڑ کر رہے ہیں اور عقاب کا پنجہ آ کر پڑا ہے۔ ﴿لَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَ﴾ ① اب حیرت میں روجہ تے ہیں کہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ اس کا تو وہ دنگان بھی نہیں تھا۔ یہ آفت کہاں سے آگئی؟ ﴿وَلَقَدْ طَعِ ذَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ② اس وقت ظالموں کی جزا کاٹ دی جاتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں ختم کر دیے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیت، انبیاء میں جیسے انعام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لئے ہے۔ جیسے دینار ربوبیت ہے، چھیننا بھی ربوبیت ہے۔ تو عبرت و نصیحت دلانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے افعال پر بھی راضی رہنا چاہئے..... حاصل یہ لکھا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہے۔ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو۔ اس کے انتقام پر بھی راضی ہو اور کبھی سزا یا انتقام لے تو اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لئے کہ نعمت اور مصیبت بھیجے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے۔ تو کوئی بد نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت پر ہم راضی ہو جائیں اور کبھی ہوئی مصیبت پر نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضا مندی ہوئی چاہئے۔

اس لئے راضی اس بندے کو کہیں گے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات سے بھی راضی ہو۔ اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی۔ نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے رضا شروع ہوتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے، لہذا ہم بھی اس کے۔ یہ اگر ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں۔ اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔ ہمارا دلی کا جو آخری بادشاہ ظفر تھا۔ کچھ بے چارہ صوفی مزاج تھا ہی کچھ مصائب اور آفات نے اسے بنا دیا تھا اور بہترین شاعر بھی تھا۔ اس نے ایک قطعہ اپنے ان مصائب کے وقت کہا تھا۔ بڑی عبرت کی اور بڑی عجیب بات کہی، پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و عثر
پڑی جو اپنی خرابیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!!

دوسروں کو آدمی اس لئے برا کہتا ہے کہ اپنی برائی اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی اور اگر اپنی برائی سامنے آئے تو دوسرے کو معذور سمجھے گا، بلکہ اچھا سمجھے گا۔ کسی عرب کے شاعر نے کہا کہ۔

① پارہ ۷، سورۃ الانعام، الآیہ: ۳۳۔ ② پارہ ۷، سورۃ الانعام، الآیہ: ۳۵۔

لعمری ان فی ذنبی لشغلا بنفسی عن ذنوب بنی امیہ
خدا کی قسم مجھے اپنے گناہوں کا اتنا شغل ہے کہ مجھے بنی امیہ کے گناہ یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ تو ظفر کہتا ہے کہ

نہ تھن حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا !!
اور آگے کہتا کہ۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانے گا گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
اسے آدمی نہ سمجھنا، خواہ کتنا ہی دانا اور دانش مند ہو۔

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا
تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی نفرت میں بھی نہ بھولے مصیبت میں بھی نہ بھولے۔ دنیا میں نفرت بھی آزمائش کیلئے ہے۔ مصیبت بھی آزمائش کے لئے ہے۔ بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے اس لئے رضا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اللہ کے کمال ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں۔ اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں۔ مومن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افعال سے اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کر بادشاہ بنادے۔ تو کہے اے اللہ! اس راضی ہوں۔ تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا کر اس وقت جنگ کرو۔ وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کروں گا اور اگر کہے کہ جان دے دو تو بندہ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہر سب مال چھیننا چاہتے ہیں۔ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے۔ آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہو سکتی آپ غنی عن العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لئے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت ان کو نفع نقصان سے کیا تعلق؟

حدیث میں ہے کہ اگر سارے بندے مل کر اتنی قلب ہو جائیں۔ سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کا قلب ہوتا ہے تو میرے ملک میں ذرہ برابر افسانہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر سب کے قلوب شیطان کے قلوب بن جائیں تو میرے ملک میں ذرہ برابر نقصان نہیں کر سکتے۔ اللہ کو نفع کی پرواہ نہ نقصان کی نہ وہ نفع بھتاج نہ نقصان کا۔ اس لئے جو کچھ بھی ہے بندے کی مصلحت کے لئے ہے اور بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیت کہا گیا ہے۔ اس حالت میں تو ہمارے پاس آ رہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا۔ ہر حالت اور ہر تھکر پر راضی رہا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحب نسبت کب ہوتا ہے؟..... حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحب نسبت بزرگ گزرے ہیں، اور باب نسبت میں سے ہیں۔ اس نسبت کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی، اللہ اس سے راضی۔ جائین سے جب رضا ہوگی تو کہیں گے کہ آدمی صاحب نسبت بن گیا۔ چنانچہ ایک طرف سے رضا مندی ہو وہ صاحب نسبت نہیں۔ اللہ بھی راضی ہو جب صاحب نسبت بنے گا۔ جیسے نکاح اس وقت ہوتا ہے کہ عورت بھی راضی ہو۔ مرد کہہ دے کہ صاحب میں تو راضی بس ہو گیا میرا نکاح اور عورت راضی نہیں۔ نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟ جائین کی رضا شرط ہے۔ جب یہ تعلق مضبوط ہوگا۔ اس سے نیک ثمرات پیدا ہوں گے۔ آگے اولاد ہوگی تو جائین کی رضا سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔

اس طرح سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جائین سے ہوگا تب کہا جائے گا یہ بندہ صاحب نسبت ہے کہ یہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی ہے۔ تو بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو گیا۔ حتیٰ کہ اگر یہ بندہ کوئی غلطی بھی کر گزرے گا۔ تب بھی ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اللہ صحیح ہے۔ رضا مندی سے کر رہا ہے۔ بھول چوک ہو گئی، کام غلط ہو گیا، اس لئے وہ بھی ناراض نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔ ”یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عجیب و غریب ہے کہ اللہ میاں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آپ میں خواہش پیدا ہوئی اور پوری ہوئی۔ حق تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور نفس کے تقاضے کے ساتھ ہیں۔“ ①

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اللہ کی رضا میں اتنا فانی ہے کہ اس نفس سے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوگا رضا کے مطابق ہوگا لہذا وہ پسندیدہ ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا پاک ہوتا ہے کہ نفسانی خواہش بھی ابھرتی ہے۔ وہ بھی عین حق و صواب ہوتی ہے۔ اگر نبی بیوی کے پاس جانا چاہیں تو وہ خواہش نفسانی کہلاتی ہے۔ مگر نفس اتنا پاک ہے کہ اس میں بھی رضائے خداوندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے ان کو اس میں بھی وہی اجر ملتا ہے جو آپ کو نماز اور روزے میں ملتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا ہر فعل پسندیدہ ہے۔ کیونکہ نفس رضائے حق میں فانی بن چکا ہے۔ تو جو اس نے اللہ سے راضی ہیں کہ اس کی ہر تقدیر پر راضی، تو اللہ ان سے اتنا راضی ہے کہ ان کے ہر فعل پر راضی اور ان کا ہر فعل پسندیدہ۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے: ”اذا حکم الحاكم ثم اصاب الله اجران واذا حکم فاجتهد ثم اخطا الله اجر واحد“ ② حاکم خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ صواب کرے گا تو دو، جرمیں گے۔ خطا کرے گا

① الصحيح للبخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالى توجی من لشاء منهن ج: ص ۴۶، رقم: ۴۳۱۳.

② الصحيح للبخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب اجر الحاكم ج: ص ۲۴، رقم: ۳۳۵، ۱۸۰۵.

تو ایک اجر ملے گا تو خطا کرنے پر بھی اجر ملنا حالانکہ غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس غلطی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ مسئلہ حق واضح ہو، اتفاق سے پہنچ نہیں سکا۔ تو اس نے جان بوجھ کر غلطی نہیں کی۔ بلکہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی اس واسطے یہ غلطی بھی کرتا ہے تو اسے ایک اجر دیا جاتا ہے۔ تو یہ کس لئے؟ کر تو رہا ہے خطا اور اوپر سے مل رہا ہے ثواب۔ غلطی کر رہا ہے اور ثواب دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نفس رضا و حق میں فانی ہو چکا ہے۔ اس حالت میں غلطی بھی کر جائے گا۔ وہ بھی اس کا ثواب سمجھا جائے گا۔

اینا خطا از صد صواب اولیٰ تر است

یہ خطا بھی ہمارے صواب سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی فی اللہ اور فانی فی الحق ہے۔

مقام صاحب نسبت اس مقام کے بارے میں فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "ذَا الْحَقُّ فَعْدُ خَبِثَ ذَا" ① حق اور ہری کو گھوم جاتا ہے جدھر کو حضرت عمر گھومتے ہیں۔ یعنی بظاہر تو یوں فرماتے ہیں کہ جدھر کو حق گھومتا ہے عمر ادھر گھوم جاتے ہیں۔ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہ کب کہا گیا؟ جب عمر رضی اللہ عنہ رضائے حق کے اندر راسخ فانی ہو چکے تھے۔ کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کی رضا خود بخود ملتی تھی۔ جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے وحی سے مل گئی۔ جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہو گئی۔

حدیث میں ہے کہ ابتدا میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، بعض منافق بھی شامل ہوتے ہیں، مجھے پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں۔

یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہوئی کہ: ﴿فَسَلِّطُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾ ② اور ﴿وَقَرْنَ لِهِنَّ بُيُوتَهُنَّ﴾ ③ "گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو"۔ جو رائے دی۔ عین اس کے مطابق وحی آئی۔ ④

اس طرح کے متعدد واقعات گزرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رائے عرض کی اور وحی آ گئی۔ حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم حج کرنے والے جانتے ہیں کہ طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو حج میں لے لیا جائے۔ تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور حج میں مقام ابراہیم آ جائے طواف کا دو گنا

① رحمہ اللہ عمربینولحق وان کان مر حضرت مگر شان میں یہ حدیث آئی ہے بجائے حدیث ہلا کے، دیکھئے جامع الاصول

لاہن الجزری ج: ۱، ص: ۲۶۹، ② پارہ: ۲۳، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۵۳،

③ پارہ: ۲۴، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۳، ④ کنز العمال ج: ۱۳، ص: ۳۸۸، ۳۲۰

واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ چتر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "لَوْ كُنَّا نَصْلِي خَلْفَهُ....." یا رسول اللہ! کیسا اچھا ہو کہ ہم مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا، اسی دن شام کو یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ إِنَّكَ أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (مقام ابراہیم کو مصطفیٰ پر لے کر دو گنا دوا کرو)۔ ①

اس طرح کی متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو رائے دی وہی بعینہ اس طرح سے نازل ہوئی۔ گویا ان کا ضمیر وحی خداوندی کا ابتداء کرتا تھا۔ اوہری چلتا تھا جدھر وحی خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَوْ كُنَّا بَعْدِي نَبِيًّا لَكُنَّا عَنْهُمْ" ② مگر میرے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا اور کوئی نبی آتا تو عمر ضرور نبی بنائے جاتے۔ مناسبت نبوت سے تھی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں۔ وہی اس کے مطابق آتی ہے۔ مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفس رضائے خداوندی میں بالکل فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ اس حالت میں نفس میں بھی جو خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ حق اور مرضی خداوندی ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو۔ اس لئے کہ اس کا فضاء حق کا مطلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی نعمت دے جب راضی، مصیبت دے جب راضی۔

اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دنیا میں انعام..... حضرت عمران ابن الحسین رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک پھوڑا لٹکا دہ ماسور بن گیا۔ کوئی بتیس برس تک اس کا زخم رہا۔ ہر وقت اس میں سے پیپ وغیرہ بہتی اور بتیس برس تک چت لیٹے رہے، کسی ایک جانب کو کروت نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے لیٹے کھانا کھاتے اسی طرح وضو کرتا، اسی طرح نماز پڑھتا۔ اعماز دیکھتے جو شخص بتیس برس تک ایک کروت پر چوہا پائی پر پڑا رہے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن حضرت عمران ابن الحسین کے چہرے پر وہ بشارت تھی کہ کسی تندرست و توانا کے چہرے پر بھی وہ رونق نہ ہو۔ جوان کے چہرے پر تھی۔

لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف کا تو یہ عالم برسا برس گزر گئے آپ اٹھ نہیں سکتے، کروت نہیں لے

① ہزارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، آیۃ: ۱۲۵۔ ② کنز العمال ج: ۱۳، ص: ۳، رقم: ۳۶۰۸۸۔

③ السنن للترمذی، ابواب المتعالم، باب فی مناقب عمر، ج: ۱۴، ص: ۱۳۶، رقم: ۳۶۱۹۔

سکتے چپٹ لینے ہوئے ہیں۔ پھر اتنے ہشاش بشاش؟ ان دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔ فرمایا ”تکلیف آئی۔ میں نے رضا کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں راضی ہوں جس حالت میں تو رکھے میں راضی ہوں اس لئے کہ تو میری مصیبت کو جانتا ہے۔ میں اپنی مصیبت کو خود نہیں جانتا میں نے رضا کا اظہار کیا۔ وہ رضا میری طبیعت ثانیہ بن گئی۔ میرے صبر و رضا سے اب یہ کیفیت ہے کہ میں چپٹ لینے لینے ملاں کہ عظیم السلام کی زیارت کرتا ہوں۔ عالم غیب مجھ پر مشتف ہے، عالم ملکوت مجھ پر روشن ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ یہ تکلیف جائے۔ اتنا میں راضی ہوں۔ تو جو اللہ کے افعال پر اور اس کی تقدیر پر ہر طرح راضی ہو جائے تو اللہ بھی اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی کرے اللہ اس سے راضی اور یہ برا کرے گا ہی نہیں۔ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک میں کہ مسلمان تنگی کی حالت میں تھے اور شام کی طرف ردیوں سے مقابلہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ فرمایا۔ لیکن اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جہاز ہونے والا ہے۔ اس کی یہ فعلیت ہے۔ اس کے لئے چندہ جمع کرو۔ مسلمان غربت کی حالت میں تھے۔ چندہ لائیں سکتے تھے۔ امراء میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے سوانٹ مہیا کر کے ان کی رہنمائی، چادریں، ہراونٹ کے مناسب ہتھیار، اس پر توشہ چڑھا ہوا کہ مجاہدین کو کھائے گا۔ اس طرح سوانٹ مکمل لاکر پیش کئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک مکمل گیا اور چمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج آپ کے چہرے کے اندر دوڑ رہا ہے اور یہ لفظ فرمائی: ”لَمَّا عَلِيَ عُثْمَانُ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ“ ① ”آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے۔ اس کے اوپر کوئی دیال نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی برائی اور نا رضی نہیں ہے۔ جو چاہے کرے۔“ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ کبیرہ گناہ کر لیں۔ جب بھی اللہ ان سے راضی ہیں مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نفس اتنا مطمئن بن گیا ہے کہ ان کی انسانی خواہش بھی پاک ہو گئی۔ جو کر لیں گے وہ پسندیدہ الہی ہوگا۔ یہ گویا رضا کے تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی۔

بشارت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں۔ تو ان کے نفس میں اللہ سے اتنی محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشارت کے ساتھ راضی ہو۔ مجبوری کے ساتھ نہیں صبر بشارت کے ساتھ ہو۔ مجبوری کا صبر سب کو آ جاتا ہے۔ کیسی کے ہاں خدا خواستہ کوئی صبر ہو جائے۔ تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آ جاتا ہے مگر صبر وہ ہے جو بروقت ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ جیسے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور بین کر کے رو رہی تھی اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بڑی بی! صبر کر! بڑی بی کو غم میں غصہ آ گیا۔ کہا تمہارے کوئی مر جاتا تب میں جانتی تم صبر کرتے میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ گزر گیا میں کیسے صبر کروں؟ فرمایا اچھا میری مرضی مت صبر کر۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو پریشان ہو گئی اور روزی ہوئی پہنچی کہ یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ تھے اور آپ نے صبر کے لئے فرمایا۔ میں اب صبر کرتی ہوں آپ نے ارشاد فرمایا: "الطَّبْرُ عِنْدَ الصُّدْمَةِ الْأُولَى" ① صبر کا وہ وقت تھا جب صدمہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن کے بعد تو سبھی کو صبر آ جاتا ہے۔ یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے اور اختیار سے ہو اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور اس کے اندر خبر ہی خیر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں درحقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاء الٰہی پر آخروی و ابدی انعام..... غرض مومن کو یہ ایک بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ ﴿يَتَنَبَّأُ النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ ② اے نفس "مطمئنہ" تجھے اللہ کے فضل اور ہر تقدیر پر اطمینان حاصل تھا۔ "صبر آ ہوا ستر آء" ہو نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو۔ تو ہر حالت پر اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر رضائیت و بشارت حاصل ہو گئی۔ اب تو اس حالت میں ﴿أَوْ جِئْتَنِي﴾ ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی راضی، ہم بھی تجھ سے راضی تو نے اپنی عمر رضا میں گزار دی۔

ام اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے کہ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی نا راض نہیں ہوں گے۔ جب تو اس مقام پر رہے تو ﴿فَإِذَا تُخْلَبُ فِیْ جَنَادِیْ﴾ ③ اب حیرانام میرے بندگان خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے مطلقاً بندے تو کبھی ہیں۔ کفار و کفار بھی اسی کے بندے ہیں۔ ابلیس بھی اس کا بندہ ہے۔ مگر عباد خاص نہیں ہیں۔ جن کو مقرب کہا جائے، جن پر عہد کا اطلاق آئے۔ عہد وہ ہے جس میں عہدیت ہو اور عہدیت مطلقہ۔ عہدیت کے معنی غلامی کے ہیں۔ یعنی اللہ کے سامنے ایسے غلامی ہو کہ جو بھی وہ کہیں بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو۔ نا خوشی کا کوئی سوال نہ پیدا ہو اسے عہد مطلق کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے تفویض کہا ہے: ﴿أَفْوُضْ أَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ﴾ ④ "ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں"۔

تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے..... جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ بندے کے لئے راحت بشارت جتنی ہے تفویض کے اندر ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے۔ دیا ہوتا نہیں، تو چشمہ کے ٹپکنے میں یہ مصیبت ہے۔ اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں گے جو اللہ میاں کر دے کہ بس میں اس پر راضی ہوں، پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش ہی نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں

① الصحيح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبر، ج: ۵، ص: ۲۹، رقم: ۱۲۰۳۔

② ہزارہ: ۳۰، سورۃ النجم، الآیۃ: ۶، ③ ہزارہ: ۳۰، سورۃ النجم، الآیۃ: ۲۹۔

④ ہزارہ: ۲۳، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۳۔

پھر مصیبت کیا ہوئی۔ مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تقویٰ کر دی۔ سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ جو ہوگا خیر ہوگا۔ قلب کے اندر گھٹن ہی پیدا نہیں ہوگی۔ نعمت آجائے جب بھی راضی، مصیبتیں آجائے جب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا، آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہانوں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں، فرمایا ہاں الحمد للہ۔ میں اسی درجے کا ہوں۔

لوگوں نے کہا، آخر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں نہ کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو کوئی چیز میرے خلاف طبع دنیا میں ہوتی ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں، الحمد للہ یہی ہونا چاہئے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے نہ ہونا چاہئے۔

جیسے بعض لوگ اخبارات میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت سے ہمیں بڑا صدمہ پہنچا۔ اس بندہ خدا سے کوئی پوچھے کہ خدا کی طرف سے کوئی چیز بے وقت بھی ہوتی ہے۔ بے محل اور بے موقع بھی ہو سکتی ہے؟ یہ بڑی گستاخی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ آپ سے مشورہ لینا چاہیے تھا کہ کون سا وقت مناسب ہے۔ جس میں اس بندے کو موت دی جائے اور پھر موت دی جاتی۔ بڑی جرات کی بات ہے۔ موت جب آئے گی اپنے وقت پر آئے گی، مرضی النبی سے آئے گی ہم اس معاملہ میں گھسنے والے کون ہیں؟ کسی کی ولادت ہوگی اپنے وقت پر ہوگی۔ اس پر کسی کو صدمہ کرنے کا حق کیا ہے؟ ہر حالت میں بندہ کو رضا اپنائی چاہئے۔

تو اس بزرگ نے کہا کہ دونوں جہانوں کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں نہ کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ لہذا کوئی چیز دنیا میں خلاف طبع ہوتی ہی نہیں۔ یہ درحقیقت ان کی عبدیت کا مقام ہے کہ جو پیش آئے گا وہ من اللہ ہوگا اور جو من اللہ ہوگا وہ خیر ہوگا، وہی مصلحت ہوگا۔ اس پر ہم راضی ہیں ہمیں ناراض ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے نفس! ”مطمئنہ!“ جب تو نے اپنی زندگی میں نیکی سے، فلاح و رشد سے اپنے نفس میں طمانیت پیدا کر لی اور اللہ کے کسی فعل پر تجھے کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ جو دوسرے فعل ہوا، تو نے کہا ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں تو جب تو نے اطمینان کا برتاؤ کیا۔ ہم بھی تجھ پر مطمئن ہو گئے جب تو ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔

دنیا میں قانون مکافات کا عمل جاری ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں اللہ نے قانون مکافات جاری کیا ہوا

ہے۔ یعنی اول بدل کا قانون کہ جیسا تم کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہوگا۔ ”کَسِفْنَا فَبُذِنْتُ لَدُنَّكَ“ ①
 ”جیسی راہ تم اختیار کرو گے، ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی۔“ بنی اسرائیل کے بارے میں
 فرمایا گیا: ﴿إِنْ تَحُولُوا عَنْ عَذَابِكُمْ ②﴾ ”اگر تم گناہ کرنے سے ٹوٹ جاؤ گے ہم عذاب دینے سے ٹوٹ جائیں گے۔“
 ﴿إِنْ عُدْتُمْ عَنْ عَذَابِكُمْ ③﴾ ”تم بدی کی طرف لوٹو گے ہم عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے۔“ جیسا تم کرو گے ویسا
 ہم کریں گے۔ ”مَنْ أَحْبَبَ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ“ ④ ”جو ہم سے ملنا پسند کرتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا پسند
 کریں گے۔“ ”فَمَنْ كُتِبَ عَلَيْهِ لِقَاءُ اللَّهِ فَمِنْهُمْ مَنْ عَجِلَ لَهُ“ ⑤ ”جو ہم سے ملنا مکروہ جانتا ہے۔ ہم بھی اس سے مٹا
 مکروہ جانتے ہیں۔ ہم بھی اسے نہیں ٹھیں گے۔“ ﴿إِنْ تَنْصَرُوا لِلَّهِ تَنْصُرْكُمْ﴾ ⑥ ”تم اللہ کی مدد کرو گے
 اللہ تمہاری مدد کرے گا۔“ ﴿فَإِذَا كُفِرْتُمْ أَكْفَرْكُمْ﴾ ⑦ ”تم کفار بنو گے، ہم تمہاری یاد کریں گے۔“ غرض
 قانون مکافات ہے۔ جو برتاؤ بندے کا ہوگا، وہ اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹیں..... اس لئے اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ حق تعالیٰ
 کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ کے ساتھ میرا تعلق کیسا ہے۔ اس پر قیاس کر لے ویسا ہی ان کا
 تعلق ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں اللہ کی طرف سے جد ہے تو ادھر سے بھی بعد ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں
 رجحان ہے اور جھک رہے ہیں۔ ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی یہ کسوٹی ہے۔ ہر شخص پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا
 میرے ساتھ کیسا معاملہ ہے۔ وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنے سے قطع نظر کہ اللہ کے معاملات کو دیکھنا چاہے۔ مسئلہ
 کبھی حل نہیں ہوگا۔ شکایت پیدا ہو جائے گی کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہوئی کہ یہ کفار سارے رہ گئے تھے
 مصیبت کے لئے میرا ہی گھر رہ گیا تھا مجھ پر ہی مصیبت پہنچی تھی۔ حالانکہ میں مومن ہوں یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس
 لئے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ
 سے کتنا راضی ہوں، تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔

اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بعد ہو۔ غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی
 یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو اللہ سے دیکھ لے، حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول
 اللہ! ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔
 فرمایا اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔ اگر پڑوسی کو ستاتے ہو، سمجھ لو کہ اللہ میاں کو بھی

① النصیح للبخاری، کتاب التفسیر، باب وسیمت ام الکتاب، ج: ۱۳، ص: ۳۸۵۔

② ہمارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۹۔ ③ ہمارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۸۔

④ النصیح للبخاری، کتاب المرقا، باب من احب لقاء اللہ، ج: ۳۰، ص: ۶۳، اولم: ۶۰۲۶۔

⑤ ہمارہ: ۲۶، سورۃ فصحہ، الآیۃ: ۶۔ ⑥ ہمارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۲۔

تم سے بعد ہے۔ اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ دینا ہوگا۔ اگر تم بڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف و کرم کا معاملہ کرتے ہو۔ یقیناً امید رکھو کہ ادھر سے لطف و کرم کا برتاؤ ہوگا۔ تو کسوٹی بیان کر دی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے۔ اس لئے اگر آپ خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شب تک آپ کے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آ جائے، آپ مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں۔ سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی آپ کے ہر فعل سے راضی ہیں اور آپ کو اچھی راہ دے رہے ہیں۔ تم اسی راہ پر چلو گے جو ان کی پسندیدہ ہوگی اور اگر آپ ان کی راہ سے ناراض ہیں کہ وہ جو معاملہ کرتے ہیں آپ اس سے آگستہ تے ہیں۔ وہ آپ کے معاملے سے ناراض ہیں آپ کی عبادت بھی ناپسندیدہ ہوگی۔ آپ لاکھ جہد کریں جب دل میں ناراضگی ہے تو سجدے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ملازم اپنے آقا کی خدمت بہت کرتا ہے مگر آقا کے ساتھ اچھا خیال نہیں رکھتا اس کی خدمت آقا کے لئے تکلیف دہ بن جائے گی اور ایک ملازم ہے کہ دل سے محبت کرتا ہے مگر بے وقوف ہے۔ رات دن غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ آقا کہتا ہے اسے کچھ نہ کہو یہ میرا اپنا ہے۔ غلطی ہوئی تو کیا ہوا بندہ بشر ہے۔ غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔ اس کی غلطی سے بھی راضی ہیں۔ تو اصل چیز قلب کا رخ اور قلب کا معاملہ ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے بندے! قیامت کے دن اگر تو میرے پاس اسنے گناہ لے کر آئے زمین و آسمان تیرے گناہوں میں مصبب جائیں تو میں اتنی ہی بڑی رحمت و مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے قلب کے اندر ہو۔ ① ہر بندہ دیکھ لے کہ اللہ کی کتنی عظمت اور بڑائی میرے دل میں ہے۔ آیا دولت کے مقابلے میں، میں دولت کی عظمت کو جانتا ہوں یا اللہ کی عظمت کو؟ اسے حاجت روا سمجھتا ہوں یا اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہوں؟ جب کوئی معاملہ آتا ہے تو پہلے میری نگاہ اسباب کی طرف جاتی ہے یا مسبب الاسباب کی طرف۔ اسباب کو محض حکم برداری کے استنفاع کے لئے اختیار کرتا ہوں۔

اس لئے کہ نظر ہماری اسباب پر ہے۔ مگر چونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہ ہے کہ کرنے والا وہی ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ کرنے والے تو اللہ میاں ہیں۔ اسباب اختیار کئے جائیں گے۔ مگر اطمینان اسباب پر ہے مسبب الاسباب پر نہیں ہے۔ اور ایک یہ کہ مسبب الاسباب پر اطمینان ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ اسباب نہ بھی اختیار کریں تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔ مگر حکم الہی ہے اس لئے ہم اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ تا بعد ازیں کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں۔ اسی ایک کسوٹی سے پتہ چل جائے گا کہ ہم اسباب سے کتنے اور مسبب الاسباب سے کتنے راضی ہیں۔ اسی سے اللہ سے معاملہ سمجھ لیجئے کہ دیا ہی برتو و ادھر سے ہوگا۔ غرض ”عَمَّا تَدِينُ لَدَانِ“ جیسی آپ راہ اختیار کریں گے ویسی راہ ادھر سے اختیار کی جائے گی۔

① الفصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة باب تحریم الظلم، ج ۲، ص ۴۵۵، رقم: ۴۶۷۴.

مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں..... اس کو فرمایا گیا: ﴿إِنْ جِئْتِ الْإِلٰهِي رَبِّكَ﴾ ① اے نفس لوٹ کر یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا تھا۔ تو دنیا کی چیز نہیں تو آخرت کی چیز ہے۔ اب تو نے اپنی رضا و احمقانہ کا امتحان دے دیا اس لئے مقصد پورا ہو گیا۔ اس لئے اب واپس لوٹ کر ہماری طرف آ جا اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔

اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے اسے ”اِنْ جِئْتِ“ کہ ”لوٹ کے آ“ کا خطاب نہیں کیا جائے گا تو دنیا کا تھا، دنیا ہی میں رہ۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے مانگتا اسے لے جاتے ہیں تو ”سمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرتین و لعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو نکل دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ اس آسمان سے نیچے نیچے جہنم علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے۔ گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ایک دسی ٹانگ دی ہے کہ اس کو جو پکڑ لے گا وہ اس قید خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ اور وہ دسی کی ہے؟ ﴿وَاغْتَصِمُوا بِخُلَّةِ اللَّهِ﴾ ② ”اللہ کی دسی کو مضبوط تھامو“۔

حدیث میں فرمایا گیا: ”اَلْغُرَاۗءُ خُلَّةُ اللّٰهِ الْمَمْلُوۡذُ مِنَ السَّمَآءِ اِلٰی الْاَرْضِ“ ③ ”یہ قرآن اللہ کی دسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے۔ جو اس کو تمام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اپنے تک پہنچا دیں گے“۔ گویا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا۔ وہ جہنم میں موجود ہیں۔ جہنم میں ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ اب بھی جہنم میں ہیں۔ نکلنے والے نکل جائیں گے جو رہ گئے وہ رہ جائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لئے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر موت کرائے۔ کافر کو اس لئے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو اب فلاں بات کہ دیں رہے گا۔ اسی کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔ اس لئے کافر کو دنیا سے لکھ نہیں ہے۔ مومن کو نکل بھاگنا ہے اس لئے ”اِنْ جِئْتِ“ رجوع کرو۔ تو پہلے بھیجا گیا ہے۔ بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے برائے چند دن بھیجا تھا اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع..... اور کس حانت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا رجوع کی نعت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بارہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے۔ اسے ہم اپنے پاس نہیں بلنا چاہتے۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ الصحر بالآیۃ ۲۸.

② پارہ ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

③ کنز العمال ج: ۱، ص: ۱۸۳، رقم: ۹۲۴، حدیث صحیح ہے دیکھئے السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۵، ص: ۳۳، رقم: ۲۰۲۳.

تو ﴿إِذْ جَعَلْنَا آلِي رُبَيْكَ ذَا صِغَةِ مَرْجُومَةٍ﴾ ① اس لئے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے اس بعد کے عالم میں نہیں ہے۔ جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہ یہی جہنم ہے۔ مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایمان قبول کر چکا کافر ٹھکانا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ﴿فَاذْخُلْنِيْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلْنِیْ جَنَّتِیْ﴾ ② میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگان خالص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

جیسے حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا مقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ وہ فرشتے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں "مَنْ رُبُّکَ" "تیرا رب کون ہے؟" ان کے پاس بھی منکر نکیر آئے۔ انہوں نے کہا "فَسَنْ رُبُّکَ" "تیرا پروردگار کون ہے؟" تو رابعہ بصری تو لیا اور عارف باللہ تھیں۔ انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں اس لئے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ تو ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھا۔ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سواں کرنے لگا۔ تو بات وہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں آپ کا بندہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا ہوں نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ بھی فرمادیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے ہم سے راضی ہوتا، ہماری طرف آتا تو ہم سے بعد پر راضی ہے تو اسی بعد کے عالم میں رہ۔ اور مومن کہتا ہے کہ امنا باللہ ہم ایمان لے آئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں کہ جب تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ظہر نے کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے چلے آؤ۔ اس لئے "إِذْ جَعَلْنَا" کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو ﴿فَاذْخُلْنِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلْنِیْ جَنَّتِیْ﴾ ③ میرے عباد میں داخل ہو جا مجھ معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور تحقق ہے اور تو ہی اس قابل

① پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۲۸ ② پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰

③ پارہ: ۳۰، سورۃ الفجر، الآیۃ: ۳۰

ہے کہ تو اس مقام کریم و قرب میں پہنچ جائے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ایسے تو یہ آیت بہت سے علوم پر حاوی ہے۔ اس میں صبح سے شام ہو جائے، پورے نہ ہوں۔ لیکن میں نے مولے مولے تین مقصد اختیار کئے ایک واقعہ کے متعلق جو نزاع کا پیش آتا ہے۔ ایک بشارت سے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے اس بندہ مختصر کو دی جائے گی کہ ﴿إِذْ جَعَلْنَا إِلَىٰ رَبِّكَ وَاجِبَةً مَّرْجِيَةً﴾ ① اور تیسرا انعام ہے ﴿فَاذْخُلِي فِي عِبَادِنَا﴾ سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تو میرے بندگان خاص میں داخل ہو جا اور اس مقام قرب میں تجھے داخل کرنے کی نوبت آگئی جو شہر مطلوب ہے۔ جو ہمارے باپ کو دیا گیا تھا۔ پھر ایک لغزش کی وجہ سے وہ وہاں سے الگ کئے گئے ہم اور تم یہاں پیدا ہوئے وہاں پیدا ہوتے وہیں کے وارث ہو جاتے اور یہاں آگئے۔ مگر آدم علیہ السلام سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے اندر اس شہر مطلوب کی طلب موجود ہے۔ جہاں سے آپ کو نکالا گیا ہے اب وہاں تک پہنچنے کے لئے اس دنیا کی گھائیوں میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لئے میں اپنا قانون سمجھوں گا۔ جو اس قانون پر چل پڑے گا اسے واپس بلا لیں گے اور جو نہیں چلے گا وہ وہیں رہ جائے گا۔

اس واسطے میں نے یہ آیت پڑھی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا عرض کروں رات میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا عرض کروں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کرنا چاہئے میں نے کہا کہ بھئی! میں نے تو مکہ مکرمہ سے لکھا تھا کہ آکر اس مسجد میں نماز پڑھوں گا۔ تقریر کا نہیں کہا تھا۔ میرا مقصد تو صرف ملنا اور ملاقات کرنا ہے۔ وعظ و تقریر کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اعلان کر دیا۔ جب اعلان کر دیا میں نے کہا اب کوئی بات تو بتائی جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر ہمارے ایک دوست نے کہا اللہ کی رضا کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے کہ اللہ کی رضا اختیار کرنی چاہئے اس سے کچھ ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ یہ گویا انہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عمل عطا فرمائے اور ہم کو راضی و مرضی بنائے اور اپنے عباد خاص میں داخل فرمائے اور اپنے مقام قرب میں ہمیں پہنچائے اور ہم سب کو اس مقام کریم میں جمع فرمائے۔ آمین

”اَللّٰهُمَّ رِنِّمْنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَاِنَّا مَتَابِعُكَ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ. بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.“

تعارف الٰہی حق

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يُهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى كُلِّ نَفْسٍ لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَذَاعِيًا إِلَيْهِ بِآذِينِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا.

اُمَّا بَعْدُ:..... فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ.

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَأَلْقَتْهُمُ الصُّلْبَ تَلْقَاءَ دَنَاءٍ وَوَعَدُ اللّٰهِ لَئِنْ فَعَلْتُمْ سَاءَ مَعَالِفًا إِنَّهُ يَنْزِلُ بِهِ عَذَابٌ شَدِيدٌ﴾
اَوْزَلْنَا الْكَسْبَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ
سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ يُادُنُ اللّٰهُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ ①

کچھ اپنے بارے میں..... بزرگانِ محترم! اس مجمعِ خیر و برکت میں جس میں بہت سے حضرات کی نورانی شکلیں
اسٹیج سے نیچے بھی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں کہ انکے چہرے مہرے سے دین ٹپک رہا ہے۔ دین کی علامتیں
نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے باہر تک وہ دین کے دلدادہ ہیں۔ انہیں حضرات میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے
لوگ بھی ہوں، جو ہم سے کچھ حسنِ ظن نہ رکھتے ہوں، کچھ خیالات کا تقاضا رکھتے ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں
کہ اپنا تعارف خود کرا دوں۔ تاکہ مشابہہ باقی نہ رہے اور جسے ہماری بات سنی اور مانتی ہو، بصیرت کے ساتھ مانے
اور نہ مانے تو نہ مانے۔ مگر ہم اشتباہ میں نہ ڈالیں۔

اس سہانے میں یا ظلم میں، یا حضرتِ علامہ مددِ غلہ، کی زبان پر جو چیزیں بطور تعارف کہی گئی ہیں۔ وہ
حقیقت میں میرا تعارف نہیں تھا۔ انہوں نے یہ اپنا تعارف کرایا ہے اس ناکارہ کے لئے اپنی عالی ظرفی، اپنی عالی
حوصلگی، اپنی اولوالعزمی اور اپنی ذرہ نوازی و خود نوازی کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ میرا تعارف
نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرا دوں۔

معیار تعارف الٰہی حق..... لیکن تعارف سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تعارف کا کوئی معیار تو ذکر کیا جائے۔ جس کی
رو سے یہ پرکھا جائے کہ یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر پرکھ

کر ہم یہ کہیں کہ فلاں کی بات سچی ہے یا غلط؟ تو پہلی چیز تعارف اور تعارف سے بھی پہلی چیز تعارف اور کسوٹی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے جس میں حق و باطل کا معیار ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جاسکتا ہے کہ کس کا قول حق ہے کس کا قول غلط ہے۔ کون سچی بات کہہ رہا ہے اور کون بات ہی بنا رہا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کے سامنے اس آیت کا ترجمہ کر دوں۔ اس کے بعد پھر اس کی تشریح عرض کر دوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ①
 ”اے پیغمبر! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ کی طرف وحی کی، علم قطعی بھیجا اور اپنی کتاب آپ کے اوپر اتاری۔“
 تو اللہ نے جو کتاب کی صورت میں آپ کی طرف جو وحی کی ہے۔ سچی وہی ہے۔ وہ کسی کے حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ لوگ سامنے ہوں یا گرد و پیش میں ہوں ان کو اگر کچھ پرکھتا ہے تو رائے سے نہ پرکھا جائے، محض عقل سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ اس کسوٹی پر پرکھا جائے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ﴿هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ②
 یہ ہماری کتاب ہے، جو حق اور سچی ہے اور تمہارے سامنے اور تمہارے گرد و پیش کے حالات کی تصدیق اور تکذیب کا معیار ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ کتاب بھی آگئی اور پیغمبر بھی آگئے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا آنے والا نہیں وہ تقسیم دے کر پردہ فرما گئے۔ تو کیا آگے دین ختم ہو گیا؟ اس لئے فرمایا ﴿وَلَوْ أَنفَسَ الْكَتَابُ الَّذِي نَصَّافَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ③ ہم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے لوگوں کو وارث بنایا کہ جن کو وارثت میں یہ کتاب اللہ ملی اور وارثت میں یہ حق ملا اور جنہوں نے اس حق کو قبول کیا اور وہ بھی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کا وعدہ دیا کہ وہ آتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ شَيْءٍ خَلْفَ عِلْمِ وَلَدٍ، يَنْفَقُونَ عَنْهُ قَعْرُ بَيْتِ الْغَالِيَيْنِ، وَانْبِجَالِ الْمُجْتَهِلِينَ وَتَارِيْلِ الْفَاجِلِينَ﴾ ④ ہمیشہ سلف کے بعد خلف کھڑے ہوں گے، جو اس علم کو لیتے رہیں گے، جو سلف صالحین لے کر آئے تھے اور اس علم کی روشنی سے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ دروغ بانوں کی دروغ بانوں کا پردہ چاک کریں گے۔ جاہلانہ اور رکبہ تادیلات کا پردہ چاک کریں گے۔ تو قیامت تک یہ دین اصل حالت میں باقی رہے گا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ: ”إِنَّ إِلَهًا يَنْفَعُ لِهَيْذِهِ الْأُمِّيَّةَ عَلَيَّ دَأْسُ شَيْءٍ مَاتِيَّةٍ سَنِيَّةٍ مَنْ يُعْبِدُ لَهَا دِينَهَا“ ⑤ ہر قرن کے بعد جب دوسرا قرن شروع ہو گا۔ تو اللہ ایسے لوگ بھیجے گا، جو دین کی

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱۔ ③ پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۳۱۔

④ مشکوٰۃ الآثار للطحاوی، باب بیان مشکل ما روی بحمل هذا العلم، ج: ۸، ص: ۳۶۳، رقم: ۳۲۶۹، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح، المعلق للابن ابی عمیر، کتاب العلم، ج: ۱، ص: ۵۳۔ ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مفید کفری القرون الماتۃ، ج: ۱، ص: ۳۶۲، رقم: ۳۶۳۰، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۹، ص: ۲۹۱، رقم: ۳۲۹۱۔

تجدید کریں گے، اس کو نکھار دیں گے اور جتنی رک رک کر وہیں نکھیں، ان کو کھول کر الگ کر دیں گے اور دین بچراصل حالت میں آجائے گا۔ ہر قرن پر ایسے لوگ آئیں گے جن کا نام مجدد ہے۔

قرن کی قید اس لئے لگائی کہ قرن عموماً سو سال کی مدت کو کہتے ہیں اور سو سال میں ایک نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اگلی نسل شروع ہوتی ہے نئی نسل آتی ہے تو کچھ نئے نظریات بھی آتے ہیں، نئے افکار پیدا ہوتے ہیں، نئے حوادث اور واقعات سے دنیا دو چار ہوتی ہے۔ اس وقت ممکن تھا کہ نئے نظریات اور نئے افکار کی وجہ سے دین دب جائے یا ختم ہو جائے یا مشتبہ ہو جائے اس لئے اللہ نے ہر قرن پر ایک مجدد رکھا۔ تاکہ ان نئے نظریات کے اندر دین کو پھر نکھ کر دے اور انہی نظریات کے مطابق ایسے دلائل کو پیش کرے، کہ دین پھر تازہ تازہ ہو جائے اور نئے افکار کا کوئی اثر دین کے اوپر نہ پڑے تو ہر قرن پر وعدہ دیا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: ﴿لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي مُسْتَضَوِّينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَصُرُّهُمْ شَيْءٌ عَذْلُهُمْ وَلَا مَنَ عَالِفُهُمْ عَتَىٰ يَآئِلِي أَمْرِ اللَّهِ﴾ ① ”میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت باقی رہے گی، جو وہی چیز کہے گی جو میں نے کہی، وہی عمل کرے گا جو میں نے کیا ہے۔ انہیں رسوا کرنے والے رسوا نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے اور دنیا ختم ہو جائے۔“ دین اسی رنگ میں باقی رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا تو پوری امت کے لئے وعدہ دیا کہ ایک جماعت حق قائم رہے گی۔ ہر قرن پر وعدہ دیا کہ مجدد آئیں گے ہر قرن کے اندر وعدہ دیا کہ سلف کے بعد خلف آئیں گے، جو علم بیٹے رہیں گے اور سلسلہ علم کا منقطع نہیں ہوگا تو فرمایا کہ: ﴿وَنُفِثَ أَوْزَانُ الْكِتَابِ الْبَرِّ مِمَّنْ عَادِلِينَ﴾ ② نبی کے بعد اور کتاب کامل اترا آنے کے بعد ہم اسی قوم و راہ پر آکر وارث بنائیں گے، جن کو ہم منتخب کریں گے اور پسند کریں گے۔ لوگوں کی رائے پر نہیں ہوگا کہ وہ کہیں یہ مجدد ہیں، یہ معلم ہیں۔ ہم قلوب میں براہ راست ڈالیں گے کہ حق کہنے والے یہ ہیں۔

دین نقلی ہے عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ ... بہرحال اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ دین نقلی اور روایتی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ یعنی دین اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ کسی پارٹی یا مجلس کا ریزولوشن نہیں ہے۔ جنہوں نے بیعت کر دین بنالیا ہو، بلکہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔ عقلی اختراعات دین کی بنیاد نہیں ہیں۔ نقل و روایت دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کی جب بھی کوئی بات سامنے آئے گی تو پہلا مطالبہ یہ نہیں ہوگا کہ تم عقل سے اس کو کیا سمجھتے؟ تم نے اپنے فکر سے کیا جانا؟ اللہ کی وحی کے مقابلے میں ہم را فکر کیا چیز ہے؟ اور ہماری عقل نہ دیکھو کہ اس معیار پر دین کو پرکھا جائے، دین معیار ہے جس پر ہماری عقلوں کو پرکھا جائے گا کہ یہ عقل ناقص

①: الحسن لابن ماجہ، المقدمة، باب اتباع من رسول اللہ ﷺ، ج: ۱، ص: ۱۲، ہدفہ ۱۰۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح و ضعیف سنن ابن ماجہ ج: ۱، ص: ۸۰، رقم: ۷۹۔ ②: ہاد: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآية: ۳۳۔

ہے یا کامل، اس میں کھوٹ ہے یا اصلیت تو دین معیار بنے گا، عقل معیار نہیں بنے گی۔ عقل کو دین اور وحی خداوندی کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دین روایتی اور نقلی ہے۔ عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔

نقلی کے معنی یہاں وہ نہیں جو ہماری اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اردو میں نقلی اسلی کے مقابلے میں آتا ہے کہ یہ چیز اصل ہے۔ اور یہ چیز نقل ہے۔ اس میں اصلیت ہے اور اس میں منع سازی ہے نقلی کے یہ معنی نہیں ہیں۔ نقلی کے معنی روایت سے منتقل ہونے والی چیز کے ہیں۔ تو دین روایت کے ذریعے سے منتقل ہونے والی چیز ہے۔ عقل کی تجویز سے دین نہیں بنا۔

دین ایک نیکی حقیقت ہے عقل اس کی موجد نہیں ہو سکتی..... جو اس کی یہ ہے کہ دین ”الطریق الی الموصل الی اللہ.....“ کا نام ہے، وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچائے، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کی طرف جائے گا تو راستہ اتنا لمبا اتنا دشمن ہے کہ جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یہ اس راستے کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنا راستہ خود بتلایا کہ یہ میرا طریق ہے: ﴿وَأَنْ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ﴾ ① یہ میرا سیدھا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور بعد میں جو عقلی اختراعات سے نئے نئے راستے نکلیں ان کی پیروی مت کرو۔ ورنہ تشتت، پرگندگی اور پارٹی بازی میں پڑ جاؤ گے۔ اصل دین کی تلاش کرو۔ تو ”الطریق الی الموصل الی اللہ“ جو اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہو۔ اللہ ہی بتائے گا جب اس کی مرضیات معلوم ہوں گی تو خدا کی مرضی عقل سے نہیں سمجھ سکتے اور محض گریبان میں منہ ڈال کر ہم پتہ نہیں چلا سکتے کہ اللہ کس چیز سے راضی ہے اور کس چیز سے نہیں۔

دو حقیقی بھائی ہوں جنہوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیندے ہوں۔ وہ سینہ سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے قلب کی بات دوسرے کے قلب میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہی خود نہ بتائے کہ میرے ضمیر میں یہ بات چھپی ہوئی ہے تو دو انسان ایک نوع، ایک جنس اور ایک اصل کی دو شخصیں، ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلانے۔ لیکن جب تک ایک ظاہر نہ کرے، دوسرا اس کے باطن کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو اللہ رب العزت کے باطن سے جو بات چلی ہے۔ اسے محض دور بیٹھ کر ہم کیسے سمجھ لیں گے؟ جب تک وہ خود نہ ظاہر کرے تو اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ اسی کے کلام سے چل سکتا ہے ہمارے عقل سے پتہ نہیں چل سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ اس آگ پانی کے گھر وندے میں کام کرے گی محسوسات تک پہنچے گی اور محسوسات تک پہنچتی ہوئی بھی ٹھوکریں کھائے گی جو عقل محسوسات کے دائرے میں بھی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ غیب کی چیزیں کس طرح سے جان لے گی۔ وہ اس کا دائرہ ہی نہیں۔ وہ اپنے دائرہ کی بات کرے گی۔

آپ کی آنکھ ہے، وہ شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کان ہیں، وہ آوازیں سن سکتے ہیں۔ زبان ہے جو ذائقے

کچھ کہتی ہے اور یہ سب چیزیں دو تین انچ کے اندر جمع ہیں۔ لیکن آنکھ کے دائرے میں کان قدم نہیں رکھ سکتا کہ کان یوں چاہے، میں صورتیں دیکھ لوں، نہیں ہو سکتا آنکھ چاہے کہ میں آوازیں سن لوں، تو کان کی طرف آنکھ و رجوع کرنا پڑے گا۔ آنکھ صورتیں دیکھنے کے لئے ہے، آوازیں سننے کے لئے نہیں اگر آپ ذائقہ چکھیں گے تو آنکھ لاکھ کوشش کرے کہ میں کھانا دیکھتا سمجھ لوں، نہیں سمجھ سکے گی۔ تو اس چہرے میں دوا انچ کے فاصلے پر ساری قوتیں جمع ہیں۔ مگر ایک قوت دوسری قوت کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اسی دائرے میں جانا پڑے گا۔ اس سے اوپر عقل کا درجہ ہے تو اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں۔ تو عقل کی دوز صرف محسوسات تک ہے، وہ مغنیات تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ علم کی موجد و ایجاد کنندہ نہیں ہے، وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے۔ کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے۔ لیکن خود اصول و جزئیات بنالے یا واقعہ بنا دے تو عقل موجد نہیں ہے جو واقعات کی ایجاد کرے۔ پیدا شدہ واقعات میں عقل غور کر سکتی ہے، مگر واقعہ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ دین اللہ کی خبر اور حقیقت یہی ہے۔ اسے نہ عقل بنا سکتی ہے نہ اس میں اختراع کر سکتی ہے۔ اس کا تو اسے ساتھ دینا پڑے گا غلامی کرنی پڑے گی۔

عقل کو مغنیات میں وحی کا اتباع ضروری ہے۔ عقل کو اسلام نے بیکار نہیں ٹھہرایا، یہ بہت کارآمد ہے۔ اللہ نے عقل کے فضائل بیان کئے اور فرمایا: ”أَوَلَمْ نَخْلُقِ اللَّهُ الْعَقْلَ“ ① سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا: ”أَقْبَلِ“ سامنے آ، وہ سامنے آئی فرمایا: ”أَذْبِرِ“ پشت پھیر اس نے پشت پھیری۔ فرمایا: تو ہی ہے جس کے ذریعے سے میں بہت لوگوں کو عزت دوں گا اور بہت کو ذلیل کروں گا۔ تو عقل کوئی بے کار چیز نہیں لیکن اپنے ہی دائرے میں کام دے گی۔ آنکھ بے کار چیز نہیں۔ مگر صورت ہی میں کام دے گی، آوازیں نہیں سنے گی، کان بے کار نہیں ہیں۔ مگر خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ اپنے دائرے میں کام کریں گے۔ عقل سے بالاتر جب مغنیات کی چیزیں آئیں گی۔ وہاں وحی اور خدا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اللہ جو غیب کی چیزیں بتلائے وہ ہم مانیں گے۔ آپ کی عقل دنیا کی چیزوں میں اختراعات کر سکتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں دے سکتی کہ عرش عظیم کیسا ہے یہ نہیں بتا سکتی کہ کرسی کی شان کیسی ہے۔ جس کی قرآن کریم نے خبر دی۔ جنت کی نعمتیں کیا ہیں؟ جہنم کے عذاب کی کیا کیفیت ہے۔ یہ عقل کا دائرہ ہی نہیں ہے جو لوگ عقل سے اس دائرے کو بکھنا چاہتے ہیں، وہ ایسے ہیں جیسے آنکھ سے خوشبو سونگھنا چاہیں۔ کان سے صورتیں دیکھنا چاہیں۔ انکی عقل کے اوپر ماتم کیا جائے گا اس طرح ان کی عقلوں پر بھی ماتم کیا جائے گا جو غیبی چیزوں کے دائرے میں عقل کوڑا میں جہاں اس کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے نہ اعمال

① ذکر هذه الحلیات الصحابی فی الموضوعات لموا السخاوی فی الموضوعات و المقاصد الحسنہ. وابن الجوزی فی تذکرۃ الموضوعات و اصحاب أخری کتب الموضوعات و لایصح التحلیت و لایرواہ بہ الامع صراحة البیان لوضعه متعم ذکرہ الرازی فی تفسیرہ و لم یذکر قولہ حدیث موضوع (من کثرات) ہے۔ دیکھئے المقاصد الحسنہ ج: ۱ ص: ۷۵ وغیرہ۔

عقل کو غیبی امور میں اتباع کرنا پڑے گا۔ وہاں اس دائرہ میں رہ کر پھر عقل موقوف کیا جائے گی۔ طرح طرح کے نکتے پیدا کرے گی۔ لیکن مقصد کو پیدا کر دے یہ کام عقل کا نہیں۔ یہ تو مقصد معلوم کر کے اس کی تشریح کرے گی۔ اس میں سے نئے نئے علوم پیدا کرے گی۔

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علی وجہ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے۔..... بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین روایتی اور نقلی چیز ہے۔ جو منتقل ہو کر آیا ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی دین کا دعویٰ کرے گا۔ تو سب سے پہلے سند کا مطالبہ کیا جائے گا کہ یہ چیز تم تک کیسے پہنچی؟ کس راستے سے پہنچی؟ روایت کرنے والے کون ہیں؟ ان کا کردار اور کیریئر کیا ہے قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے اس کی سند کا اہتمام فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا کلام ہے۔ ہم دباؤ ڈالتے ہیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ فی طور پر اس کی سند بیان کی کہ سند کے ساتھ جب یہ ثابت ہو گا کہ یہ کلام خداوندی ہے، پھر ماننا فرض ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دباؤ سے منوالیں یہ اللہ کا کلام ہے۔ لہذا مانو، ہم یہ زور نہیں ڈالتے، ہم فی طور پر سمجھا دیں گے۔ اس قرآن کریم کے اللہ سے آنے تک سند کے دو مرتبے ہیں۔ ایک اللہ سے رسول تک اور ایک پھر رسول سے ہم تک سند کے دو دائرے ہیں، دونوں دائروں میں حق تعالیٰ نے ہماری تسلی فرمائی ہے کہ سند مفصل کے ساتھ پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ ہمارا کلام ہے پھر ماننے کا فیصلہ کرو۔ محض عقل اور خود رائی سے فیصلہ مت کرو۔

پہلی سند کہ اللہ سے کس نے کلام سنا ہے؟ اور کون ہے جو نبی تک لے کر آیا؟ اس سند کو حق تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا اور تفصیل بھی فی طور پر کی۔ یعنی راویوں کے جو اوصاف ہیں۔ جن سے ان کی روایت معتبر ہوئی ہے۔ ان کا کردار جس سے بات سچی سمجھی جائے وہ بیان کی یہ نہیں کہا کہ ہمارا کلام ہے۔ تم ماننے کے لئے مجبور ہو۔ مثلاً حضرت جبریل علیہ السلام صحیح میں واسطہ ہیں۔ جو اولوالعزم فرشتوں میں سے ہیں۔ سید الملائکہ ان کا لقب ہے۔ وہ واسطہ ہیں تو اللہ کا نام امین ہے، جبریل علیہ السلام کا لقب امین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی امین ہے۔ تو امین سے کلام چلا، امین کے واسطے آئے آیا، امین پر اترنا۔ یہ جو صحیح میں امین ہے۔ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ حق تعالیٰ نے اسے ظاہر فرمایا اور سورۃ ﴿اِذَا الشُّنُفُ نُكُوْزَتْ﴾ میں اس کی تفصیل فرمائی، قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿اِنَّهُ لَنُفُوْلٌ وَنُفُوْلٌ مُّكْرِمٌ﴾ ① جبریل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رسول کریم کا قول اور اس کا پڑھایا ہوا ہے۔ تو اوّل تو رسول کا لفظ استعمال کیا کہ جو کلام لے کر آیا، وہ ہمارا قاصد ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سفیر یا قاصد، حکومت اسے بناتی ہے جس پر پورا اعتماد اور اطمینان ہو اس میں بغاوت کی ذمہ داری نہ ہو۔ حکومت کی ساری پالیسیوں کا ولہ اوادہ اور ان کا امین ہو۔ اگر گورنمنٹ کو ذرا بھی یہ شبہ ہو جائے کہ جس کو سفیر بنا کر دوسرے ملک میں بھیجا جا رہا ہے، وہ قابل اعتماد نہیں ہے یا اس کے اندر کچھ سرکشی کی خوب ہے۔ وہ کبھی بھی

سفیر نہیں بتایا جائے گا۔ تو اللہ کی گورنمنٹ نے بھی اپنے کلام کے لئے ایسا سفیر و قاصد بنایا، جس کے اوصاف خود حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔ اس سے زیادہ امین اور کون ہوگا۔ اس سلسلے میں پہلا لفظ تو یہ فرمایا کہ یہ کلام رسول کا ہے۔ رسول کے معنی ای پابکار کے ہیں۔ قاصد خداوندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پائیزہ ہیں۔ اس کے اندر سرکشی کی بوند ہو، بغاوت کا رنگ ذرہ برابر نہ ہو۔ اس لئے اول رسول کہنا، یہ خود ان کی تصدیق اور توثیق ہے۔ جو شخصیت ہمارا قرآن نے کرائی ہے یہ بلاوثق ہے۔

پھر رسول کے آگے "کسبریم" کا لفظ بھی بولا کہ رسول کراست اور بزرگی والا ہے۔ دیکھنا جائے تو رسول کے لفظ میں ہی ساری بزرگیاں آجاتی ہیں اور جب آگے یہ بھی فرمایا کہ کریم النفس ہے تو دو وصف جمع ہو گئے کہ اللہ کا قاصد اور اپنی ذات سے کریم النفس، اس کے اندر کوئی خدشہ نہیں، بغاوت کی یونٹیں۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص کہے کہ رسول بھی ہو، قاصد بھی ہو، کریم النفس بھی ہو، لیکن دو قسم کا ضعیف آدمی ہو، پیام لے کے آیا۔ قوم نے جبر جبراً کے کہا: کیا کہا تو نے؟ اپنی بڑی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر کے کہہ دے کہ جی میں یہ نہیں کہہ رہا تھا، تو ہو سکتا ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو رسول تھے اور کریم النفس بھی تھے۔ مگر ضعیف اور دو قسم کے آدمی تھے۔ کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کلام کو بدل دیا ہو۔ اس لئے ایک جملہ آگے بڑھایا فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ﴾ ① طاقت و فرشتہ ہے۔ ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اسے دبا لے کوئی اسے دھمکی دے اور جو چاہے کہلو اسے تو کریم النفس رسول کا قول ہے جو طاقت ور ہے۔

جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قوم لو ط پر جب عذاب خداوندی نازل ہوا تو مجھے امر فرمایا گیا: میں نے ان کی ساری ہستیاں عقلی پر اوپر لے جا کر پلٹ دیں اور پوری قوم تباہ ہو گئی۔ یہ اس فرشتے کی طاقت ہے۔ ایسا آدمی دب کر کلام بدل سکتا ہے۔ جس کی یہ طاقت ہو؟ یہ عقلی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ کسی سے دب کر کلام کہہ دے۔ جیسے بعض لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ ٹیک تو تھے۔ مگر ضعیف قسم کے تھے۔ انہوں نے آ کر کہا کہ بھی! سچی بات یہ ہے تو دوسرے نے لاشیٰ اٹھائی۔ اس نے کہا نہیں نہیں میرا مطلب تو یہ تھا، یہ نہیں تھا جان بچانے کے لئے بات بدل دی۔ تو جبرئیل علیہ السلام انہیں سے نہیں چڑھا۔

اس کے بعد ممکن ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، کریم النفس بھی ہیں، طاقت ور بھی ہیں۔ مگر اللہ کا کلام بہت دور سے سنا، معلوم نہیں صحیح سنا ہے یا غلط سنا، کچھ کا کچھ سمجھے ہوں۔ کچھ کی کچھ بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تو ایسے راوی کی روایت کا کیا اعتبار، چاہے وہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو۔ مگر دس میل سے بات سن رہا ہے۔ کیا خبر پوری بات کان میں پڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿عَبْدُ ذِي الْقُوَّةِ﴾

صُحُبِیْن ﴿۱﴾ ان کا مقام عرش والے کے پاس ہے ہمیں دور نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہمارا کلام قریب سے سنتے ہیں، کہیں دور سے نہیں سنتے کہ آواز کے سننے میں فرق پڑ جائے۔ اگر کوئی راوی روایت کرے اور اسے اپنے شیخ سے حقائق نصیب نہ ہو۔ اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی یا ملاقات ہو مگر دور سے ایک آواز کی، دس احتمال ہیں کہ صحیح آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔ اس لئے راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کے قریب ہوتا کہ پوری طرح سے سن لے سکے اور روایت کر سکے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے مان لیا کہ جبرئیل رسول بھی ہیں، بہت پارسا ہیں، کریم النفس بھی ہیں، ان پر کریم برکتی ہے، طاقت ور بھی ہیں اور عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں، ہمیں دور سے نہیں سنا۔ لیکن ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کا وقار اور حیثیت عرفی کچھ نہیں ہے۔ لوگ اعتماد کیسے کریں؟

اس لئے کہ کلام میں حیثیت عرفی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی بات میں کہوں اور وہی بات آپ کو انگلستان کی ملکہ کہے اس کا اور اثر ہوگا۔ بادشاہ یا وزیر اعظم اگر بات کرے تو عالم کی سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے۔ اس کے معنی نکلتے ہیں، حکومتیں اس سے نتائج مرتب کرتی ہیں وہی کلام میں یوں، کوئی اثر نہیں کہ ہاں بھی! اچھی بات ہے ایک نیک آدمی نے کہا ہے۔ ٹھیک کہا ہوگا۔ تو وہی کلام صاحب حیثیت کہے اور وہی کلام بے حیثیت کہے۔ اثرات میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس بنا پر جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی یوں کہے کہ ان کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے۔ اس لئے آگے فرمایا، ﴿مَطَاعٌ﴾ ﴿۲﴾ وہ ”مُتَّبِعُ الْمُتَّبِعِہِ“ ہیں۔ سارے ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ آسمانوں میں ان کی سرداری مسلمہ ہے۔ تو سارے ملائکہ جن کی شان یہ ہے کہ ﴿نَبَلٌ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾ ﴿۳﴾ اللہ کے پاکیزہ بندے ہیں۔ ﴿لَا يَنْبَغُونَ بِالْفُؤَادِ وَهُمْ بِأَعْيُنٍ يَعْمَلُونَ﴾ ﴿۴﴾ وہ عمل کرنے کے لئے اللہ کے قول کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ مشاؤد دیکھتے ہیں کہ مشاؤد خداوندی کیا ہے اور اطاعت میں جھک پڑتے ہیں اور ﴿وَلَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَتَّبِعُونَ مَا يُوْحَرُونَ﴾ ﴿۵﴾ کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ جو امر کیا جاتا ہے اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ و کمی نہیں کرتے۔ تو سارے ملائکہ کمالِ امانت و کمالِ دیانت کے پیکر ہیں۔ ان ملائکہ کے سردار جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ تو اتنے پاکباز بندے کسی کی سرداری کو کیسے مان سکتے تھے جب تک کہ اس کی حیثیت اعلیٰ نہ ہو۔ آپ ذرا سا ایک امیر جائیں تو اس کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔ امیر حکومت اور بادشاہ الگ چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے سلسلے میں دیکھیں کہ کسی کو آپ امام بنائیں گے تو خیال کریں گے کہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہئے کہ مقتدی اس کی اقتدا

﴿۱﴾ بارہ: ۳۰، سورۃ التکوویں، آیۃ: ۲۰، ﴿۲﴾ بارہ: ۳۰، سورۃ التکوویں، آیۃ: ۲۱،

﴿۳﴾ بارہ: ۱، سورۃ الانبیاء، آیۃ: ۲۴، ﴿۴﴾ بارہ: ۱، سورۃ الانبیاء، آیۃ: ۲۵،

﴿۵﴾ بارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، آیۃ: ۲،

کرتے ہوئے کراہت نہ کریں۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: "يَوْمَ الْقَوْمِ أَقْرَأَهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ" "انہما سے جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو" "فَبِأَن تَكُونُوا فِي الْمَقَرَّةِ سَوَاءً" اگر قرآن دانی اور قرأت میں سب برابر ہیں۔ تو "فَاعْلَمُ لَهُمُ بِالْهَيْبَةِ" ① جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے امام بناؤ اور اگر قرآن اور سنت میں سب برابر ہیں، پھر اسے بناؤ جو سائنس سنوۃ سے پورا واقف اور کامل العظم ہو۔ حتیٰ کہ لکھتے ہیں اگر اس میں بھی سب برابر ہوں، عظم اور اذنیق میں بھی سب یکساں پھر اسے بناؤ جو زیادہ خوبصورت اور حسین و جمیل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اقتدا کرنے والوں میں کوئی گریز اور اعراض پیدا نہ ہو۔ تو جس کو آپ نر زکا امام بنائیں گے، اس میں بھی خصوصیات کا خیال کریں گے۔ اگر آپ کسی کو ملک اور قوم کا امام بنانے لگیں۔ تو اس میں کیا کسی خصوصیت کی رہیت نہیں کی جائے گی؟ سب سے زیادہ رعایت کی جائے گی۔ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سرور بنایا اور ملائکہ وہ ہیں کہ محنت، عصمت اور پاکدامنی میں اونچی مقام رکھتے ہیں۔ اگر جبرئیل علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی۔ ملائکہ ان کی اقتدا نہ کر سکتے یہ اس کی دلیل ہے کہ جبرئیل صاحب حیثیت ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا، مطاب وہ واجب الاطاعت بھی ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابراہیم نے اپنا نائب یا سفیر بنا دیا۔ ایسا نہیں، بلکہ تمام آسمانوں میں واجب الاطاعت ہیں سید ملائکہ ہیں۔ تو اب گویا جبرئیل امین، رسول، کریم، عاقل، طاقت ور، عرش کے پاس مقیم اور واجب الاطاعت بھی ہیں۔ لیکن اب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں سن لیں۔ مگر بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ضعف امانت میں کوئی خرابی ہوتی ہے ان تمام اوصاف کے باوجود یہ کسی ہے کہ رازداری کے اندر کچھ زیادہ کامل نہیں۔ بعض لوگ نیک اور صابر ہوتے ہیں۔ مگر پیٹ ان کا ذرا پکا ہوتا ہے۔ ان سے کوئی رازداری کی بات کہو، وہ چند دن میں دنیا جان لیتی ہے اور راز افشاں ہو جاتا ہے۔ سچی اور بزرگی میں کلام نہیں۔ مگر پیٹ کا پکا ہونا اور چیز ہے۔ جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا صاحبہ البرخمن صاحبہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھ سے پہلے بہت تھے۔ وفات کے دن چند باتیں بطور وصیت مجھ سے فرمائیں۔ ایک بزرگ کا نام لے کر فرمایا، جو ہمارے ستاروں میں ہیں۔ نہایت، پارسا، متقی اور صابر فرمایا ان کو راز کی بات کبھی مت کہنا۔ اگر راز افشاں کرنا ہو تب تو کہنا اور اگر چھپانا ہو تو ہرگز مت کہنا تو ساری خوبیاں تھیں۔ مگر پیٹ کے ہلکے تھے۔ جس چیز کا افشاں کرنا ہو۔ بس ان سے کہہ دو۔ اگلے دن وہ سارے بازار میں مشہور۔ وہ ایک ایک کے کان میں ڈال دیتے تھے۔ غرض سارے اوصاف کے باوجود پیٹ کا پکا ہونا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا: ﴿فَمَنْ أَمِنَ﴾ کہ وہ امانت میں بھی کامی ہیں، گھٹیا درجے کے نہیں۔ تو رموز، کریم، واجب الاطاعت، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں اور ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہیں حتیٰ کہ بن کا لقب ہی جبرئیل امین ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جب راوی میں یہ اوصاف ہوں کہ رسالت و بزرگی الگ صراح و تقویٰ الگ اور قرب خداوندی الگ تو کیا وجہ ہے کہ ان کی روایت کو نہ مانا جائے اور ٹھکرایا جائے۔ اگر پھر بھی کوئی ٹھکرانے۔ اس کے اوپر عقل خود ملامت کرتی ہے کہ یہ عقلی اصول کے خلاف ہے۔ روایت کے بارے میں راوی کے کیریکٹر اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ جب کردار صحیح ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے۔

تو اللہ رب العزت کلام کے نازل کرنے والے اور اللہ کی ذات بے عیب ذات ہے وہاں ادنیٰ نقص و کمی کی گنجائش نہیں۔ مصدر خبر و برکت ہے۔ ”الْخَيْرُ كُلُّهُ مِنْكَ وَالْشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ“ ① حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! خیر ساری تیری ہے اور تیری ہی طرف لوٹ جانے والی ہے اور شر و برائی تیرے پاس نہیں پہنچ سکتی۔ حق تعالیٰ شائد جو کلام فرمادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں کسی قسم کے تامل کی گنجائش ہوتی تو راوی کی وجہ سے ہوتی کہ راوی میں خدا انھو استے کھوت ہے تو راوی کے فنی طور پر اوصاف بیان کئے کہ محض ہماری خدائی کی وجہ دہ کرمت مانو جس کے ذریعے سے روایت کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے اوصاف کو فنی طور پر پرکھو۔ کیا وجہ ہے کہ تم اس کی روایت نہ مانو جس کے یہ کامل اوصاف ہیں۔ تو اللہ بھی امین اور واسطہ بھی امین۔

اب آگے پیغمبر ہیں پیغمبر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو معصوم ہو۔ جو ہر برائی سے بری اور بالا تر ہو۔ جو ہر وقت حق تعالیٰ شائد کے اندر فانی ہو۔ ہر وقت رضائے خداوندی کے اندر مستغرق ہو کہ ذرہ برابر شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ اللہ کی بارگاہی کو سلے سکتے ہیں۔ جن کی شان فرمائی گئی ہے۔ ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ عَلَيَّ خَلْقِي أَخْيَانِي“ ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب مبارک میں یاد و زبان سے ذکر الہی، قلب مبارک سے الہی، روح پر فتوح سے الہی، جسمانی حرکات سے الہی کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت حضوری اور جلال و جمال کا مشاہدہ ہے تو جو دربار خداوندی میں ہر وقت حاضر ہو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ غلط گوئی کرے گا؟ اور غلط گوئی بھی اللہ کے اوپر؟ عقل اس سے گریز کرتی ہے اور نہیں مانتی تو نازل کرنے والا اللہ کلام کو لے کر آنے والے جبرئیل امین اور جن پر نازل ہوا، وہ پیغمبر اور نہ صرف پیغمبر بلکہ خاتم پیغمبر اس، خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے چھٹے کمالات ہیں۔ وہ سب اس ذات پر لا کر مکمل کر دیئے گئے۔ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں کہ کسی اور نبی کو لا کر اس درجہ کو پورا کر دیا جائے۔ سارے کمالات، علمی، اخلاقی اور عملی ان سب کا ختمی ایک ذات کو بنا دیا گیا۔

خاتم الدیانت والا مانت کی روایت کی تکلف یہ ممکن نہیں۔۔۔۔۔ اس لئے آپ کا نام خاتم ہے کہ خاتم المرسل اور خاتم الانبیاء ہیں۔ تو خاتم کے معنی یہ نہیں کہ نبوت کو ختم کر دیا اور نبوت قطع ہو گئی۔ خاتم کے معنی یہ ہیں کہ

① الصحیح لمسلم، کتاب غلۃ المسافرین و فصرھا، باب الدعاء فی صلاۃ اللیل ج: ۳، ص: ۱۲۹، رقم: ۱۲۹۰۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ فی کل حال، ج: ۲، ص: ۲۹۷، رقم: ۵۵۸۔

نبوت کی ایسی تکمیل ہوگئی کہ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے جو آپ کی ذات پر لا کر پورا نہ کر دیا گیا ہو تو خاتم کے معنی منھائے کمالات کے ہیں جس پر آ کر کمالات منتہی ہو جائیں۔ اس لئے خاتم نبوت کے معنی قاطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت قطع کر دی بلکہ خاتم کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ ایک ذات کے اوپر تمام مراتب نبوت کے ختم کر دیئے گئے۔ اب اس کا نور قیامت تک کافی ہے کوئی درجہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نئی کو لا کر اس درجے کو پورا کر دیا جائے۔ ایک ہی آفتاب کا نور ہے۔ جو آخر تک جائے گا۔

جب رات میں آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایک ستارہ نکلا، دوسرا، تیسرا، اربوں کھربوں ستارے نکلے۔ سارے ستارے مل کر کتنا ہی نور پھیلاؤں۔ وہ دن نہیں بناتا رات ہی رہتی ہے لیکن جب آفتاب کی آمد شروع ہوئی۔ ابھی نکلا نہیں صبح صادق ہوتی ہے کہ ستارے ایک ایک کر کے غائب ہوتا شروع ہو گئے اور جب آفتاب نکل آیا تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں پڑتا۔ اب آفتاب اگر یوں کہے کہ انا خاتم الانوار میں سارے انوار کا ختم کرنے والا ہوں۔ تو کیا یہ مطلب ہوگا کہ آفتاب نے نور ختم کر کے اندھیرا پھیلا دیا؟ خاتم کا مطلب یہ ہوگا کہ سارے ستاروں کے جتنے انوار تھے وہ تہا میری ذات کے اندر جمع ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میرا نور باقی ہے میں ہی تنہا کافی ہوں۔ چاند مشتری اور زہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سارے انوار کے پھیلاؤ کے لئے کافی ہوں۔ تو خاتم کے معنی تمس کے ہیں نہ کہ قاطع کے۔ خاتم الانوار کے معنی قاطع الانوار کے نہیں کہ انوار قطع کر کے اندھیرا پھیلا دیا بلکہ تکمیل انوار کے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے شروع بھی ہوتا ہے۔ وہی فاتح بھی ہوتا ہے، وہی خاتم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ آفتاب خاتم ہے۔ یعنی سارے انوار اس پر ختم ہو گئے۔ تو فاتح انوار بھی وہی ہے کہ اسی کے نور سے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ سارے فلاسفر لکھتے ہیں کہ چاند اور دوسرے ستاروں میں کوئی ذاتی روشنی نہیں ہے آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، وہ چمک اٹھتے ہیں۔ ذات میں اگر روشنی ہے تو آفتاب کے ہے آفتاب اگر خاتم الانوار ہے تو فاتح الانوار بھی ہے۔ اس نے نور کی ابتدا کی ہے اسی پر آ کر انتہا ہوگئی۔

آپ یوں کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خاتم الالباء ہیں۔ یعنی آپ بھی باپ ہیں۔ آپ کے باپ بھی باپ تھے۔ ان کے باپ بھی باپ تھے ایک لمبا سلسلہ ہے تو سب کا باپ ہونا آدم علیہ السلام کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ آگے کوئی باپ نہیں لکھتا جو خاتم الالباء ہیں وہی فاتح الالباء بھی ہیں۔ وہیں سے باپ ہونے کی رسم چلی ہے؟ اگر وہ نہ ہوتے۔ اگلے بھی باپ پیدا نہ ہوتے۔ اس لئے جو کسی وصف کا خاتم ہے وہی اس وصف کا فاتح بھی ہوگا۔

آپ یوں کہیں کہ حق تعالیٰ شانہ خاتم الوجود ہیں۔ آپ کا جو دوسرا وجود زمین و آسمان کا جو دوسرا وجود اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے کوئی نہیں ہے کہ جو دوسرا سلسلہ چلے، وجود کے سارے مراتب اللہ پر منتہی ہو گئے تو فاتح الوجود بھی وہی ہیں۔ وہیں سے وجود چلا جس سے ہم اور آپ موجود ہوئے اگر وہ وجود نہ دیتے۔ ہم

آپ کہاں سے موجود کہلاتے؟

توحی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبوت کہا گیا یعنی وصف نبوت کے سارے کمالات آپ پر ختم کر دیئے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جیسے آپ خاتم ہیں فاتح بھی آپ ہیں۔ نبوت کی ابتداء بھی آپ سے ہی ہوئی ہے جس کو آپ فرماتے ہیں کہ "اَنَا وَآلُھِمْ خَلَفَا وَآخِرُھُمْ بَعَثَا" ① میں سب سے پہلا ہوں بھاء تخلیق کے اور سب سے آخری ہوں بھاء بحث کے کہ میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ خاتم النبوت اور آپ ہی فاتح النبوت بھی ہیں۔

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نبوت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔ اس لئے نہ جدید نبی آ سکتا ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ کوئی وجہ ہی باقی نہیں کہ نبی کے ذریعے اس کی تکمیل کرائی جائے۔ جب آپ کی ذات بابر کات کافی ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ نبوت کے اوصاف میں امانت، دیانت، راست بازی، سچائی، محنت و محنت اور پاکدامنی علیٰ ہذا لکھل ہوئی چاہئیں۔ تو جب آپ خاتم النبوت ہیں، تو پھر خاتم الہیاء بھی ہیں کہ حیاء کے مراتب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم الشجاعت بھی ہیں کہ بہادری کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم السنۃ و ت بھی ہیں کہ سخاوت کے سارے مراتب آپ کے اوپر ختم ہیں۔ گویا آپ تمام کمالات پاکیزہ کا ختم ہیں۔ اس واسطے جب آپ کو خاتم النبوت کہا گیا تو خاتم الامانات بھی کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر امین بھی کوئی نہیں۔

میں جب کہ آپ کے دشمن کفار مد بھی آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ تو امین کی طرف سے وحی آئے، امین لے کر آئے، امین کے اوپر اتری۔ جب ایک خبر تین امینوں کے بیچ میں ہے تو اس کے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا ایسی ایسی چیزوں کو مان رہی ہے کہ سند کا بھی پتہ نہیں کہ اللہ سے کب چلی؟ کون لے کر آیا؟ کس نے لکھا؟ کہاں پہنچایا؟ تو جس کی سند اللہ سے لے کر نبی تک موصول ہے۔ اس کو بدرجہ اولیٰ ماننا چاہئے۔ پھر اس کے بعد آگے جو سند چلی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے ایک دو نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سینے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک حرف اس کا محفوظ ایک ایک اعراب اس کا گنا ہوا، ایک ایک تشدید، جزم، زبر، نذر اور پیش اس کا گنا ہوا۔ اسی طرح کو ع، سورتمیں سب گنی ہوئی ہیں۔

احتمیازی حفاظت..... اور حفاظت اللہ نے کہاں کرائی؟ محض کاغذ سے نہیں کرائی۔ کاغذ کو سمندر میں ڈال دو، نوشتہ بھی گل جائے گا۔ کاغذ بھی گل جائے گا۔ کاغذ کو زمین میں دفن کر دو، زمین کھا جائے گی، کاغذ اور حروف بھی گم ہو جائیں گے۔ محض کاغذ ہو، اس کو دیکھ بھی کھا سکتی ہے حروف ختم ہو جائیں گے۔ یہ سب آفات کاغذ اور تختی پر

① علامہ ابن کثیر نے فرماتے ہیں: رواہ البزار و رجالہ موثقون الا ان الرابع بن انس قال عن ابی اعدلیۃ او غیرہ فتابعہ معہول، دیکھئے مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۷۱-۷۲۔

ممکن تھیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے حفاظت نہیں کرائی بلکہ فرمایا: ﴿بَلِّغُوا مَّا نَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ وَلَوْ كُنْتُمْ اَوْسَادًا مُّذْنَبًا﴾ ① یہ آیات جنات وہ ہیں جو ہم نے اہل علم کے سینے میں محفوظ کی ہیں۔ تو کاغذ کو دیمک کھا سکتی ہے مگر مومن کے دل کو دیمک نہیں کھا سکتی۔ وہاں آگ بجھ سکتی ہے، یہاں آگ نہیں بجھ سکتی۔ اس کو پانی گلا سکتا ہے۔ قنب پر پانی اڑ نہیں کر سکتا۔ اس لئے قلب کے اندر محفوظ کیا گیا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَخَفِیْطُوْنَ﴾ ② ”ہم نے ہی یہ ذکر مبارک اتارا۔ ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں“۔ بچھل کتابوں کے بارے میں اللہ نے ذمہ داری نہیں لی تھی بلکہ اقوام کے پوپذ مہواری ڈالی تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِیْهَا هُدًى وَنُورٌ وَنُحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَاذُوْا الرِّسَالَتِیْنَ وَالاَخْبَارُ بِمَا اسْتُخْفِیْطُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَیْهِ شَهِدًا﴾ ③ تورات ہم نے اتاری۔ اخبار اور زبان پیدا کئے۔ جن کو تورات سکھائی گئی: ﴿بِمَا اسْتُخْفِیْطُوْا﴾ اخبار اور زبان کو حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ تمہیں اس کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تم اس کی حفاظت کرو۔ تو وہ نہیں کر سکے، اصنیت باقی نہ رہی۔ قرآن پاک کے بارے میں یہ نہیں کہا اس لئے کہ یہ آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آنے والی تھی۔ آخری دین تھا اس کے بعد کوئی دین آنے والا نہیں تھا۔ آخری پیغمبر تھے۔ کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔ اگر اس کی حفاظت ہمارے اور آپ کے سپرد ہوتی تو وہی حشر ہوتا، جو بچھلی انہوں نے اپنی کتب سماویہ کا کیا، قرآن میں روو بدل بھی ہوتا، محفوظ بھی نہ رہتا۔ آخری کتاب کی حفاظت اللہ نے اپنی ذمہ لی: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَخَفِیْطُوْنَ﴾ ④ ہم نے اسے اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس حفاظت کو اللہ نے واقعی کس عجیب طریق سے پورا کیا۔ یعنی عموماً حفظ کرنے والے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اکثر حفظ نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو کچھ رہتا ہے۔ بچے ایسا محفوظ کرتے ہیں، جو پورا پکا یاد ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر بڑے حفظ کیا کرتے، تو کہا جاسکتا تھا کہ بھائی یہ قرآن کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اس ذمہ داری کو جانتے ہیں۔ سمجھ دار، دانا اور عالم ہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو حفاظت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتی، لوگوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بڑے علماء اور بوڑھے مشائخ مکتبوں میں بیٹھ کر یاد کر رہے ہیں۔ لیکن مکتبوں میں ایک بوڑھا نہیں ملے گا۔ پانچ پانچ چھ برس کے بچے ہیں اور دس سال کی عمر میں قرآن کریم محفوظ۔ انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ قرآن ہے کیا؟ انہیں یہ خبر نہیں کہ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے جو حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ یہ حفاظت خداوندی کہلائے گی۔ بچے کچھ سوچ کچھ حفاظت نہیں کر رہے۔ اگر بوڑھے

① پارہ ۲، سورۃ العنکبوت، الآیہ: ۲۹۔ ② پارہ ۱۳، سورۃ الحج، الآیہ: ۹۔

③ پارہ ۶، سورۃ المائدہ، الآیہ: ۳۳۔ ④ پارہ ۴، سورۃ الحجر، الآیہ: ۹۔

کرتے تو حفاظت ان کی طرف منسوب ہوتی۔ بچوں کے ذریعے سے حفاظت کرائی گئی۔ اس واسطے اللہ کی حفاظت کبھی جائے گی۔ اور ہر قرن میں لاکھوں کی تعداد میں حافظ موجود رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص عین ذہا اللہ سارے قرآن کریم خرید کر دریا برد کر دے، قرآن مٹ نہیں سکتا ایک دن میں پھر لکھا جائے گا۔ وہ سینوں میں لکھا ہوا ہے۔ لکھے ہوئے سے ہم اپنی یادداشت کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی قصاب لگ گیا، کوئی غلطی ہوئی حافظ نے لکھا ہوا دیکھ لیا۔ مگر مدار حفاظت لکھا ہوا نہیں ہے۔ مدار حفاظت اہل علم کے سینے ہیں۔

پھر روایت تو اتاری ہے اور تو اتار بھی طبقہ کا ہے۔ یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین تین آدمی بھی روایت کرتے چلے آئیں۔ وہ خبر متواتر کہلاتی ہے۔ یہاں تین تین سواور تین ہزار نہیں بلکہ ہر دور میں لاکھوں روایت کرتے آ رہے ہیں۔ تو لاکھوں کی تعداد میں جب حافظ موجود ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ وہ کلام ختم ہو سکے۔ یا اس کے اندر کوئی رد و بدل ہو سکے۔ بہر حال قرآن کریم کی اس شان سے حفاظت کرائی گئی کہ نازل کرنے والے نے خود حفاظت کی۔ مراد خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعین نہیں کی جاسکتی۔ اب ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم دستور اساسی ہے۔ اس میں اصول بیان کر دیے گئے۔ ساری جزئیات اس میں نہیں بیان کی گئی۔ اصول کلیہ ہیں ان سے جزئیات نکالتے رہو۔ ان کی شرح کرتے رہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث پاک سے آجوں کی شرح کی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مراد بانی یہ ہے تو حدیث درحقیقت یقین ہے۔ اللہ کی مراد کو بیان کرتی ہے۔ محض اپنی رائے سے ہم سمجھ لیں کہ یہ مراد ہوگی۔ یہ ممکن نہیں ہے جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ میری مراد یہ ہے۔

وہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے لغت عرب سے الفاظ لئے ہیں۔ ایک لفظ کے لغت میں اور معنی ہیں۔ قرآن نے اس میں دوسرے معنی ڈالے۔ وہ مراد ہوں گے لغوی معنی مراد نہیں ہوں گے مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے دعا کرنے کے معنی ہیں تو آپ گھر بیٹھ کر دعا مانگ لیا کریں بس نماز ہوگئی۔ شریعت نے صلوٰۃ کا لفظ لغت سے لیا اور معنی اس میں اپنے ڈالے اس طرح نیت کر دو، اس طرح ہاتھ باندھو، اس طرح رکوع و سجود کرو۔ یہ صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃ لغوی محض دعا مانگنا ہے اور صلوٰۃ شرعی وہ خاص افعال ہیں جو اللہ کے رسول نے بتلائے اگر رسول خود نہ بتلائیں کہ صلوٰۃ سے اللہ کی یہ مراد ہے، وہ مراد نہیں ہے جو تم نے لغت میں پڑھی تو صلوٰۃ کے معنی ہم کیسے سمجھیں گے؟ بس لغت میں جو لکھا ہے، وہ سمجھ لیں گے۔

یا مثلاً حج کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ بس گھر بیٹھ کے آپ نے قصد کر لیا اور حاجی ہو گئے۔ یہ ہزاروں روپے خرچ کرنا اور ہوائی جہازوں سے مکہ پہنچنا اور عرفات میں جانا، یہ سب ضائع اور دروازہ کار ہو جائے گا۔ شریعت نے جب اس لفظ کو لیا تو اس کے معنی مرادی بیان کئے کہ حج سے مراد ہماری یہ ہے کہ یوں احرام باندھو، طواف کرو، عرفات جاؤ، منیٰ اور مزدلفہ جاؤ، ذبیحہ کر دو، اس سارے مجموعہ کو کہا کہ اللہ کی حج کے لفظ سے مراد یہ ہے اگر کوئی شخص محض لغت کے بل بوتے پر قرآن کا حج کرنے لگے اور حدیث کو ترک کر دے۔ جو اس کی شرح اور بیان

ہے تو مراد ربانی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس کی نفسانی مراد ہوگی اور دنیا کو دھوکہ دے گا کہ اللہ نے یہ کہا حالانکہ لفظ اللہ کے لے رہا ہے اور معنی اپنے نفسانی بیان کر رہا ہے۔ یہ تلبیس اور دھوکہ دی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپ کبھی یہ نہیں فرماتے کہ اس آیت کے ایک معنی یہ بن سکتے ہیں، ایک معنی یہ بن سکتے ہیں اور زمانے کے مناسب حال یہ معنی ہیں۔ لہذا اللہ کی یہ مراد ہے۔ جس طرح اللہ نے لفظ نازل کے اللہ ہی نے اس کی مراد اور اس کا علم آپ کے قلب مبارک پر اتارا جس کو آپ نے کھولا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ رثا شروع کر دیتے تھے تاکہ الفاظ خداوندی میرے سینے میں محفوظ ہو جائیں، کہیں بھول نہ جاؤں۔ حق تعالیٰ نے روکا فرمایا ﴿لَا تَحْزَنْكَ بِهِ﴾ لِسَانَكَ لِتُحْضِلَ بِهِ ﴿۱﴾ ”اے نبی! اپنی زبان کو حرکت مت دو۔ تم اسی لئے توجلدی کرتے ہو کہ بھول نہ جاؤں“ فرمایا ﴿إِن عَلَيْنَا جُمُوعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ﴿۲﴾ ”یہ ہمارا ذمہ ہے کہ تمہارے سینے میں محفوظ کر دیں گے تمہاری زبان سے پڑھاویں گے تم اس کی فکر مت کرو“۔

﴿فَإِذَا قُرْآنَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ ﴿۳﴾ جب ہم قرات کرنے لگیں، تمہارا کام یہ ہے کہ تم سنتے رہو۔ جمع و محفوظ کرو دینا اور زبان سے پڑھا دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ جیسے لفظوں کا نازل کرنے والا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح معانی کا بھی ذمہ دار ہے۔ نبی کے قلب کے اوپر معانی بھی خود ہی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلا جملہ یہ ہے۔ ﴿إِن عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ﴿۴﴾ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا اور اس کو بیان کر دینا۔ قرات پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے ہے اور بیان کہتے ہیں کھول دینے کو۔ اس کا تعلق سینے اور قلب سے ہے۔ تو لفظ زبان سے پڑھے جائیں گے اور معنی سینے سے سمجھے جائیں گے۔ حق تعالیٰ نے الفاظ کی حفاظت میں جو لفظ استعمال کیا وہ ﴿إِن عَلَيْنَا جُمُوعَهُ﴾ کہ ہم پر لازم ہے ہم حفاظت کریں گے۔ وہی لفظ معانی کے لئے بھی استعمال فرمایا کہ ﴿فَإِن عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ﴿۵﴾ ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کرنا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ﴿وَإِنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَرْفَعُونَ﴾ ﴿۶﴾ ”اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا تاکہ تم کھول کھول کر مخلوق کو سمجھا دو کہ اس لفظ سے اللہ کی یہ مراد ہے، اس لفظ سے یہ مراد ہے“۔ جب مراد وحی سے متعین ہوگئی۔ اب اس میں غور و تدبر کرو۔ تو وہ علوم و معارف کھلیں گے جو اللہ کی مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراد کو عقل اور فکر سے متعین نہیں کریں گے مراد علم الہی اور کلام پیغمبر سے متعین کریں گے پھر اس میں عقل سے غور و فکر کریں گے۔ اس میں نئے نئے علوم پیدا ہوں گے۔ وہ

﴿۱﴾ ہزارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ﴿۲﴾ ہزارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔

﴿۳﴾ ہزارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔ ﴿۴﴾ ہزارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

﴿۵﴾ ہزارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ﴿۶﴾ ہزارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

قرآنی علوم ہوں گے اور اگر مراد ہی عقل سے متعین کرو، وہ نفسانی مراد ہوگی، خدائی مراد نہ ہوگی، لغت کی مراد ہوگی شریعت کی مراد نہیں ہوگی۔ حاصل یہ کہ سبب نبوی مراد ربانی کو متعین کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے میں بھیج کر ان سے جا کر مناظرہ کروا تو یہ نصیحت فرمائی کہ خوارج کے مقابلے میں قرآن سے کوئی دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے پیش کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے امیر المؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعادی ہے کہ: ”اَللّٰهُمَّ عَلَيْنَا الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“ ﴿۱﴾ اے اللہ ابن عباس کو کتاب کا علم اور حکمت دے۔“

تو میرا خاص مضمون کتاب اللہ کے علوم ہیں اور انہی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں ان سے دلیل نہ پکڑوں۔ سنت سے دلیل پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرما، یا کہ ”اَللّٰهُمَّ عَلَيْنَا دُورُ وُجُوہِ“ ﴿۲﴾ قرآن کے جملے بلیغ ہیں اور کئی کئی معنی پر داخل ہوتے ہیں۔ تم اگر خوارج کے مقابلے میں ایک آیت سے ایک معنی بیان کرو گے۔ وہ اسی آیت سے دوسرے معنی بیان کریں گے اور تم پر حجت قائم کریں گے۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں، وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق و باطل واضح نہیں ہوگا۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے مراد متعین کرو گے۔ اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ مراد متعین ہو جائے گی تو سنت درحقیقت مراد ربانی کو متعین کرتی ہے کہ اللہ کے یہ معنی مراد ہیں۔

اور سنت میں بھی اگر عوام ہوں تو پھر اس کی مراد مجتہد فقہ سے متعین کرنا ہے جو ائمہ مجتہدین ہیں وہ آیتوں میں غور و فکر اور تہذیب کرتے ہیں۔ رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا قرآن کی آیتوں میں تفکر و تدبر کرنا ہے اور قرآن میں سے وہ ایسے مسائل نکال لیتے ہیں کہ ہمارا فہم وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ علم کے درجات ہیں۔ ﴿وَاللّٰدِیْنِ اَوْسُوۡا۟ الْعِلْمَ ذَرٰجَتٍ﴾ ﴿۳﴾ سارے عالم ایک ہی درجے کے نہیں ہوتے بعضے ادنیٰ، بعضے اوسط، بعضے اعلیٰ اور بعضے افضل ہیں۔ جب انبیاء میں بھی درجات قائم ہیں۔ ﴿وَلِلّٰکِ الرُّسُلُ فَضَلْنَا بَعْضُہُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ﴿۴﴾ بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ تو علماء تو بعد کی چیز ہیں ان میں بھی تفاضل موجود ہے، بعض ادنیٰ و اوسط درجے کے اور بعض اعلیٰ مرتبے کے۔ تو اعلیٰ مرتبے کے علماء قرآن کریم سے جو اس کے حقائق سمجھیں گے ادنیٰ و اوسط مرتبے کے نہیں سمجھیں گے اور ان سب سے اوپر جن کو اللہ نے مکہ اجتہاد دیا ہے وہ جو سمجھیں گے، وہ عوام علماء بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب ایک فقہ کا مسئلہ سامنے آ جائے گا کہ واقعی یہ آیت سے نکل رہا ہے تو ہماری بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اس لئے وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتا۔ تو قرآن کریم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کنواں ہو، اس سے

① التصحیح للبحاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس رضی اللہ عنہما، ج: ۱۲، ص: ۱۰۰، رقم: ۳۶۷۴

المرآۃ المستورج: ۱۰، ص: ۱۰، ② بارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۱، ③ بارہ: ۳، سورۃ الفرقۃ، الآیۃ: ۲۵۳

پنی جاری ہے اور اجتہاد ایسے جیسے ڈول ری تو آپ ڈول ڈال کر پانی نکالیں گے تو وہ پانی جو ڈول سے رہا ہے۔ وہ کوئی الگ پانی نہیں ہے۔ اس کو میں میں سے نکل کر آیا ہے ڈول اس کے نکالنے کا ذریعہ بن گیا۔ اسی طرح امام مجتہد کا اجتہاد قرآن کے مخفی علوم نمایاں کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قرآن پر کسی خاص قسم کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ زیادتی کی کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ: "الْقَبْلُ مِنْ مَفْهُومٍ لَا مُبْتَدَأٌ" "قیس کسی مسئلے کو ثابت نہیں، مگر ہر کر سکتا ہے، قرآن میں چھپا ہوا تھا قیاس کرنے والے مجتہد نے اسے نکال کر سامنے رکھ دیا۔" بہر حال ازل کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ، سنت رسوں اللہ کے بعد مجتہد کا اجتہاد ہے۔ اس کے بعد اجماع بنت ہے۔ تو ہم جس مسئلہ کو بھی دیکھیں گے پہلے قرآن میں تلاش کریں گے، پھر قرآن کی شرح جو حدیث ہے، اس میں تلاش کریں گے۔ پھر اس کی شرح میں جو فقہ ہے، تلاش کریں گے۔ اس کے بعد پھر امت کا تعامل دیکھیں گے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم دنا بعین رحمۃ اللہ علیہم، اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم کا کیا عمل رہا، اس سے کٹ نہیں سکتے، جہاں ایک طرف علمی دائرہ ہے۔ وہ محض لفظوں تک محدود ہے لیکن اس کے ساتھ ایک عملی دائرہ ہے کہ تمام سلف صالح اجماع کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی چیز سمجھتے آ رہے ہیں۔ تو تعامل اور عمل امت کو مستحکم کیا جائے گا اور امت کے عمل کا مضبوط زید، عمرو، بکر اور میرا تمہارا عمل نہیں۔ ان علماء ربانی اور صلحا، و مشائخ کھانی کا عمل ہے۔ جنہوں نے قرآن و حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، صی بہ رضی اللہ عنہم دنا بعین رحمۃ اللہ علیہ، تبع تابعین رحمہم اللہ علیہ، مجتہدین رحمہم اللہ علیہ و محدثین رحمہم اللہ علیہ و فقہاء رحمہم اللہ علیہ ہیں۔ یہ اجماع کریں اور عمل کا راستہ ڈال دیں تو یقیناً اس عمل کا ماخذ کتاب و سنت میں ہے اور غور کرتے ہیں تو وہ ماخذ نکل آتا ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔

مسائل وینیہ میں مطالبہ سند اس امت کا ذوق ہے۔۔۔۔۔ بہرحال اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ادھر تو قرآن کی سند متواتر، ادھر حدیث کی سند متواتر۔ یعنی کلام رسول کی اس امت نے وہ حفاظت کی ہے کہ دوسری قومیں اپنے کلام خداوندی کی وہ حفاظت نہیں کر سکیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ اور راویوں کی پوری سند علماء بیان کرتے ہیں۔ "تَحَدَّثْنَا فَلَانِ" مجھ سے فلاں، اور فلاں نے اس سے، اس نے اس سے اور اس سے فلاں نے بیان کیا۔ یہاں تک کہ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے جملے کے لئے بھی یہی طریق کار ہے۔ تو ایک ایک حدیث کی سند محفوظ تھی کہ مسلمانوں نے پیچس ہزار راویان حدیث کا کیریکٹر اور تاریخ مرتب کر دی اور ایک فن بنادیا۔ جس کو فن اسماء الزہاں کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے نام اور کردار و کیریکٹر جو حدیث کے راوی ہیں ان کا حافظہ ایسا تھا، تقویٰ ایسا تھا، فہم نہائی نسبت ایسی تھی تو ایک ایک چیز نکلی اور اسے تاریخ کا جز بنادیا۔

تو جب قرآن کی سند متواتر کوئی حدیث سند سے خالی نہیں، پھر فقہ میں بھی ایسی صورت ہے۔ یعنی اس امت کی عادت یہ پڑ گئی کہ بے سند کوئی چیز نہ مانے مثلاً "اللہ ایدہ" (جو فتنہ کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب ہے۔

ایک عرصہ سے داخل درس نکھای ہے) اس کی سند دی جاتی ہے کہ ہدایہ کی روایت مصنف ہدایہ سے کس نے کی اور اس سے کس نے اور اس سے کس نے روایت کی ہے؟ ہماری سند صاحب ہدایہ تک متصل ہے۔ حتیٰ کہ تصوف میں جو محققین صوفیاء ہیں۔ انہوں نے کہا ہیں نکھیں تو تصوف کے مسائل میں بھی اسی طرح سند بیان کرتے ہیں جس طرح سے حدیث کی سند بیان ہوتی ہے۔ کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، ان سے جنید نے اور ان سے ثعلبی نے بیان کیا، وہ بھی سند سے پیش کرتے ہیں۔ تو اس نسبت کا گویا ذوق ہی قرآن نے یہ بنا دیا کہ بے سند کسی چیز کو جو دین کے بارے میں ہومت قبول کرو۔ آج بھی اگر کوئی دین کا مسئلہ پیش کرے گا۔ پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ بھی؟ قرآن و حدیث فقہ اور تعالٰیٰ نسبت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ علیہ کا عمل اس پر تھا؟ ان میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو بات رد کر دی جائے گی ان سب میں موجود ہوگا تو کہیں گے کہ سر آنکھوں پر ضرور قبول ہے۔

سند صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اتباع فرض ہے۔..... اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور نسبت کے اکابر کی سند تک کے محتاج ہیں اور ایک ایک جز میں کہتے ہیں کہ ان کی سند لاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی سب سے پہلی محبت تو اللہ سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت ائمہ مجتہدین سے قائم ہے۔ ان کے بعد علماء ربانی اور مشائخ بھائی سے قائم ہے۔ محبت سے ہی یہ سارا سلسلہ چلتا ہے۔ اگر ائمہ محبوب نہ ہوتے تو ایک ایک جز کی میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگر مشائخ طریقت محبوب نہ ہوتے۔

تو ان کی کسی بات کی یہ روایت نہ کرتے۔ حالانکہ اسے سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ اگر ائمہ مجتہدین محبوب نہ ہوتے، ان کا اجتہاد کبھی نہ قبول کرتے۔ تو اللہ سے الگ محبت، رسول سے الگ محبت، ائمہ مجتہدین سے الگ محبت، فقہاء و نسبت اور مشائخ طریقت سے الگ محبت۔ یہ تو سب کی محبت میں گرفتار ہو کے عاشق کل ہیں۔ انہیں کوئی یوں کہے کہ ان کے دلوں میں بزرگوں سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس سے سے زیادہ دھوکہ دینے والا کون ہے؟ یہ تو اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ تو علماء، مجتہدین اور فقہاء تک محبت رکھتے ہیں، مشائخ طریقت سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بات کی بھی سند لاتے ہیں کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا، حضرت ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا، یہ ہمارے مقتدا ہیں۔ سند سے ایک بات ثابت ہوتی، ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو تصوف و حدیث، تفسیر سب ان کے سر آنکھوں پر، سب کی محبت کے اسیر ہیں اور یہ سب کے عشاق اور سب کی محبت میں غرق ہیں۔ بہر حال سب سے پہلا مطالبہ سند کا ہوگا اور سند کے بعد جو درجہ رہ جاتا ہے وہ اتباع کا ہے۔ تو جب سند صحیح سے ایک مسئلہ ثابت ہو جائے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اتباع کریں۔ اب خود رائی یہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔ دین میں رائے زنی یا کسی مسئلہ کو رائے سے بنانا، یہ کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ﴿وَمَا تَشَاءُ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا ۚ

يُشْكُونُ لَهُمُ الْمُخَضَّرَاتُ مِنْ أَهْلِ جَهَنَّمَ ﴿١﴾ ”کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ و رسول کا حکم آ جانے کے بعد وہ اس کے اندر اپنی رائے زنی کرے۔“ اس کا اختیار حکم خداوندی آ جانے کے بعد سلب ہو جاتا ہے۔ نہ اس کا ارادہ باقی نہ اختیار باقی، اگر ہے تو اختیار باقی ہے کہ یہودی کر دو کہ جس اللہ سے ایک چیز ثابت ہو گئی۔ تو اب اس میں رائے کی گنجائش نہیں اور فقہ و تعامل انسان سے ثابت ہو گئی اب اس میں بھی رائے زنی اور نال منول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب صرف عمل کرتا ہے تو قانون شریعت عمل کے لئے ہے، تجویز کے لئے نہیں ہے۔ تجویز تو اللہ پاک کر چکا۔ ہمارا کام تجویز نہیں بلکہ تفویض ہے کہ اپنے کو سوچ دیں اور حوالے کر دیں کہ جو اللہ نے کہا وہ میرے سر آنکھوں پر ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی نجات ہے اور اسی میں گروہ بندی اور پارٹی سازی قطع ہوتی ہے۔ پارٹی بندی کبھی نقل، سے نہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ تخیلات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نص مرتج، نص فقہ، یا نص حدیث موجود ہے یا نص کا تعامل موجود ہے تو اختلاف کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔

رائے زنی کبھی غلو محبت سے ہوتی ہے کہ کسی بزرگ سے بے حد محبت ہے۔ اس کا کوئی فعل دیکھا۔ اسے قانون کی صورت میں پیش کر دیا کسی سے عداوت ہے، اس کا کوئی قول دیکھا اسے رو کر دیا تو رد قبول بعض دفعہ غلو محبت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ غلو عداوت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بد فہمی اور بعض دفعہ بد نیتی سے ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے کہ دین میں رخنہ ہی ڈالنا مقصود ہے۔ لیکن جب معن صریح آگئی یہ ساری چیزیں قطع ہو جاتی ہیں۔ خیال آرائی کا دین میں کوئی تعلق نہیں، وہ عقل و دولت ہے جو آئی ہے، ہمارا کام اس کے سامنے گردن جھکانا ہے۔

بہر حال یہ بنیاد ٹھہرا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں تو کوئی چیز نہیں، لاشی محض ہوں۔ نہ کوئی عالم نہ فاضل، علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے والا ہوں۔ مگر علماء سے ایک نسبت ہے ان کا ایک ڈھنگ دیکھا ہے۔ یہ جو اکابر دیوبند کہلاتے ہیں۔ ان کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ، فقہ حنفی، یا جس فقہ کا تابع ہے۔ فقہ حنفی یا شافعی، اس کے بعد تعامل امت اور امت کا ذوق کہ کس ذوق پر امت چل رہی ہے کس ذوق پر سلف صالحین چلے ہیں۔ ان سب کو لے کر ایک مسلک بنتا ہے۔ جس میں قرآن بھی داخل، حدیث، فقہ، تصوف، طریقت و شریعت بھی داخل ہے۔ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے، اس کا اختیار ہو۔ تو میں تو نہ کوئی عالم، نہ فاضل، دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ مگر ان بزرگوں سے نسبت حاصل ہے۔ ذرے کو بھی آفتاب سے نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ذرہ چھوٹی اور حقیر چیز ہے۔ مگر جب آفتاب روشنی ڈالتا ہے۔ ایسے چمکنے لگتا ہے جیسے ہیرا۔ حالانکہ وہ چمک اس میں نہیں۔ وہ چمک آفتاب کی ہے۔ ایک نسبت آفتاب سے قائم ہو گئی جس سے وہ چمک رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ ان حضرات نے سنا سنا سے میں جو تعارف کرایا۔ وہ میرا تعارف ہی نہیں تھا۔ وہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم ایسے عالی حوصلہ ہیں کہ خوردوں کو بڑھا سکتے ہیں، اپنے جھوٹوں کو

عزت دے سکتے ہیں۔ اپنے علو و صلہ اور عالی ظرفی کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف صرف یہ ہے کہ میں لاشیٰ محض ہوں مگر ایک نسبت رکھتا ہوں۔

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ ذرّۂ آفا بے تابا نیم ہم اگرچہ حقیر و ذلیل ہیں۔ مگر نسبت بڑی ہے۔ جن بزرگوں سے وابستہ ہیں۔ وہ بے شک بڑے تھے۔ ان کی وجہ سے کوئی ہمارا نام بھی لے لیتا ہے، ہمیں پوچھ لیتا ہے۔ ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہمارے سامنے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، تعامل انصاف، فقہ اسلامی اور اکابر طریقت و شریعت کی محبت اور ان کی عظمت، یہ چیزیں ہیں جن پر فی الحقیقت دین کا مدار ہے۔

ادب و عظمت دین کی بنیاد ہے۔ دین کی بنیاد ادب پر قائم ہے۔ بے ادبی اور گستاخی پر قائم نہیں ہے۔

بے ادب محروم ماند از فضل رب

جو جسارت اور بے باکی برتے گا، وہ آخرت سے کبھی حصہ نہیں پائے گا۔ کبھی اللہ والوں کا اعتماد نہیں پائے گا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ ① ”اے ایمان والو! انہی کی مجلس میں بیٹھ کر نہی کی آواز سے اپنی آواز بلند مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو اس جرأت و گستاخی کی وجہ سے تمہارے سارے عمل ضائع کر دیے جائیں۔“

یہ رسول کا ادب بتلایا۔ قرآن کریم کا ادب بتلایا ﴿لَا تَضْحَكُوا إِلَّا السُّكُوتُ﴾ قرآن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جب کہ تم با وضو اور پاک نہ ہو۔ مساجد اللہ کا ادب بتلایا کہ جب مساجد میں آؤ، ادب کے ساتھ آؤ: ”لَا فَاتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ وَاتُّوْهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ“ ② مسجد میں دوڑے ہوئے مت آؤ۔ جیسے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ سبک حرکتی ہے۔ متانت، وقار اور سکون کے ساتھ آؤ۔ نیز فرمایا گیا، مساجد کے اندر دنیا کے جھگڑے اور باتیں مت کرو۔ ذکر اللہ کرو، نماز میں مشغول ہو جاؤ، درود شریف پڑھو یا تلاوت کرو۔ جو جھگڑے گھروں میں چھوڑ کے آئے تھے، انہیں مسجد میں بھی لے آئے۔ یہ مسجد کا احترام ہوا یا بے احترامی؟ جس کو فرمایا گیا ﴿وَمَنْ أَعْطَلَ مَنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذَكَّرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسُئِلَ فِي حَوَائِجِهَا، أَوْ لَيْسَ كَمَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يُذْخَلُوا إِلَّا خَائِفِينَ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ بد نصیب، بد قسمت اور ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں کو ڈھارے۔ مسجد کی ایک صورت ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ صورت امتیں ہیں۔ انہیں کوئی ڈھارے، یہ بھی مسجد کا ڈھانا ہے۔ ایک یہ کہ امتیں تو نہیں ڈھاتا۔ مگر دنیا کی باتیں اور لغو مشغول اتنے زور سے کرتا ہے کہ ذکر اللہ

① پارہ ۶: سورۃ الحجرات، الآیہ ۲۔

② روح المعانی، سورۃ الجمعہ، ج: ۲ ص: ۹۰۔

③ پارہ ۱: سورۃ البقرۃ، الآیہ ۱۱۳۔

کرنے والوں کے ذکر کرنے میں غفل پڑ رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والوں کی نماز و تلاوت میں غفل پڑ رہا ہے۔ اس کو بھی فقہاء نے منع کھا ہے۔ بلکہ تلاوت بھی اتنے زور سے مت کرو کہ دوسرے کے ذکر میں غفل پڑے۔ یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانپتا ہے۔ اس لئے کہ مسجد کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب تم ذکر اللہ میں آؤ گے آگے اور دوسرے کو روک دیا تو مسجد کی صورت نہیں ڈھانکی مگر حقیقت تم نے ڈھادی۔

یعنی روایات میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنا ایسا ہے جیسے مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا۔ یعنی مسجد کو آلودہ اور مغمذہ کر دیا۔ اس لئے مسجد، بیت اللہ، حرم محترم، اولیاء اللہ، انبیاء اللہ اور کسب اللہ، ان نسب کا ادب بتلایا۔ سارے دین کی بنیاد ادب و عظمت کے اوپر قائم ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ذی نوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر ابھی آپ نے سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ہمارا یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہما سے گزرتا ہے انہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان حضرات کے اوپر چشتیت غالب ہے۔ گو تربیت قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق پر بھی کرتے ہیں ان کے ان کا ذکر ابھی بتلاتے ہیں اور جس کی بھی مناسبت دیکھتے ہیں۔ ورنہ ہی اس کی تربیت کرتے ہیں۔ تو چاروں سلسلے ان کے پاس ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے حجاز پر سال و دو سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتے۔ تو زوڑ کی سے نہر کی بٹری پر کنارے کنارے کلیر شریف کو راستہ جاتا ہے۔ وہاں سے کوئی پانچ میل ہے۔ حضرت جب نہر کی بٹری پر پہنچتے، جوتے اٹھا کر بغل میں داب لیتے۔ پانچ میل نیچے چرطے کرتے تھے۔ یہ کیا چیز تھی؟ مثلاً کچھ طریقہ کا ادب کہ جن کی جوتیوں کے صدقے ہم نے اخلاق سیکھے، جن کی بدولت ہمارے نفوس پاک ہوئے۔ ان کے احسان کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کس طرح انہیں سر پر نہ بٹھائیں۔ اس لئے پانچ میل کی مسافت نیچے پاؤں طے کرتے۔

حضرت مولانا جب حج کو گئے ہیں تو یہ وہ قافلہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ صاحب وغیرہ۔ یہ سارے حضرات ایک ساتھ گئے تھے۔ مدینہ منورہ (رَآذَہَا اللّٰہُ شَرَفًا وَ مَکْرَامًا) جب قریب آتا ہے تو بیر علی ایک منزل ہے۔ اس پر جب اونٹ چڑھتے ہیں تو چڑھتے ہی حرم شریف کے مینارے نظر پڑتے ہیں۔ اب سوٹروں کی سواریاں ہیں۔ اس زمانے میں اونٹوں کی سواریاں ہوتی تھیں۔ یہ سب حضرات اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ مکہ سے گیارہویں دن مدینے پہنچتے تھے۔ گیارہ راتیں راستے میں لگ جاتی تھیں۔ یہ قافلہ جب ”بیر علی“ پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سواری سے ایک دم اچھل کر نیچے کودے اور نیچے چر چلنا شروع کیا حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی نوکسی ہیں کہ ایسی چھتی ہیں جیسے سونیاں چھتی ہیں۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہاں

جل سکے۔ حضرت کی دیکھا دیکھی سینکڑوں آدمی نیچے کود گئے کہ ہم بھی پیدل چلیں گے۔ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بے وقوفی نہیں ہے؟ ان پر تو محبت نبوی کا حال غالب ہے۔ انہیں نہ کانٹوں کی پرواہ نہ جھین کی پرواہ۔ یہ نقل اُتار رہے ہیں، یہ کہاں تک چلیں گے؟ چنانچہ کوئی سو قدم، کوئی ڈیڑھ سو قدم چلا، پھر اونٹ پر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا جیسے بالکل حبیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ربودہ اور غرق ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں بیرون لوہان ہو گئے اور انہیں کچھ پتہ نہیں وہ جارہے ہیں۔ تو ادب کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کے منارے دیکھ کر یہ جرات نہیں ہوئی کہ اونٹ پر بیٹھیں۔ ننگے پیر کنکریوں میں چلے جس سے معلوم ہوتا ہے ان حضرات کے دلوں میں شریعت کا ادب کتنا غالب تھا۔

حضرت حاجی امجد اللہ مہاجر کی قدس اللہ سرہ جو اس پوری جماعت کے شیخ طریقت ہیں۔ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کے بعد مکہ مکرمہ میں ہجرت فرمائی لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ جوتا نہیں پہنتے پہلے تو اتفاقی بات سمجھے مگر جب کوئی لے کے آیا، اسے رد کر دیا۔ سرخ یا زرد رنگ کا پہنتے۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ارادی فعل ہے، اتفاقی نہیں ہے۔ حضرت سے عرض کیا، حضرت کیا سیاہ جوتا منوع ہے۔ فرمایا نہیں۔ آپ کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا ادب کے خلاف ہے۔ جو رنگ بیت اللہ کے خلاف کا ہے میں اسے بیروں میں ڈالوں؟ شرعاً سیاہ جوتا پہننا منوع نہیں۔ مگر جب ادب غالب ہوتا ہے، آدمی قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔

ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود قانون نہیں..... مگر یہ سمجھ لیجئے کہ قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا۔ یہ خود قانون نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں۔ تم بھی سیاہ جوتا پہننا چھوڑ دو، تم بھی ننگے پیر چلا کرو۔ یہ ایک شخص کا حال ہے اگر وہ حال آپ میں پیدا ہو جائے۔ آپ یہ کام ضرور کریں گے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر گھاتی کریں گے پھر غیر کی نقل اصل ہے۔ لوگوں کی نقل اصل نہیں ہے۔ صاحب حال کا مقام اور قتال کا اور نقل کرنے والے سے کہا جائے گا کہ تو فلاں کی نقل مت کر، قانون شریعت کی نقل کر، سب کے لئے جو عام حجت ہے، وہ قانون شریعت ہے طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ وہ قانون نہیں ہوتے کہ دنیا کو پابند کیا جائے، طریقت کے اور ادا تائے جائیں گے اور ادا کرتے کرتے کوئی حال تک پہنچ گیا۔ اس کے لئے مبارک ہو پھر وہ اس حال کے مطابق عمل کرے گا۔ کسی کو ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن قانون بہر حال نہیں بنے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دے۔ منصور رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب ہوا اور غلبہ حال میں کہا کہ ”انا الحق“۔ میں حق ہوں یہ مطلب نہیں تھا کہ خدا کی کاد دعویٰ کر رہے تھے۔ انا الحق کا یہ مطلب ہے کہ حق ہی حق موجود ہے۔ میں اپنے اعدا دیکھتا ہوں، حق ہی کا جلوہ پاتا ہوں۔ خود میری ذات کوئی چیز نہیں جگہ جگہ حق ہی نظر آتا ہے۔ تو ”انا الحق“ کے معنی یہ لئے کہ حق کا انا غالب ہو گیا کہ اپنی ہستی تم ہو گئی۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے آپ آفتاب کو دو منٹ ٹٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اب جو نگاہ بنائیں گے

جدھر نظر پڑے گی، آفتاب کی نکلیا سبز، سرخ اور سیاہ رنگ کی نظر پڑے گی۔ ساری چیزیں اوجھل ہو جائیں گی۔ آفتاب ہی آفتاب نظر آئے گا حتیٰ کہ آپ اپنے آپ کو دیکھیں، وہاں بھی آفتاب ہی نظر آئے گا۔ ایسے میں اگر کوئی یوں کہہ دے کہ میں آفتاب ہوں تو یہ مطلب نہیں کہ میں آفتاب بن گیا۔ بلکہ یہ کہ آفتاب میرے اوپر اتنا غالب آ گیا کہ آفتاب کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تو منصور پر فحاشیت کا غلبہ ہوا۔ حق تعالیٰ شانہ کی تجلیات اور انوار اتنے غالب ہوئے کہ اپنے اندر دیکھتے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا تھا اور اصرار دیکھتے تھے، وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا۔ بہر حال منصور کا ایک حال تھا جو انہوں نے ”انسان الحق“ کہا۔ کیا یہ قانون ہے کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں کہ تم بھی ”انسان الحق“ کہا کرو۔ اگر لوگ کہیں گے تو انہیں پھانسی دی جائے گی قابلِ گردن زنی ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ منصور نے کہا، ہم کہیں گے۔ منصور کا حال بھی تو پیدا کرو۔ جب حال پیدا ہوگا۔ تم خود بخود اس کو انجام دو گے۔ بلا حال نقل کرو گے تو قانون شریعت کی نقل لازمی رہے گی۔ شخصی حالات قانون نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر کوئی بزرگ بیمار ہوا اور اسے کی سکت نہیں تھی۔ بیٹھ کر نماز پڑھ لی۔ مریدین معتقد تھے۔ انہوں نے سب کو جا کر کہا کہ شیخ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے لہذا سب بیٹھ کر پڑھا کرو۔ سب نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چھوڑ دی کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ انہیں کہا جائے گا کہ شیخ کی بیماری کا وہ حال بھی اپنے اندر پیدا کرو جب بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ حال کا نشان نہیں اور شیخ کی نقالی کر رہے ہیں یہ حرکات و جہدیں ہیں۔ وجد جب پیدا ہوتا ہے جب وہ حرکت سرزد ہوتی ہے۔ وجد آپ کے اندر رہے ہی نہیں اور ان کی نقلیں اتاریں۔ وہ نقل بھونڈی ہوگی۔ پھر شریعت اور احکام شریعہ کی نقل اتاری جائے گی ان احوال کی عظمت کی جائے گی۔ صاحبِ حال کو سر پر بٹھایا جائے گا۔ ان کی تعظیم کی جائے گی مگر قانون کے طور پر نہیں پیش کریں گے۔

مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع پیدا ہوتا ہے..... مگر یہ وہی کچھ سکتا ہے جس کے اندر معرفت معرفت کامل ہو۔ حق کی پہچان کامل ہو، قرب خداوندی حاصل ہو، وہ یہ کر سکتا ہے کہ اتنی چیز میرے کرنے کی ہے اتنی چیز میرے قبضے سے باہر ہے۔ میں نہیں کر سکتا کسی کے ذاتی حال کو قانون بنا کر پیش کرنے سے جنگ شروع ہوتی ہے کہ علماء کھڑے ہوں گے، کہیں گے یہ ناجائز ہے، دوسرے کہیں گے یہ بزرگوں کے خلاف کر رہے ہیں، ہم تو بزرگوں کا حال پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہیں گے بزرگوں کا حال قانون نہیں۔ قانون شریعت پر عمل کرو۔ عمل کرتے کرتے اس حال پر آ جاؤ، جوان بزرگ کا ہے پھر ہم تمہیں کوئی ملامت نہیں کریں گے بلکہ گردن جھکا دیں گے مگر تم بلا حال کے کرو تو قانون شریعت کی نقالی کی جائے گی لوگوں کے احوال کی نقالی نہیں کی جائے گی۔

بعض احوال شخصی ہوتے ہیں قانون نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے اولیائے کاملین میں سے ہیں۔ ایک تو خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء ہیں۔ دوسرے مولانا نظام الدین ہیں۔ ایک شخص جوان کے مریدین میں سے تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ”حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو

خواب میں دیکھ لوں۔ کوئی تدبیر بخلا دیجئے۔“

فرمایا ”فرض نماز چھوڑ دو“۔ یہ حیران ہوئے کہ فرض نماز چھوڑنے سے اللہ کا قرب پیدا ہوگا یا بعد؟ نماز پڑھنے سے قرب پیدا ہوتا ہے، نہ کہ نماز چھوڑنے سے؟ حضرت فرما رہے ہیں کہ نماز چھوڑ دو، اللہ میاں کی زیارت ہو جائے گی۔ ادب سے بول کچھ نہیں سکا۔ مگر عمل کرنے کی جرات نہیں کی، اس لئے کہ یہ بالکل خلاف شرع ہے کہ ترک نماز کا حکم دیا جائے۔ مگر وہ جذباتی تھا کہ کسی طرح حق تعالیٰ کی زیارت ہو۔ تین چار دن کے بعد پھر حاضر ہوا کہ حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اللہ کو خواب میں دیکھ لوں، کوئی تدبیر؟ فرمایا۔ بیوقوف بتا تو دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ اب یہ بے چارہ پھر چپ کہ شیخ کیسے فرما رہے ہیں۔ پھر جرات نہیں ہوئی۔

تیسری دفعہ چند دن کے بعد پھر کہا۔ فرمایا تو احق میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔ تدبیر بتا دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔ ایک دن جاسکے یہ جرات تو نہ ہوئی کہ فرض چھوڑ دے۔ فرض پڑھ لئے سنتیں چھوڑ دیں۔ رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ فرما رہے ہیں کہ بھائی! ہم نے کیا تصور کیا تھا جو ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔ یہ جلدی سے گھبرا کے اٹھا، وضو کیا، عشاء کا وقت باقی تھا۔ جلدی جلدی سنتیں ادا کیں۔ صبح کو حضرت شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا حضرت یہ واقعہ گزر افرمایا ”اگر فرض چھوڑتا تو اللہ میاں آکے پڑھواتے تو نے سنتیں چھوڑنے پر قناعت کی۔“

شریعت و طریقت کو محقق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے..... اب یہ ایک مسئلہ آیا۔ اس میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ بے ادبی کا یہ پہلو ہے کہ مولانا شیخ نظام الدین نے سخت غلطی کی فرض نماز چھڑانے میں۔ اللہ تو نماز فرض کرے، وہ کہیں چھوڑ دو۔ ہم نہیں ان کی بات مانتے۔ ان کی بات کو دیوار پر مارو۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے کہ ایک شیخ وقت کی شان میں گستاخی کی جائے۔ اور ایک راستہ یہ نکلا ہے کہ بھی! ہم نہیں جانتے قرآن وحدیث میں کیا ہے۔ نماز فرض ہے یا نہیں؟

بے سجادہ رنگین کن گرت حیر مغاں گوید

شیخ وقت جو کہہ دے وہ قرآن ناطق ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ ہمیں خبر نہیں قرآن وحدیث میں کیا ہے۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔ کہ شیوخ طریقت کی وجہ سے قرآن وحدیث کو ترک کیا جائے یا قرآن وحدیث کا نام لے کر شیوخ کے طرق کو روک دیا جائے۔ دلوں راستے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔ نہ قرآن وحدیث کی بے ادبی جائز نہ اکابر اولیاء اللہ کی بے ادبی جائز۔ معتدل حق راستہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن رہے اور ایک ہاتھ میں بزرگوں کا دامن رہے اور جامع راستے پر چلے۔ مگر یہ راستہ محقق کچھ مسکا ہے، غیر محقق کس کی چیز نہیں ہے۔

مجھے حضرت مولانا اشرف غنی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہی واقعہ پیش کیا گیا بعض نے تو کہا ہم نہیں مانتے۔ یہ قرآن وحدیث کے

خلاف ہے اس بات کو رد کرو۔ بعض نے کہا ہم مانتے ہیں، ہم نہیں جانتے ان کا عدول میں لکھے ہوئے قرآن و حدیث کو۔ فرمایا یہ دونوں راستے جہاں کے ہیں۔ معتدل اور حق راستہ یہ ہے کہ دونوں کی عظمت قائم رہے اور آدمی بیچ میں سے نکلے۔ فرمایا وہ (معتدل اور حق راستہ) کیا ہے؟

واقعی یہ تحقیق کی بات ہے۔ فرمایا پہلے ایک بات سمجھ لو، اس کے بعد مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔ فرمایا اولیاء اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اپنی ریاضت، محنت اور مجاہدے کرتے کرتے کسی بڑے مقام پر پہنچ جاتے۔ کوئی قطب، کوئی غوث، بہاء، مخفیش اور ریاضتیں کیں اور بڑے مقام تک پہنچ گئے۔

اور ایک وہ ہے کہ حق تعالیٰ اسے منتخب فرمائیں کہ اسے اس مقام کے اوپر لانا ہے۔ وہ نہیں بھی چاہے گا تو زبردستی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقام پر پہنچے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اپنی محنت، دیانت سے بڑے عہدوں تک پہنچ جاتے۔ سپاہیوں میں ملازم ہوں۔ دیانت داری سے کام کیا تو وہ میڈ کا منشیل بن گیا اور محنت سے کام کیا تو اور اوپر کا عہدہ مل گیا اور محنت سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا اور اونچے مقام تک پہنچ گیا۔ اور ایک وہ ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہے اور حکومت نے چاہا کہ یہ ولی عہد ہو اس کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگے گا بھی، زبردستی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کو نیابت کے عہدے پر لائیں اور ولایت عہد سپرد کریں۔ اولیاء میں یہ دونوں طریقے ملتے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے مقامات طے کرتے ہیں۔ بعض منتخب ہوتے ہیں کہ وہ نہ بھی آنا چاہیں تو زبردستی انہیں لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، آپ مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ مسکرائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ”فما یضحکک؟“ کس چیز نے ہنسایا؟ فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں بعض لوگ جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر جنت میں لے جانے کے لئے کھینچا جا رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔

تو صوفیاء کی اصطلاح میں جو اپنی محنت سے مقامات طے کرے اسے مرید کہتے ہیں اور جو اللہ کی طرف سے منتخب ہوا اسے مراد کہتے ہیں۔ تو ایک مرید ہے جو اپنی ارادت اور عقیدت سے ترقی کر رہا ہے اور ایک مراد ہے کہ جس کو منتخب کر لیا گیا ہے وہ نہیں چاہے گا تو زبردستی اسے اونچے مقام پر پہنچائیں گے۔

قرآن کریم میں بھی یہ دونوں مقامات بیان کئے گئے مگر قرآن کی اصطلاح دوسری ہے جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں قرآن میں مکیب کہتے ہیں۔ یعنی ”إِنَّا نَبِّئُكَ إِلَى اللَّهِ“ اور ”وَبُحُّوْا إِلَى اللَّهِ“ کے راستے سے ترقی کر کے پہنچتے ہیں اور جو منتخب کئے جاتے ہیں انہیں مخفیش کہتے ہیں۔ جس کو ارشاد فرمایا: ”وَاللَّهُ يَنْصِبُ حَيْثُ يَشَاءُ وَيُفَضِّلُ الْيَتِيمَ مِنَ الْيَتِيمِ“ ① اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، اسے مقامات پر پہنچاتا ہے اور جو ہدایت، اذیت اور محنت کا راستہ اختیار کرنے، اسے ہدایت دیتا ہے۔ اسے مدد دے کہ مقامات تک پہنچا دیتے ہیں،

① ہمارا ۲۵:۵۰ سورۃ الشوری، الآیۃ: ۱۳۔

تو ایک شخصین کی جماعت ہے اور ایک شخصین کی جماعت ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایک مریدین اور ایک مرادین کی جماعت ہے۔

یہ فرما کر اب حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کیا ہے کہ نہ مولانا نظام الدین کی بے ادبی لازم آئے نہ کتاب وسنت کی۔ فرمایا کہ یہ شخص جس نے یہ درخواست کی تھی کہ اللہ کو خواب میں دیکھوں اس بارے میں مولانا نظام الدین نے پہچان لیا تھا کہ یہ مریدین میں سے نہیں ہے، مرادین میں سے ہے اگر یہ نماز ترک کرے گا۔ اس سے زبردستی پڑھوائیں گے۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں منتخب کیا جا چکا ہے، اس لئے تدبیر بتلائی کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ اس سے پڑھوائیں گے اور زیارت بھی ہو جائے گی۔ اب اس میں کتاب وسنت کی عظمت بھی اپنی جگہ قائم رہی اور اکابر دین کی عظمت بھی قائم رہی۔

یہاں تربیت وصحت تحقیق نہیں ہو سکتا..... مگر اسے تحقق کچھ کا غیر تحقق نہیں۔ غیر تحقق یا مولانا نظام الدین کی توجہ نہ کرے گا یا کتاب وسنت کو ترک کر دے گا اور یہ دونوں راستے جابھی و بربادی کے ہیں۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ قرآن کا واسن بھی ہاتھ سے نہ چھوئے اور اہل اللہ کا واسن بھی ہاتھ سے نہ چھوئے۔ ان کی عظمت بھی اور کتاب اللہ کی عظمت بھی دل میں جاگزیں ہو۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تربیت ہو، محققین کی صحبت میسر ہو۔ اولیائے کاملین کی زیارت کے ساتھ ساتھ ان کا معاہدہ نصیب ہو۔ جب آدمی کہیں تحقق بنتا ہے۔ محض کتاب دیکھ لینے اور بزرگوں کا کلام سن لینے سے محقق نہیں بنتا جب تک کہ محنت کر کے تربیت نہ پائے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ

ماہ با بدیدہ تا یک پنہ داند بعد کشت جامہ گرد و شاہدے رایا شہید۔ راکفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ ایک بنو لے گا داند منوں مٹی کے اندر جائے۔ اپنی ہستی کو فنا کرے اس میں سے پودا پیدا ہو۔ اس میں سے روٹی نکلے، اس سے لباس بنے پھر کہیں جا کے کسی محبوب کا لباس بنے اور دنیا اس کی قدر کرے۔ تو بخود کا داند اگر اپنی ہستی کو مٹا کر روٹی کی صورت میں اپنے کو نہ پیش کرتا نہ شہید کے لئے کفن میسر آتا اور نہ محبوب کے لئے لباس اور کہتے ہیں کہ۔

قرنہا باید تا یک سنگ خارا از آفتاب لعل گرد و بدخشاں با عقیق اندر یمن

قرنہا قرن کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک ٹکڑا آفتاب کی گرمی سے سہتے سہتے صدیوں میں جا کے لعل بدخشاں بنے اور بازار میں لاکھوں روپے اس کی قیمت اٹھے۔ مگر جب تک وہ سنگ خارا آفتاب کی گرمی اور آفتاب کی تپش کو نہیں سہے گا اور اپنے کو جلا کر چھوٹ نہیں دے گا لعل بدخشاں نہیں بنے گا۔ اور اسی طرح سے کہا ہے کہ۔

سالہا باید تا یک کوہ کے از درس علم عالمے گرد و کوہ، یا شاعر شیریں سخن

سالہا سال کی مدت وصحت چاہئے کہ ایک نادان بچہ سات آٹھ برس میں جا کے عالم بنے یا شاعر شیریں سخن بنے۔ مگر بیٹے علم کی دولت نہیں ملتی۔ بلا محنت کے باتیں بنانے سے یہ مقام میسر نہیں آتا اپنی جان کو سوہان لگانی

پڑتی ہے، جان کو جلانا پڑتا ہے، تب جا کے وصل کا مقام میسر آتا ہے۔

ماشقی شیوہ رندان بلاکش باشند

باطن کے بادشاہ..... اور۔

مبین حقیر گدایانِ عشق را کس قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلاه اند

یہ ملّا نے اور درویش بے چارے، انہیں حقیر مت سمجھو یہ بادشاہ ہیں گوسر پہ تاج نہیں ہے۔ یہ بادشاہ ہیں گو کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہوا نہیں ہے۔ مگر سلاطین ان کے آگے جھکے ہیں۔ یہ سلاطین کے آگے نہیں جھکے ان کو اللہ نے بڑی دولت دی ہے۔ جو باطن کی دولت ہے ظاہری دولت والے نہیں جانتے کہ انہیں کیا دولت میسر ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مہارک رحمۃ اللہ علیہ محدث ہیں۔ جلیل القدر عالم اور امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ جب کوئی فقہ کا مسئلہ حاصل ہوتا تو بعض دفعہ وجد میں آ کے کہتے کہ ”اِنَّ اَنْسَاءَ الْمَلُوكِ مِنْ هَذِهِ الْبَغْيَةِ“ کہاں ہیں بادشاہ زادے کہ ہماری اس دولت کو دیکھیں اچھا ہوا کہ یہ اندھے ہیں اگر یہ اس دولت کو سمجھ لیتے تو شاید اس دولت کو چھیننے کے لئے تلواریں لے کر ہم سے جہاد کرتے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہیں اس لئے ہماری دولت محفوظ ہے۔ تو ایک باطنی دولت کے اور ایک ظاہری دولت کے بادشاہ ہیں۔ ظاہری دولت والے باطن والوں کے آگے جھکے ہیں۔ بشرطیکہ، درباب باطن ہوں، درباب باطن نہ ہوں۔ محض پیٹ کے بندے نہ ہوں کہ کھاپی لیں۔ درباب باطن ہوں تو درباب ظاہران کے آگے جھکتے ہیں۔

واہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے..... حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا روزانہ دونوں وقت ہجوم رہتا تھا۔ نواب میر خاں جو ریاست ٹونک کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی، میرے شیخ کے ہاں ہزار دو ہزار مہمان رہتے ہیں بڑی پریشانی رہتی ہوگی۔ شیخ کی کوئی جائیداد نہیں اور تجارت و ملازمت نہیں ہے۔ بڑے پریشان رہتے ہوں گے کہ مہمانوں کو کہاں سے کھلاؤں تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک پورا ضلع جس کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تھی۔ چٹیل کے پترے پر لکھ کر بھیجا کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کو مہمانوں کی مہمانی میں دشواری نہ ہو۔ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس چٹیل کے پترے پر جواب لکھا۔ عجیب جواب تھا۔ لکھا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم ہامیر خاں گویئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و قناعت کی آبرو نہیں کھونا چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے آسمان سے آ رہی ہے۔ تیرے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے حکومتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور حکومت والے پیش پیش ہیں۔

اسی مقام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ و رسول کا ہو جاتا ہے تو ”اَنْتَبِ الدُّنْيَا“

وہی ذی غمۃ، دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں میں آ کر پڑتی ہے، وہ ٹھکراتے ہیں اور وہ زبردستی قدموں میں گرتی ہے۔ دنیا کے بندے خود دنیا کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ ٹھو کریں مارتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک غنی بن کے کماتا ہے ایک محتاج بن کے کماتا ہے۔ اہل اللہ بھی کماتے ہیں مگر غنی بن کر۔ اہل دنیا بھی کماتے ہیں مگر محتاج و فقیر بن کر ایک فقیر اہل اللہ ہے، ایک فقیر اہل اللہ نیا ہے۔ جو اللہ کا فقیر ہے دنیا سے وہ بھی خروم نہیں رہتا۔

اس دنیا کا حاصل یہی ہے کہ آدمی پیٹ بھر لے، لباس سے تن ڈھانپے کون سا اللہ والا ہے جسے کھانے کو میسر نہیں؟ اب رہا یہ کہ انکے پاس بڑی کوٹھی بنگلہ نہیں۔ وہ چاہتے ہی کب جس کوٹھی بنگلے کو؟ وہ تو ایک جھاڑ کے نیچے گزر بسر کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔ یہ تو جب ہو جب وہ آپ کے بنگلوں کو لچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ انہیں لالچی کہیں مگر انہیں کوئی لالچ نہیں۔

اہل اللہ تارک الدنیا ہیں..... حقیقت میں یہ لوگ تارک الدنیا ہیں کہ دنیا پر قابو پاتے ہیں اور پھر ترک کرتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں ہی دنیا نہ ہو اور وہ کہے کہ میں ترک کر رہا ہوں وہ متروک الدنیا ہے، تارک الدنیا نہیں ہے دنیا نے اسے ترک کر دیا۔ دل میں اس کے ہے کہ دنیا آئے مگر دنیا اس کو چھوڑ چکی۔ اسلام نے لوگوں کو تارک الدنیا بنایا ہے، متروک الدنیا نہیں بنایا۔ دنیا پر قابو پا کر، پھر اس کو ترک کرو۔ خواہ ہاتھ سے خواہ قلب سے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم دولت مند مت بنو اور بھک بیٹے بنو۔ مسلمان بھک بیٹے بنو اور سائل بننے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا کو دینے کے لئے آیا ہے، دنیا سے مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کا دنا: كَسْبُ الْفَحْلَالِ لِمَرْيُطَةٍ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ ① نیک اور پاک کمائی ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے اور اللہ اس میں برکت دے دے تو یہ نہیں کہ جا کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنے مصرف میں خرچ کرو، دولت مند بھی بنو۔ خدا اگر کروڑ پتی بنائے بن جاؤ اسے ضائع مت کرو۔ مگر قلب کا تعلق اس سے نہ رکھو۔ قلب کا تعلق اللہ سے رکھو، ہاتھ پیر کا دنیا سے رکھو۔ دنیا ترک نہیں کرانی کہ تم بھک بیٹے بن کے بیٹھ جاؤ۔ دنیا کو قلب سے ترک کر لیا۔ ان کی شان یہ ہے کہ۔

دل بیار دست بکار

ہاتھ پیر کا رو بار میں لگے ہوئے اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہو یہ اسلام کی تعلیم ہے نہ یہ کہ تم دنیا ترک کر کے پہاڑوں میں جا کے بیٹھ جاؤ اس کو رہبانیت فرمایا۔ اسلام میں گوشہ گیری نہیں دنیا کے اندر کا دنا بھی۔ چاہے خدا کروڑ پتی بنائے، اس کی قدر کرو اور اسے اپنے مصارف میں خرچ کرو۔ مگر دل کا تعلق اللہ سے ہو۔ اولیاء اللہ کا بھی کردار اور کیریکٹر تھا۔ یہی ہیں وہ علمائے دیوبند جو ان اکابر اولیاء اللہ کے جانشین ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ، مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جلیل رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے۔

① مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع باب الکسب وطلب الحلال، ج: ۲، ص: ۲۸۱، اوقلم: ۲۸۱، حدیث ضعیف ہے

لیکن معیار درست ہے اور اس کے ثبوت موجود ہیں۔ دیکھئے: کشف الغطاء ج: ۲، ص: ۳۶۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک تقریباً دو ہزار اشرفی ہر وقت پاس رکھتے اور بعض دفعہ مجلس میں بیٹھ کر انہیں خوب اچھالا کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت آپ یہ اشرفیاں اس طرح اچھال رہے ہیں؟ فرمایا: "لَسَوْلاَ هَٰذِهِ الدِّنَانِ يَسُوْلَتُمُنْذَلُ بِنَا هَٰؤُلَاءِ الْخُلُوكُ" ① اگر یہ درہم اور دنانیر روپیہ پیسہ ہوتا تو یہ بادشاہ زادے تو ہمیں ناک پوچھنے کا درواں بنالیں۔ ہم بتلا دیتے ہیں جو تمہیں میسر ہے، وہ ہمیں بھی میسر ہے ہم تمہارے محتاج نہیں۔ لیکن جو ہمیں میسر ہے وہ بقدر ضرورت بھی تمہیں میسر نہیں۔ تم ہر حالت میں محتاج ہو کہ ہم سے آ کر نیکو۔

تو اسنام کی تعلیم یہ ہے کہ سائل و مفلس بنانا مقصود نہیں، غنی بنانا مقصود ہے۔ "وَ خَيْرُ الْفَنَسِ غَنِي الْفَنَسِ" غنی اور امیری قلب کی امیری ہے۔ ہاتھ پیر میں چاہے لاکھوں روپے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بیٹھ کر ایک ایک دن کے اندر کئی کئی لاکھ روپے اپنے دست مبارک سے تقسیم کئے ہیں۔ تو یہ شان بتلائی گئی کہ دنیا قبضے میں بھی کرو۔ پھر قرب سے ترک کرو اور اگر دنیا ملتی نہیں اور کہا تم تارک الدنیا ہیں۔ تو تارک الدنیا نہیں مڑو تارک الدنیا ہو دنیا نے تمہیں ترک کر رکھا ہے۔ جیسے نامرد اور عینیں یوں کہے کہ میں بڑا پارسا ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ لوگ کہیں گے تجھ میں جانے کی طاقت کہاں ہے؟ تو کہاں سے حقی بن گیا۔ حقی وہ ہے کہ جانے کی طاقت ہے پھر بھی نہیں جاتا۔ اللہ کے خوف سے ڈرتا ہے نہ کہ نامرد ہونے کا نام حقی ہے۔ بہر حال تارک الدنیا وہ ہے کہ دنیا قبضے میں ہے پھر ترک کر رہا ہے۔ وہ حارک الدنیا نہیں کہ دنیا ہاتھ میں نہیں، لچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے کہ میں تارک الدنیا ہوں۔

ادب و عظمت کے حامل کتاب اللہ کے سچے وارث ہیں..... بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد ادب و تادب پر ہے، عظمت شریعت کا ادب، اولیاء اللہ اور علماء ربانی کا ادب، کتاب اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، مدارس دینی اور خانقاہوں کا ادب۔ ان سارے لویوں پر دین کا مدار ہے۔ بے ادبی اور گستاخی میں آ دی کا دین نہیں بنتا۔

پھر ادب کے بعد اتباع ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اجماع، سنت کا اتباع اور اس ذوق کا اتباع جس کے اوپر پوری امت کے صلحاء چل رہے ہیں اس سے الگ ہو کر خیال آرائی اور تخیل سے کوئی یکڈنڈی بنانا، اسلام نے ان سب کو رد کیا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین وہی ہے کہ نقل صحیح، ذوق سلیم کے ساتھ اتباع اور ادب کے ساتھ اسے قبول کیا جائے اسی کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا کہ حق و باطل کا معیار یہ ہے کہ "هُوَ الَّذِي أَوْخِنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا فِي يَدَيْهِ" ② "اے پیغمبر! جو ہم نے آپ کی طرف کتاب کی وحی کی ہے۔ وہی ہے حق، وہی مصدق ہے۔ اس کی تصدیق اور تکذیب سے آدمی بچا اور مھوٹا سمجھا جائے گا۔" اور فرمایا: "هُنَّ أَوْفَا الْكِتَابِ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا" ③ ہم نے ایک جماعت کو اس کتاب اللہ کا وارث بنایا۔ کن لوگوں کو بنایا؟ جن کو ہم

① مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الوفاق، باب استحباب المال والعمر للطاعة، الفصل الاول، ج ۳: ص ۱۴۷، رقم: ۵۲۹۱۔

② ہمارہ ۲۴، سورۃ الفاطر، الآية: ۳۱، (۳) ہمارہ ۲۴، سورۃ الفاطر، الآية: ۳۴۔

نے منتخب اور پسند کیا تھا کہ ان میں سے ہمیں دین کا کام لینا ہے، اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وراثت تو باپ سے ہی ملتی ہے کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو، تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اپنی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا، جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے، اس کا شیخ یہ۔ اس کا آگے شیخ وہ، سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو، تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کر گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے، وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا: ﴿كُلَّمَا أَوْزَنَّا الْكَفَّةَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ ① ”پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا، جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا۔“

اب فرمایا: ﴿فَبَيْنَهُمْ ظِلَالٌ لِيُفْتَبَ﴾ ② بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے جیسے کر کے معنی تحریف شروع کی فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ﴾ ③ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر ادھر نہیں ہٹتے، مبیہ اختیار کر لی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ بھی نجات پائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ إِذَاخِ اللَّهُ﴾ ④ بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے، ہر حیثیت سے دین کو مضبوط رکھتے ہوئے ہیں اور دین کی طاقات ہاتھ میں لے کر فرمائے بھر رہے ہیں وہ سابق خیرات ہیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگا دیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے، کوئی ٹپک رہا ہے، کوئی معمولی چال چل رہا ہے، کوئی ادھر ادھر ہٹ کر اس بیلی سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع و اقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنی میں کتاب اللہ کے وارث بنیں انہی معنی پر چلتے رہیں جو روایت ہو کر چلے آ رہے ہیں۔ جس میں سلف کا ذوق اور سلف کا تعامل شامل ہے اور جس میں وہ مذاق دینی شامل ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ

① ہمارے: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۲، ② ہمارے: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۲، ③ ہمارے: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۲، ④ ہمارے: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۲،

علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں معنی بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آ رہا ہے۔ جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کی چار شانیں ہیں۔ ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ﴾ ① اللہ کی آیتیں بامانت الفاظ آپ نے پہنچادیں۔ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ ② پھر تعلیم کے ذریعے ان کی مراد استہدائی بیان کریں۔ ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ پھر عملی اسوہ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا: ﴿وَنُفِّسُوا بَيْنَهُمْ﴾ ④ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔ کئی نکال دی اور زلیج نکال دیا۔ ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی نے چند حرف دیکھ لئے۔ کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔ یہ چھچھور پن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔ جس کا آدمی علم نہیں رکھتا اس میں کبھی رائے نہ دے۔ مثلاً سنا رکھنا کوئی مسئلہ آئے گا، اگر آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنا رکھ کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو۔ آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھی ایش لوہار نہیں۔ اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ۔ مگر جب دین کی بات آتی ہے تو نوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔ اس میں رائے زنی کے نئے تیار ہیں۔ گویا دین ایک کھلونا ہے۔ جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے، آپ کے پاس بھی۔ اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ ایک کسوٹی پیش کر دی۔ اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پرکھتے رہیں اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے۔ یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ وقت میں نے زیادہ لے لیا۔ خود میں اتنی ہمت اور طاقت بھی نہیں تھی۔ مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگا یا ہو۔ جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں۔ بہر حال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم وعمل کی توفیق عطا فرمادے، صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔ زلیج اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تحلیلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے، جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آرہی ہیں۔ (آمین)

”اَللّٰهُمَّ وَبِنَا نَقْبُلْ بِمَا اَنْتَ السَّابِقُ الْعَلِيْمُ وَ اِنَّا مُتَابِعُونَ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْ دَعْوَانَا اَبْنِ الْعَمَلِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔“

① ہمارے ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۴۔ ② ہمارے ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۴۔

③ ہمارے ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۴۔ ④ ہمارے ۲۸: سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۴۔

تسکینِ فطرت

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُسَبِّحُہٗ وَنُثَنِّیْہٗ وَنُکَبِّرُہٗ وَنَعُوْذُ بِہٖ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ حُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ نِّیَابِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّہْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضِلِلْہٗ فَلَا هَادِیَّ لَہٗ ، وَنُشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنُشْہَدُ اَنْ سَیِّدَنَا وَسَیِّدُنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٌ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَنَ اللّٰہُ اِلَیْہِ کَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا ، وَدَّاعِیًا اِلَیْہِ بِاَذِیْہِ وَمِرَاجًا مُّبِیْنًا۔ اَمَّا بَعْدُ.....

تین قطری سوال..... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے میرے ایک عزیز نے چند سوالات نقل کئے جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جاتا ہے؟ اور اس آنے اور جانے کے درمیان ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ جب تک ان تینوں سوالوں کا جواب شفا بخش طریقے سے نہیں مل جاتا۔ انسان میں بے چینی رہتی ہے سکون قلب پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین سوال جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت جو ہمارے محترم قاری صاحب نے رکوع تلاوت کیا۔ ان تینوں سوالات کا جواب اس رکوع کے اندر موجود ہے۔ تو فرق اتنا ہو گیا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے بعد میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا ہو گیا (۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ) کہ پہلے جواب پڑھا گیا بعد میں سوال کیا گیا۔

یہ جو پورا رکوع ہمارے محترم قاری صاحب نے پڑھا ہے، یہ دس احکام پر مشتمل ہے۔ دس ہدایتیں اس میں حق تعالیٰ نے دی ہیں اور پھر ایک ایک ہدایت بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ تو مجموعے کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصولاً اس میں دس باتیں بیان کی گئی ہیں اور وہ دس باتیں انہی سوالات کے جوابات ہیں کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ کس کی رضا مندی اور کس کو خوش کرنے کے لئے ہم زندگی گزاریں اور وہ مہربان کیا ہے جس سے ہماری ابتداء ہوتی ہے۔ پھر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ تو اسی رکوع میں انجام بھی بتا دیا گیا ہے۔

غرض مذہب کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ ایک مبدا، ایک معاد، ایک میعاد کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء کہاں سے ہوئی۔ معاد کا مطلب یہ کہ لوٹ کر کہاں جاتا ہے۔ میعاد کا مطلب یہ کہ درمیان میں کس طرح زندگی گزارنی

جائے۔ تو اس رکوع میں مبداء کا بھی ذکر ہے کہ وہ کون سی ذات ہے جو تہااری اصل ہے۔ معاذک بھی ذکر ہے کہ تہاارا انجام کیا ہوتا ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ درمیان کی زندگی کس طرح گزرتی ہے۔ اس لئے اس وقت کسی تقریر کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفسیر کی ضرورت ہے کہ اس رکوع کی تفسیر کر دی جائے۔ ترجمہ و شرح میں تقریر بھی ہو جائے گی۔

انسان کا مبداء کیا ہے؟..... تو ابتدا یہاں سے کی گئی ہے کہ ﴿تَسْبُحُكَ الْمَلٰٓئِکَةُ فِی السَّمٰوٰتِ یُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَتُحْجَلُ فِیْهَا سُبْحًا وَنَحْلًا مُّبٰیۡنًا﴾ ① برکت والی وہ ذات ہے جس نے آسمان میں برج قائم کئے، منزلیں قائم کیں اور ان منزلوں میں سے سورج اور چاند کو گزارا، جس سے رات اور دن پیدا ہونے لگے، موسم بننے لگے، سردی گرمی اور برسات آنے لگی۔ یہ گویا مبداء کا ذکر ہے کہ اصل ابتدا جس ذات سے ہے۔ اس کی قدرت آسمانوں، زمین میں کام کر رہی ہے۔ آسمان بنا دیئے، چاند سورج پیدا کر دیئے اور ان میں حرکت پیدا کر دی۔

رحمان کے بندوں کی چال..... اس کے بعد دس احکام شروع کئے کہ اس کی رضا کے لئے کس طرح زندگی گزار دی جائے ﴿وَمَنْ عِیَّادٌ لَّا یُخْشِیْ اِلَّا وَجْہَہٗ ۚ عَلٰی الْاَرْضِ مَخْلُوۡقًا﴾ ② ﴿رَحْمٰنُ﴾ کے بندوں کا دنیا میں کیا ڈھنگ ہونا چاہئے؟

رحمن لغت میں اور شریعت میں بھی اس ذات کو کہتے ہیں جو ساری نعمتوں کا مالک ہو۔ نگہبری اور باطنی تمام نعمتیں دینے پر قادر ہو۔ ہر نعمت اس کے قبضے میں ہو۔ ساری نعمتوں کا والی، وارث اور مالک ہو۔ تو اس رحمن کے بندے کس طرح سے دنیا میں زندگی بسر کریں۔ فرمایا، رحمن کے بندوں کا ڈھنگ یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ زمین میں چلیں تو نرم چال چلیں۔ اس میں ہدایت دی گئی کہ زندگی کی بنیاد تواضع اور خاکساری پر رکھی جائے۔ کبر و نفوت پر بند رکھی جائے۔ تکبر اور اپنے کو بڑا بنانا یہ نہیں بلکہ چال سے واضح ہو کہ کوئی خدا کا بندہ جا رہا ہے۔ یہ نہ معصوم ہو کہ کوئی جبار قہار جا رہا ہے۔ انسان کی شان نہیں ہے اور انسان کی شان یہ کیوں نہیں ہے؟

اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ: ”مُحَلِّیْہُمْ بَنُوۡۤاۤدَمَ وَاۡدَمَ مِنْ تُرٰۤاۤبٍ“ ③ ”تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔ آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔“ مٹی کا یہ کام نہیں ہے کہ اچھل اچھل کر اوپر جائے یہ جب تک پست اور پائیل رہے گی جہی تک اس کی قدر ہوگی۔ مٹی جو توں میں روندی جاتی ہے مگر چوٹ نہیں کرتی۔ جہی تک اس کی قدر رہے کہ جس طرح ہم تصرف کریں بلا چوٹ وچہ اس تعارف کو قبول کرے، اگر مٹی اوپر اڑی، کسی کی آنکھ میں پڑی، وہ لعنت کرے گا۔ کسی کے کپڑے پر گرے گی وہ کپڑے کو جھٹک دے گا۔ کہے گا کہ کبخت گرد کہہ اس سے آگئی تو مٹی نے ذرا ابھرنے کا نام لیا تو اس پر لعنتیں برسا شروع ہو گئیں۔

① پارہ ۱۹، سورۃ الفرقان، آیۃ ۶۱۔ ② پارہ ۱۹، سورۃ الفرقان، آیۃ ۶۳۔ ③ مستندبزار ج ۵: ص ۲۲۱

وقف: ۲۵۵۱۔ حدیث سنن ہے، دیکھئے الصحیح وضعیف الجامع ج ۷: ص ۱۵۰ رقم: ۲۶۶۸۔

تو جس مٹی سے انسان پیدا کیا گیا، اگر وہ اٹھنے لگے، غرور کرنے لگے، کبر و نخوت اختیار کرنے لگے۔ ہر شخص اس انسان کو برا کہے گا اور جو تواضع و خاکساری اختیار کرے اور مٹی بن کر رہے، سب اس کو سر پر بٹھا کریں گے کہ یہ بڑی کیا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی مجلس میں جو بڑا بول بولتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ دین اس کو سزا مل جاتی ہے اور جو تواضع کا کلمہ بولتا ہے، سب اس کی قدر کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی عادت سریرہ بھی یہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی بندہ عبادت کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! میرے سے کچھ نہیں بن پایا۔ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ تیرا فضل ہے کہ یہ کام تو نے مجھ سے کرا دیا۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ شانہ فوراً فرماتے ہیں کہ نہیں عمل تو نے ہی کیا تھا۔ مسجد کی طرف چل کر تو ہی گیا تھا۔ حج کے لئے بیت اللہ کی طرف تو نے ہی سفر کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کیا اور اگر کوئی کبر و نخوت سے یوں کہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی، میں نے عبادت کی، میں نے یہ کام کیا۔ فرماتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ام نے تیرے اندر پیدا کیا بدن، روح اور طاقت ہم نے دی۔ تو نے کیا کیا؟ جو خود دعوے کرتا ہے اسے پست کر دیتے ہیں اور جو دعویٰ چھوڑ کر کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے فرماتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا۔ اس لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جو آدمی خاکساری برتے، عجز و نیاز برتے، ہندگی کی شان سے آئے۔ اسے اونچا اٹھاتے ہیں، اسے عزت دیتے ہیں اور جو خود ابھرنے لگے اسے زمین پر بیٹھ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ۔

پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تو انسان کی فطرت یہی بنائی گئی کہ تیرے سامنے نمی ہے۔ اگر وہ ابھرتی ہے تو تو لعنت بھیجتا ہے۔ یہ جوتیوں کے نیچے رہتی ہے تو عزت کرتا ہے۔ تو جس چیز سے تو بٹا ہے تیرا مزاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جتنی تو خاکساری برتے گا تیری عزت ہوگی۔ جتنا تو غرور کرے گا، اتنا ہی تجھے پست کر دیا جائے گا۔ تو پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ زمین کے بندوں کی زندگی کا ذکر تنگ کیا ہونا چاہئے۔ جب گھر سے باہر نکلیں اور چلیں تو زمین پر اپنی چال چلیں نخوت و کبر کی چال نہ چلیں اس کو دوسرے موقع پر قرآن کریم نے فرمایا ﴿وَافْبِهْذِ الْمَضَاجِ فَسْئَلُكُمْ عَنْهَا﴾ ① اپنی چال میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور زیادہ زور سے چلا کر مت بولو حسب ضرورت آواز بلند کرو۔ بہت زیادہ شور مچا کر بولنا، کبر و نخوت کی علامت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کی آواز ہی خلقِ بلند ہو، وہ دوسری بات ہے۔ لیکن ارادہ کر کے آدمی چلائے، یہ سمجھ کر کہ دوسرے کے اوپر میری آواز کا دباؤ پڑے یہ ممنوع ہے۔ بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ آواز بلند کرے۔ تو بولنے اور چلنے دونوں میں اعتدال ہونا چاہئے۔

① پارہ: ۳۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۹۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کا جو نقشہ حدیث میں آتا ہے کہ "اذا مشی تکفأ کانما یحط من صلب" ① آپ اس طرح چلتے تھے کہ عجیب شان تھی۔ اس طرح کہ گردن تو جھکی ہوئی جس کو خا کساری کی چال کہتے ہیں۔ مگر ساتھ میں قوت اتنی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا زہین کو کھود کر اندر کھس جائیں گے۔ اتنی قوت سے قدم پڑتا تھا۔ تو قوت بھی ہو، شجاعت بھی ہو اور خا کساروں کی طرح نیاز مندی بھی ہو، وقار بھی اور تواضع بھی ہو۔ نہ بیماروں کی چال چلے جیسے کوئی سر بیض جا رہا ہے کہ ذرا کوئی تھپڑ مار دے تو گر پڑے، یہ بھی نہیں اور نہ ابھر کر چلے جیسے کوئی متکبر جا رہا ہے۔ سچ کی چال ہو کہ اس سے خود داری اور خا کساری بھی چپکے چپکے ینمشون علی الازھو ہوناف ② کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ چلے، بلکہ یہ کہ تواضع سے چلے چاہے تیز چلے گویا یہ پہلا نقشہ بتلایا گیا کہ جب گھر سے نکلو تو ایسی چال چلو۔ اس لئے کہ مسلمان بے فکر انہیں پیدا کیا گیا کہ جس طرح اس کا جی چاہے چل پڑے۔ قدموں پر نگاہ ہونی چاہئے کہ یہ کس طرح سے چلیں اس لئے کہ مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿مَن يَكُنْ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خُمُسِيَّةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَى مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا﴾ ③ تم تین آدمی تنہائی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ سر کوئی کرو گے تو چوتھا خدا وہاں موجود ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ تمہاری باتوں کا سننے والا کوئی نہیں۔ تم چار ہو گے پانچواں خدا ہوگا۔ تو زیادہ ہو گے تب خدا موجود، کم ہو گے تب خدا موجود۔ جب اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور موجود ہے تو آدمی کو ہر جگہ ادب سے چلنا پڑے گا۔ بے ادبی وہ کرے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسجد میں خدا ہے اس لئے میں ادب کرتا ہوں اور سڑک پر گویا خدا نہیں تو میرا جی جس طرح چاہے چلوں۔ یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے۔ ہر جگہ کے مناسب ادب ہوگا اور بحرحرہ نیاز مندی اختیار کی جائے گی۔ تو زندگی گزارنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں قدم قدم پر نگاہ رکھیں کہ ہماری چال و حال کیا ہے۔

رحمن کے بندوں کا قال..... اس کے بعد آگے فرمایا، چلتے چلتے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تو اس میں اچھے بھی ملتے ہیں اور برے بھی بعض تو ایسے ملتے ہیں جو بڑے مہذب اور شائستہ ہیں۔ آپ نے سلام کیا، انہوں نے جواب دیا انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا، آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا، محبت بڑھ گئی۔ اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جو جھگڑے اور لڑائی بات اٹھاتے ہیں کہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ لیا کسی پر پھبتی کس دی۔ ایسے موقع پر ہماری رفتار کیا ہونی چاہئے اس پر فرمایا: ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ ④ "اگر جاہل ملیں اور جاہلانہ حرکتیں کریں تو تم ان کے ساتھ جاہل مت بنو"۔ تم سلام کہو۔ یعنی جب وہ جاہلانہ بات کریں۔ بس ان سے کہہ دو کہ بھی!

① الجامع للترمذی، کتاب المصائب، باب ما جاء فی صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۲، ص: ۸۹.

② ہلہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳، ③ ہلہ: ۳۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۷، ④ ہلہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۶۳.

ہمارا اسلام ہم یہ باتیں نہیں جانتے تمہارے لئے بھی ذرا نہیں، ہمارے لئے بھی اور اگر آپ بھی جھگڑے میں لگ گئے تو وہاں اچھی خاصی لالچی چل جائے گی۔ جھگڑا اٹھ جائے گا اور جھگڑا اٹھنا بہت آسان ہے۔ مگر اس کا مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے عبرتوں کو تپڑتا ہے۔ تو فرمایا گیا جب چنو تو چال میں نرمی پیدا کرو۔ نرم چال رکھو کہ ہر ایک آدمی محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ جھگڑا جب کرے گا جب آپ منکبرانہ انداز سے جائیں اور جب تواضع سے گئے تو اول تو سب عزت کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بے وقوف آدمی مل جائے اور جاہلانہ باتیں کرے تو آپ کہیں گے: **قَالُوا سَلَامًا** (بھئی! ہم یہ بات نہیں جانتے، ہمارا اسلام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ تم جاؤ تمہارا کام جانے۔

اسلام کی برکات اور آداب..... اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ایک ایسی عظیم چیز ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سلام آدمی نہ کرے تو برا سمجھا جاتا ہے اور اگر سلام کر لے تو جاہل بھی ہوں گے، وہ بھی جھک جائیں گے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے سلام کر رہا ہے۔ اس واسطے فرمایا گیا اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں، عداوتیں بھی ہوں۔ اگر دشمنیوں کو آپ سام کریں گے دشمنیاں دھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ **وَعَلَيْكُمْ السَّلَام** کہنے پر مجبور ہوگا۔ جس کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے بھی سلامتی ہو۔ جب سلامتی کی دعا دے گا تو جھگڑا اٹھانے کا کیوں؟ خود کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ تو دعا بھی دے اور اوپر سے جھگڑا بھی اٹھائے؟ اس سلسلہ نے ساری دشمنی ختم کر دی۔

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ: **تَقَرَّبُوا السَّلَامَ عَلَيَّ مَنْ غَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ** ① ”سلام کرنے کی عادت ڈالو، خود تعارف ہو یا نہ ہو۔“ آج کے زمانہ کا تمدن یہ ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرے نہ بول نہ چل نہ سلام نہ کلام۔ یہ منکبرانہ تمدن ہے۔ یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے۔ اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم میں اور تم میں اسلام کا رشتہ مشترک ہے، اسلامی اخوت اور بھائی بھائی بھیلی ہوئی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے۔ پہلے سے ہی تعارف حاصل ہے۔ یہ ہمارا بھائی مسلمان ہے۔ اس میں اسلام بھرا ہوا ہے۔

ہمارا تعارف بھی اسے حاصل ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں جب دونوں کے اندر ایک رشتہ مشترک ہے، پھر تیسرے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تعارف کرائے۔ اگر گھر میں دو حقیقی بھائی موجود ہوں وہ دونوں یوں کہیں کہ کوئی تیسرا حملے والا آ کر تعارف کرائے کہ یہ آپ کے حقیقی بھائی ہیں اور یہ آپ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ جب ہم کلام کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری رشتہ داری ہے۔ مجھے کیا مصیبت ہے کہ میں تیسرے آدمی کو بلاؤں کہ بھئی! میرا تعارف کر دو۔ یہ جنگلف اور بناوٹ ہے تو نسبتی رشتے سے زیادہ قوی رشتہ اسلام کا ہے۔ دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے۔ جتنے دینی رشتہ کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کوئی چوتھا تیسرا آدمی تعارف کرائے۔

① الصحيح لنبخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام، ج: ۱، ص: ۱۹۔

ہاں البتہ اس زمانے ایک مصیبت پڑ گئی کہ ہم صورت سے یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں؟ بعض اوقات سلام کرنے کو قبیح سمجھتا ہے۔ لیکن سوچتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے۔ یہ مصیبت آ کے پڑ گئی اس سے معلوم ہوا کہ حیثیت اور وضع بھی ایسی ہو جس سے دور سے سمجھ لیا جائے کہ مسلمان آ رہا ہے تاکہ سلام و کلام کی نوبت آ جائے۔

بہر حال اس حدیث میں ہدایت کی گئی کہ پہچان پہچان کر سلام نہ کرو۔ اس واسطے کہ تعارف کرانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ہوں اس کا تو تعارف ہو گیا اور اگر کوئی چھوٹا آدمی آئے تو اس کا کوئی تعارف نہیں کراتا۔ گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہوگا چھوٹے کو نہیں ہوگا، یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منہ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر سوار جا رہا ہو اور لوگ سڑک پر سامنے بیٹھے ہوں۔ تو سوار ہونے والے کا فرض ہے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سلام کرے۔ اپنے اندر خفا کساری پیدا کرے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دے جس میں یہ انتظار ہو کہ یہ مجھے سلام کریں۔ کیونکہ یہ میرے سے چھوٹے ہیں یہ چھوٹائی بڑائی کہاں کی؟ آدمی خود ہی چھوٹا ہے۔ بڑا اللہ ہے۔ سب سے بڑی ذات وہ ہے۔ اس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔ اس لئے ہر شخص یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں اور وہ بڑا ہے جب یہ سمجھے گا تو سلام کی ابتداء کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے سلام کے آداب میں سے یہ ہے کہ جب دو آدمی ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کہے کوشش کرے کہ پہلے میں سلام کہوں۔ یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے کہ دوسرا مجھے سلام کرے۔ اسی کو فرمایا گیا: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ عَلٰی الْأَرْضِ هَوْناً﴾ ① رحمن کے بندے جب چلیں تو خاکساری کی چال چلیں اور جب لوگوں سے ملیں تو سلام کی عادت ڈالیں۔ اگر تک لوگ ہیں تو سلامتی کی دعا ہوگی۔ اگر برے اور جھگڑا لوگ ہیں۔ تو یہ سلام رخصت کا ہوگا کہ بھئی! ہمارا سلام ہم جاتے ہیں۔ ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ تو سلام ہر صورت میں انسان کے لئے لازم رہا۔

پھر یہ اتنی پاکیزہ چیز ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ”لَا تَسْلَمُوا لِلْمَسِيحِ وَالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى لَأَن تَسْلِمَهُمْ بِالْأَكْفِ وَالرُّؤُوسِ وَالْإِشَارَةِ“ ② یہودیوں کا سلام انھیں سے ہے، نصاریٰ کا سلام جھٹلی سے ہے اور مسلمانوں کا سلام ”السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ“ ہے۔ تو یہود و نصاریٰ کا سلام اشارہ جھٹلی ہیں اور مسلمانوں کا سلام ایک مستقل وعام ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں، برکتیں تم پر نازل ہوں۔ ہر مسلمان جو دوسرے کو دعا دے۔ اس سے اس کی خیر خواہی اور محبت ظاہر ہوگی۔ تعلق بھی مضبوط ہو جائے گا۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان الآية: ۶۳، ② الجامع للشمذی، کتاب الاستئذان والآداب، باب ما جاء فی تکرارہ

إشارة الیہ بالسلام ج: ۹ ص: ۷۱، ۳۰

وہ شمس مشہور ہے کہ کسی آدمی کے سامنے کوئی جن آگیا۔ تو اسے خطرہ لاحق ہو گیا کہ یہ تو کھا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ماموں جان! سلام۔ اس نے کہا بھانجے وعلیکم السلام اور کہا کہ میرا ارادہ تجھے کھانے کا تھا۔ لیکن تو نے ماموں کہا اور سلام کہا۔ میرے دل میں رحم آ گیا۔ میں نے چھوڑ دیا اب تو آزاد ہے جہاں چاہے جا چلا جا۔ تو سلام نے جان بچائی یہی صورتِ دشمن کی بھی ہے۔ اگر کسی سے کئی دشمنی ہے اور آپ کہیں السلام۔ علیکم وہ پہنچ جائے گا دشمنی و جھلی پڑ جائے گی تو یہ بہت بڑی نعمت اور عظیم دعا ہے۔

تو زندگی گزارنے کے طریقے میں پہلی چیز چال ہے دوسری چیز قال ہے کہ قال میں دعا ہو، چال میں تواضع ہو اور بھگڑاؤ دوسرے بھی جب کلام کرو، سلام کے ساتھ کرو کہ ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا تَنْفَعِي الْيَهُودِينَ﴾ ① ہمارا سلام ہو، ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔ گویا اسلامی شریعت نے رہن کہن کے لئے ابتدائی دو چیزیں بتلائیں۔ ایک زبان کو قابو میں رکھو، دوسرے قدم کو قابو میں رکھو۔ بے ڈھنگا چلو بھی مت اور کلام بھی مت کرو۔

رحمن کے بندوں کی انتہائی..... یہ تو لوگوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اب آگے اور چلے تو آگئی مسجد۔ یا تنہائی آگئی یارات کا وقت آگیا جس میں لوگوں کے ساتھ اختلاف نہیں، پھر کیا کرے آگے اس کی ہدایت دی ﴿وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا﴾ ② رحمن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ رات گزارتے ہیں تو سجود اور قیام کے ساتھ گزارتے ہیں کہ کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام اور رکوع میں ہیں، اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے گود بڑھاتے ہیں۔ گویا مخلوق کے آگے مہذب بن کر آتے ہیں اور خدا کے سامنے عابد بن کر آتے ہیں، یہاں عبادت کی ضرورت ہے، وہاں شفقت کی ضرورت ہے۔ شفقت کا اثر یہ ہے کہ سلام کرے اور عبادت کا اثر یہ ہے کہ سجدہ و رکوع کرے۔ ناک اور پیشانی کو اللہ کے سامنے سجدے میں رگڑے۔

یہ گویا جانی عبادت بتلائی گئی کہ جب تم اپنے گھر میں آؤ۔ یعنی مسجد میں تو کبھی عبادت کرتے ہیں، اس کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ لیکن اگر گھر میں صیبت (رات گزارنے) کے لئے آؤ۔ صیبت کہتے ہیں رات گزارنے کو۔ رات گزارنے میں ہر انسان تنہا ہوتا ہے جب سو گیا تو وہ تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جاگتا ہوا ہوگا، مجلس کرے گا۔ دوستوں میں بیٹھے گا، باتیں بھی کرے گا اور جب سو گیا تو ایک ناکھ آدمی اگر آپ جگہ سوئے ہوئے ہیں، ہر ایک ان میں سے تنہا ہے۔ اس وقت ہر ایک کا سابقہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بندوں کے ساتھ نہیں۔ اس واسطے اس موقع کا ادب بتلایا کہ جب تم تنہا ہو اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس وقت سجود و قیام اور طاعت و عبادت کو اپنا شیوہ بنا لو تاکہ تمہاری بندگی نمایاں ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں کہ "فَلَسْتُ ذَرَجَاتٍ" تین چیزیں ہیں جن سے انسان کے

① پلارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۵۵۔

② پلارہ: ۱۹، سورۃ النمل، آیۃ: ۶۳۔

درجات بلند ہوتے ہیں۔ عنہ اللہ بھی اس کا رتبہ اونچا ہے اور خلقت کے نزدیک بھی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ "إِفْشَاءُ السَّلَامِ وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالضُّلُوفُ بِالْأَيْدِي وَالنَّاسُ بِرَبِّهِمْ" ① سب سے پہلی چیز افشاء السلام ہے۔ یعنی مخلوق کو سلام کرنا ہے۔ اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اتنی بلندی کہ اللہ کے ہاں جو رتبہ ہوگا اسے اللہ جانے یا بندہ آخرت میں جانے گا۔ دنیا میں یہ ہے کہ کثرتِ سلام سے لوگوں کے دلوں میں عزت و وقار پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز فرمائی: "إِطْعَامُ الطَّعَامِ....." حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔ اس میں مسکین، غریب، سائل، مسافر، مہمان سبھی آتے ہیں۔ کھانا کھانا سب کے لئے عام ہے۔ یعنی حقوقِ قائم کر دیئے گویا یہ فرمایا گیا کہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ خواہ کوئی سائل بن کر آئے مہمان بن کر آئے یا ان میں سے کوئی نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ فلاں حاجت مند ہے۔ از خود آپ اس کو کھانا کھلائیں۔ اس سے بھی درجات بلند ہوتے ہیں۔

تیسری چیز رات کو نماز پڑھنا۔ جب کہ دنیا پڑی سو رہی ہو۔ اس لئے کہ یہ نماز انہماکیِ خلوص کی ہوگی۔ نہ اس میں نام و نمود کا جذبہ ہوگا نہ ریاء و شہرت پسندی کا جذبہ ہوگا نہ لوگوں کو دکھلاوے کے لئے ہوگی۔ دکھلاوے بھی کس کو؟ سب تو سو رہے ہیں، لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔ اس وقت جو نماز پڑھتا ہے تو بجز اس کے کہ اللہ ہی کی محبت اس کو اٹھا کر چمکائے اور کچھ نہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ جس کو بھی جو کچھ ملا ہے وہ رات کی نماز سے ملا ہے۔ دنیا بھی ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ آخرت ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَخْلاً وَأَقْوَمُ قِيلاً﴾ ② سکون و آرام کا وقت وہ رات ہی کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ چہرہ آدابِ صالحین میں سے ہے کیونکہ دن میں ریاء کا کاری اور دکھلاوے کا وہم ہو سکتا ہے۔ رات کی نماز میں دکھلاوے اور ریاء کا کوئی دخل نہیں۔ غرض جس کو جو ملا وہ رات کی نماز سے ملا۔

حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ کو ہنسی آتی ہیں جیسی ہماری اس کی شان کے مناسب ہے۔ یہ ایسی ہنسی نہیں جیسے ہم اور آپ ہنستے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جسم سے پاک ہے مگر ہماری جسمانی ہنسی کی حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خوشی پیدا ہو جب ہنسی آتی ہے۔ غم دل میں بھرا ہوا ہو تو کون ہنسا کرتا ہے۔ تو رونا غم کی اور ہنسا خوشی کی علامت ہے۔ غرض خوشی ایک کیفیت ہے۔ اسے ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے ہنسی رکھ دی چونکہ ہمارے پاس بدن ہے۔ تو جب اندر خوشی ہے تو باہر بدن پر ہنسی آتی ہے۔ حق تعالیٰ چونکہ بدن و صورت سے پاک ہیں۔ اس لئے جب اس کو بیان کریں گے تو کہیں گے، ہنسی درست ہے مگر ہنسی کا وہ مطلب نہیں ہوگا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

تو حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ ایک میدانِ حج میں جب بٹکے سر، ٹکے پاؤں، گرد پڑا ہوا، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خوشبو اور نہ زینت اور لٹیک لٹیک کہتے ہوئے بندے پھر

① الصحيح للبخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة ج: ۱۹ ص: ۲۵۲ رقم: ۵۷۶۷.

② پارہ ۲۹، سورۃ المزمل، الآیہ ۶.

رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کو اس موقع پر ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کو ان کے گھروں سے نکال کر لائی ہے۔ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑا۔ آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح سے بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ یہ میری محبت میں گھر و بار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں کریم ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ گھر بار چھوڑ دیں اور میں توجہ نہ کروں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی تو خوش ہو کر مغفرت فرماتے ہیں۔ اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری ہنسی کب آتی ہے؟ جب ملکہِ نگہبر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کے آ رہے ہیں کہ صفِ اول میں جگہ ملے۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے گا یا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں، یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہو جائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہو کر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

اور تیسرا موقع کون سا ہے؟ فرمایا گیا کہ خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔ اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تجھ پڑھوں۔ اس نے بیوی کے منہ کے اوپر پانی کا چھینٹا مارا وہ ہڑ بڑا کے انھی اس نے کہا کیا معصیت آئی ہے۔ خاوند نے کہا دو رکعت نفل پڑھ لے تجھ کا وقت ہے حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے۔ آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی ایک دم گھبرا کے اٹھی کہ بارش تو نہیں آگئی۔ خاوند نے کہا۔ بارش تو نہیں مگر دو رکعت پڑھ لے تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکر یہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی۔ اس نے بھی کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھیں یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑ بڑا کے اٹھا تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ کی انتہائی رضا کا وقت ہے۔ اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔

تو یہ جو فرمایا گیا کہ: ﴿وَالَّذِينَ يَسْتُنُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا﴾ ① کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ رکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو میں بڑا عابد زاہد ہوں۔ کسی کو دکھلانے کے لئے یہ نہیں اٹھا۔ یہ صرف مجھے دکھلانے اور میری رضا کیلئے اٹھا ہے۔ میں کریم ہوں۔ میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔ اب گویا تین باتیں ہوئیں گھر سے نکلو تو تواضع کی چال چلو، توں ہو تو سلامتی کا کلمہ ہو، بڑے کلمات نہ ہوں، جاہلانہ باتیں نہ ہوں اور رات گزارو تنہائی میں جب کہ کسی انسان سے سابقہ نہیں، تو جو روقیام اور اللہ کے ذکر و اخلاص کرو۔

رحمن کے بندوں کی زبان سے عبادت ... یہ تو عمل ہے کہ قیام کر لیا، سجدہ کر لیا اور قلب کے جذبات کیا ہونے چاہئیں؟ ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ﴾ ① دل میں خوف بھرا ہوا ہو، زبان پر اس کو ادا کرے اور یہ دعا کرے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب ہٹا دے اس کو ہمارے سے دور رکھ۔ ﴿إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ② اس لئے کہ یہ عذاب ٹھکے کا بار ہے۔ جب لٹک جائے گا تو اس کا جدا ہونا مشکل ہوگا۔ کسی کے بس میں نہیں ہوگا کہ اس عذاب کو دور کرے۔ اللہ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ آخرت تو آخرت دنیا میں بھی حق تعالیٰ اگر کسی کو عذاباً جلا کر دیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں ملتی۔ جب تک اللہ ہی پناہ نہ دے کسی تو مگھیرے تو چاروں طرف سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے اللہ ہی پناہ دے اور مخرج پیدا کر دے اور آخرت میں تو اسباب کا ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو سارا کارخانہ مستحب الاسباب کا ہے۔ اس لئے بڑا ڈر وہاں کا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اگر آدمی جلا سو جائے تو کم سے کم خیال تو باندھ لے گا کہ شاید کل کو چھٹکارا ہو جائے، شاید پرسوں کو وہاں تو خیال پر بھی پابندی ہوگی کہ راحت کا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو انتہائی قید و بند ہے کہ دل بھی گرفتار، زبان بھی گرفتار، ہاتھ پیر بھی گرفتار کوئی پناہ کی جگہ نہیں یہ ہے عذاب جہنم۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم ایک تو بدن سے عمل کرو۔ یعنی تجوید اور قیام کرو اور ایک زبان سے یہ دعا پڑھو۔ ﴿رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ ③

غرض پہلے قدموں کو لینا کہ انہیں ٹھیک ڈالو کہ چال درست ہو۔ پھر بدن کو لینا کہ سجدے اور قیام میں لگو۔ پھر زبان کو لینا کہ سلامتی کی بات کرو۔ اللہ سے دعائیں کرو ﴿إِنَّهَا مَسَاءَةٌ مُّسْتَقَرَّةٌ وَمُقَامًا﴾ ④ اس لئے کہ جہنم جسے کہتے ہیں وہ بدترین ٹھکانا ہے اللہ اس سے پناہ دے اور نجات عطا فرما دے۔ اب گویا قول، بدن اور قدم کی سب عبادتیں آگئیں۔

مالیات کے سلسلہ میں رحمن کے بندوں کی شان اب اس سے آگے انسان کے وسائل اور اسباب ہیں جن کو مالیات کہتے ہیں۔ نقد، سامان، گھریلو سب اموال کہلاتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا سامان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ جان اور بدن سے عبادت کریں مال سے نہ کریں، مال اسی کی چیز ہے اس نے ہمیں دیا۔ یہ اس کا فضل ہے مگر اصل مالک وہ ہے۔ تو فرمایا جب بدن سے فارغ ہو گئے۔ بدن کا، قدموں کا، زبان، ہاتھ، پیر اور سونے جانے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا۔ اب ایک چیز رہ جاتی ہے جو مالیات ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ ⑤ رخصت کے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۶۵۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۶۵۔

③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۶۵۔ ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۶۶۔

⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۶۷۔

بندوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ ان کو مال و دولت دے تو دو اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ تو بخل نہیں کہ ایک پائی بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلے نہ فضول خرچ کریں کہ بے جا اپنی دولت خرچ کر کے محض اپنے نفس کی راحتوں میں گنوا دیں۔ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ اسراف کریں نہ تقیر کریں۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں۔ ”تَقْفِيْرُ اِمْسَاكٍ“ کو کہتے ہیں۔ جس طرح اور جگہ فرمایا گیا ﴿وَلَا تُجْعَلْ لَكَ مَغْلُوْلَةٌ اِلٰى غُنٰكٍ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ ① نہ تو اپنے ہاتھ کو اتنے سکیڑو کہ تہہ راہ تھو موٹھے کو لگ جائے کہ دینے کے لئے کچھ نہیں اور نہ اتنا پھیلاؤ کہ جو کچھ ہے سب دے ڈالو کل کو بھیک مانگنے لگو۔ دونوں چیزیں ممنوع ہیں۔ درمیانی چال یہ ہے کہ وہ بھی اور نہ بھی دو۔ یعنی یہ پہچان کر کہاں دینا جائز ہے کہاں ناجائز ہے۔ کہاں موزوں ہے کہاں ناموزوں ہے کہاں دینا حق ہے۔ کہاں دینا ناحق ہے۔ لہذا واجب کھیل قماشے میں مت دو۔ وہاں بخل بن جاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اگر عمل خیر ہو یہاں دینا بہتر ہے جب آدمی اعتدال کے ساتھ خرچ کرے گا تو وہ دو معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کہاں خرچ کروں کہاں نہ کروں؟

اسلام کا اصول ہی اعتدال ہے، عمل میں بھی اعتدال ہو۔ چنانچہ یہ اسراف ہے کہ آدمی نفس پڑھنے پر آئے تو ساری رات پڑھتا رہے اور جب چھوڑ کے بھاگے تو فرضوں کی بھی خیر نہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں، عبادت کرے، نفل پڑھے۔ مگر اس طرح کہ پھر عمر بھر اس کو نبھائے۔ اسی کو فرمایا گیا: ”خَيْرُ الْاُمُوْرِ مَا دَيْنِمَ عَلَيْهِ“ ② آدمی کا بہترین عمل وہ ہے، جس پر وہ ہنگامی کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ ”نہ دوز کے چلے نہ کھڑے گرنے“ چلے تو آدمیوں کی طرح چلے۔ نہ دوزے نہ بالکل ضعیف بن جائے سچ کی چال چلے۔ اسی کو فرمایا گیا کہ نفل و تلاوت، ذکر کرنے میں اعتدال ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا بی چاہتا ہے کہ ایک قرآن روز ختم کیا کروں؟ فرمایا: ہرگز نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا کم کرو، عرض کیا: یا رسول اللہ! دو دن میں ایک ختم کر لیا کروں گا؟ فرمایا: نہیں! یہ نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ دس پارے روز پڑھوں اور ہر تیسرے دن ختم کروں؟ فرمایا: نہیں! نبھ نہیں سکے گا۔ پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے زیادہ خوشی سے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ مگر جب اصرار دیکھا تو فرمایا: اچھا۔ عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب میرا بڑا ہا پے کا زمانہ آیا۔ اب مجھے قہر ہو گئی کہ پانچ پارے روز بھی نہیں پڑھ سکتا تھا تو میں کہتا تھا کہ اگر میں روز کا ایک قرآن شریف شروع کر دیتا۔ تو چھوڑتے بن پڑتی اور محدودی اختیار کرتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی عجیب بات فرمائی تھی۔ کسی پاک نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی منشاء نہیں تھا کہ پانچ پارے روزانہ پڑھوں مقصد نبھانا تھا۔ اب ان پانچ کا نبھنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے آدمی کا ہاتھ تھکے۔ جو نبھ سکے۔ ③

① ہذا ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ ۲۹، ② الحدیث أخرجه الامام القرطبي ولفظه: كان احب العمل الي رسول

الله صلى الله عليه وسلم ما ديم عليه، كتاب الادب، باب ما جاء في الفصاحة، ج: ۱، ص: ۷۸، رقم: ۲۷۸۳.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب بيان تفاضل الاسلام... ج: ۱، ص: ۱۴۷.

حضرت ائمہ سلمہ رضی اللہ عنہما جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زہد و مطہرہ ہیں، یہ مسجد نبوی میں عبادت کیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے دیکھا کہ چھت میں ایک ریڑھانک۔ یہی ہے۔ فرمایا: یہ ریڑھانکی ہے؟ عرض کیا گیا کہ ائمہ سلمہ رضی اللہ عنہما عبادت کرتی ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتیں، اونگھ آئے نکلتی ہے تو ری کا سہارا لے کر بیٹھتی ہیں، پھر عبادت کرنے لگتی ہیں۔ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے پڑ کے سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو شت ہو۔ پھر اٹھ کر دوبارہ شروع کرو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ نیند آ رہی ہے، اونگھ آ رہی ہے۔ کہیں ری کی آڑ، کہیں دیوار کی آڑ۔ اس قطع اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ اتنا کام کرو جتنا نیند جائے۔ تو اقتصاداً یعنی عیش میں مہاندہ روی یہ معتبر ہے۔ خواہ جان کے خرچ کرنے کا عمل ہو یا ماں کے خرچ کرنے کا، اعتدال ہونا چاہئے۔

رحمن کے بندوں کی قلبی عبادت..... یہاں تک گویا اعمال آگئے۔ چاہ ایسی ہو، سلام کرنا ایسا ہو وغیرہ۔ یہ گویا ہاتھ، پیر اور زبان کی عبادت آگئی۔ آگے قلب کی عبادت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مبداء اور معاد کے درمیان میں جو زندگی گزار دو تو دنیا کیسا ہونا چاہئے۔ دل کی عبادت کیا ہو؟ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ ① رحمن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو پکاریں تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، کسی کو ساجھی نہ پھیرائیں، نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں۔ ذات بھی اس کی کہتا ہے کہ اس جیب کوئی نہیں۔ صفات و کمالات بھی اس کے کہتا ہیں کہ کوئی اس جیب نہیں۔ افعال میں بھی وہ کہتا ہے کہ کوئی اس جیب نہیں۔

ذات لامحدود ہے مگر اس کی حد نہیں اس کے سوا جو بھی ہے اس کی ایک حد ہے۔ سب سے بڑی مخلوق انسان ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ اریزہ مگر کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک حد میں ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔ آپ اپنی حد میں ہیں اس سے باہر نہیں۔ میں اپنی حد میں ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جہاں جاؤ وہ موجود، کہیں پہنچ جاؤ وہ موجود ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور ان کی تہوں میں گھس جاؤ تب اللہ موجود ہے، اس کے وجود کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو اللہ کے سوا کون ہے کہ اس کے وجود کی حد نہ ہو۔ جسے دیکھو اس کی ایک حد ہے۔ پہاڑ ہیں مگر کتنے بڑے ہیں، مگر ایک حد میں ہیں۔ سمندر ہیں ان کی ایک حد ہے۔ جہاں کنارہ آگیا سمندر ختم ہو گیا آگے زمین شروع ہو گئی۔ یہ نہیں کہ سمندر ہر جگہ موجود، آسمانوں، زمینوں، فضا میں بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے اپنے دائرے کے اندر ہے۔ زمین اپنے دائرے میں ایک حد میں ہے۔ حد سے آگے کچھ نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس کی کہیں حد نہیں ہے کسی عالم میں پہنچو اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس جیسی دوسری ذات نہیں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

اسی طرح اس کی صفات بھی کہتا ہیں۔ مثلاً: اس کی صفت مہم ہے۔ آپ کا علم ہوگا کہ سو مسئلے معلوم ہوں گے، ہزار ہوں گے، دس ہزار معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد پھر جہالت آگے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اللہ کی ذات کا علم لامحدود ہے کوئی ذرہ نہیں ہوتا کہ اسے علم نہ ہو۔ کوئی پتہ نہیں حرکت کرے گا کہ اس کے علم میں نہ ہو۔ آپ کی اور ہر رقی قدرت

ایک حد میں ہے۔ ہم یہ لاؤ ڈاکٹر اٹھالیں گے، جائے نماز تہہ کر کے اٹھالیں گے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ مسجد کو اٹھا لو۔ آپ ہم کہہ دیں گے کہ یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ایک جن مسجد کو اٹھالے گا لیکن اس کو اگر کہا جائے کہ ساری زمین کو اٹھا لے وہ کہے گا میرے قبضے میں نہیں۔ مگر علیہم السلام زمین کا ایک ٹکڑا اٹھا کے پھینک دیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کی قوم کی ہستیاں الٹ دیں۔ لیکن ان سے کہا جائے کہ آسمانوں کو پلٹ دو۔ وہ کہیں گے میری قدرت ہی نہیں۔ غرض بڑے سے بڑے طاقت والے کی طاقت کی ایک حد ہے۔ مگر اللہ کی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے، قدرت، علم، سماعت، بصارت ہماری صفات اس کی ایسی ہیں۔

ایسے ہی وہ اپنے افعال میں بھی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ماں کے پیٹ میں بچے کو بنا دیتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس نے چاند، سورج بنائے ہمارے آپ کے بس میں نہیں ہے۔ ساری زمین کے حکماء و پلین تو چاند تو بڑا اونچا ہے زمین کا ایک ذرہ بنا دیں۔ جس میں وہ خاستیں ہوں جو اللہ کی زمین میں ہیں۔ زمین کے ٹکڑوں کو جو تو ذکر کچھ بنالیں گے لیکن خود زمین کی ایجاد کریں ایک ذرہ بھی نہیں کر سکتے۔ ساری دنیا کے فلاسفر جمع ہو جائیں سورج کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے اور اللہ نے بنایا ہے۔ معلوم ہوا اس جیسا فعل کوئی نہیں کر سکتا۔

تو ذات، صفات اور افعال سب کچھ یکتا اور بے مثل ہے۔ اس لئے جب جنکس گے تو اس کے آگے جھکیں گے۔ اگر اس کا کوئی شریک اور صاحبی ٹھہرائیں تو یہ کیسے درست ہوگا؟ کیوں کہ جب اس کی ذات و صفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں تو عبادت میں کون شریک ہو سکتا ہے؟ سب عبادتیں اسی کے لئے ہوں گی۔ سجدہ، رکوع اور فریاد اسی کے سامنے کریں گے۔ رزق، مال و اس سے ماٹکیں گے اس کی ذات کے سوا دینے والا کوئی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام اتنے مقدس بندے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ افضل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ساری کائنات سے آپ برتر ہیں۔ لیکن عہدیت کا یہ حال ہے کہ آپ سے یہ فرمایا گیا کہ تم خود اپنی زبان سے کہو ﴿قُلْ اِنِّیْ لَا اَمْلِیْکُمْ لَحْمٌ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ ”اے پیغمبر! اعلان کر دو کہ میں تمہارے نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا“۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کر کے فرمایا: ”یَا فَاطِمَةُ بَسْمِیْ مُحَمَّدٍ لَا اَغْنِیْ عَنْکَ مِنْ اللّٰہِ شَیْئًا“ ① ”اے فاطمہ! نبی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے قبضے میں کچھ نہیں ہے تیرے اندر ایمان اور عمل ہوگا تو نجات پا جائے گی میں نجات نہیں دلا سکوں گا۔ نہ دنیا میرے قبضے میں ہے نہ آخرت“۔ جب سید الاولین والآخرین یہ فرمائیں کہ میرے بس میں کچھ نہیں تو میں آپ کیا چیز ہیں؟ پوری مخلوق کیا چیز ہے؟ جو اس سے نمٹ لے۔ ہاں کل کسی کے بس میں کچھ نہیں۔ تو اسی کو مانو، جس کے بس میں سب کچھ ہے وہ

① الصحيح للبخاری، کتاب الوصایا، باب هل يدخل النساء والولد فی الاقارب ج: ۹ ص: ۲۹۱۔ حدیث صحیح ہے۔

دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن النسائی ج: ۸ ص: ۳۱۸ رقم: ۳۷۱۸۔

اللہ کی ذات ہے۔

ہارون الرشید کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت قحط پڑا۔ ایک دیہاتی آبا کہ میں بھی جا کر بادشاہ سے کچھ مانگوں۔ تاکہ میری اصلاح حال ہو۔ بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ میں جا کر بادشاہ سے ہوں کہ اپنے خزانے سے مجھے کچھ دے۔ جب آیا تو دیکھا کہ ہارون الرشید نماز میں مصروف ہے۔ تو چوب دار نے کہا ذرا ٹھہر جا۔ یہ دیہاتی بے چارہ ٹھہر گیا۔ ہارون الرشید جب سلام پھیر چکے اور دعا مانگ چکے تو ہارون الرشید نے پوچھا کہ چودھری صاحب کیوں آئے؟

چودھری صاحب نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیوں آیا پہلے یہ بتا کہ تو کر کیا رہا تھا یہ کیا بات تھی۔ اس نے کہا میں اپنے اللہ کے آگے جھک رہا تھا۔ اس نے کہا اچھا تیرے سے بھی کوئی بڑا ہے؟ اس نے کہا میرے سے بڑے اللہ میاں ہیں۔ میں ان سے مانگتا ہوں۔ بس دیہاتی وہیں سے لوٹا کہ مجھے تجھ سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے کیوں نہ مانگوں، جس سے تو مانگ رہا ہے۔ جب تو بھی اس کا محتاج ہے تو میں محتاج کا محتاج کیوں بنوں؟ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی سب کے کام کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو دے سکتا ہے نہ نہ چھین سکتا ہے۔ وہی دیتا ہے، اسی کو چھیننے کی قدرت ہے۔ آدمی کو اگر کچھ لینا ہے تو اپنے معاملے کو اللہ میاں سے درست کرے سب کچھ مل جائے گا۔ ان سے بگاڑی تو ملا لایا بھی جھپٹن جائے گا۔

ہارون الرشید ایک دفعہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہی کا جوش جو آیا تو ہارون الرشید نے کہا آج جس کا جوشی چاہے مانگے اسے وہی دوں گا۔ بس لوگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دو۔ اس نے کہا دے دیا کسی نے کہا مجھے فلاں صوبے کی گورنری دے دیجئے اس نے کہا دے دی۔ کسی نے کہا، مجھے داسرائے بنا دیجئے۔ اس نے کہا بنا دیا۔ کسی نے کہا مجھے قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دیا۔ جو جس نے مانگا۔ ہارون نے حکم دیا کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ ہارون الرشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پچھلا حمل رکھی تھی تو ہارون نے گردن پھیر کر باندی سے کہا کہ تو نے کچھ نہیں مانگا۔ سب درباری مانگ رہے ہیں۔ باندی نے کہا ان بے وقوفوں سے منہ لیجئے۔ بعد میں میں بھی مانگوں گی۔ اس نے کہا۔ اچھا یہ میرے وزراء، امراء سب بے وقوف، پاگل اور احمق ہیں۔

ہارون الرشید کو برا معلوم ہوا کہ اس نے میرے سارے وزراء، امراء کو پاگل بنا دیا۔ ان امراء کو بھی برا لگا۔ مگر امیر المومنین کی باندی تھی اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ پہلے یہ احمق لے لیں۔ اس کے بعد میں بھی آپ سے مانگوں گی۔ جب سب دربار والوں کی مراویں پوری ہو گئیں۔ ہارون نے کہا اب مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے کہا، جو کچھ میں مانگوں گی آپ دے سکیں گے۔ ہاں میں دوں گا۔ میرا اعلان ہے ضرور دوں گا۔ اس نے ہارون الرشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ جب آپ میرے ہو گئے تو ملک، قلعے، دولت اور خزانے سبھی کچھ میرے ہیں۔ یہ سارے بے وقوف تھے۔ اس لئے کہ جس نے خزانہ لیا۔ اسے خزانہ

مل گیا آگے کچھ بھی نہیں قلہ مانگا، قلہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں کسی نے گورنری مانگی، گورنر بن گیا باقی کچھ نہیں۔ تو انہوں نے ایک ایک چیز مانگی اور میں نے وہ چیز مانگی کہ ساری چیزیں میرے قبضے میں آ جائیں۔

یہی شانِ اہلِ اللہ اور اہلِ دنیا کی ہے۔ مثلاً اہلِ دنیا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! مجھ کو لکھ پٹی بنا دیجئے یا کروڑ پتی بنا دیجئے۔ تو وہ بنا دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے جاگیر دے دیجئے۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ: ۱۔ دی۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ آپ میرے ہو جائیے تو سب کچھ میرے قبضے میں ہے۔ وہ کروڑ پتی بھی ہے، لکھ پتی بھی ہے۔ تو رانٹس مندی کی بات یہ ہے کہ جڑ اور بنیاد کو آدمی پکڑے۔

اس لئے آدمی کو اگر مانگنا چاہئے تو اللہ سے مانگے۔ اس سے کیا مانگے جو خود مانگنے والا اور محتاج ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ ① رحمن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو تنہا اللہ کی ذات کو پکارتے ہیں کسی کو بھی، سبھی نہیں سمجھتے ماس نئے کہ اللہ کا کوئی اور مددگار تو نہیں ہے۔ جب انھوں نے آسمان بنایا تھا تو کسی سے کہا تھا کہ اتنا کام تم کرو، اتنا کام میں کر لوں گا۔ جب پیٹ میں بچے کو بنایا تھا تو کیا کسی سے مدد مانگی تھی کہ آ تو بھی شریک ہو جا۔ مجھ اکیلے سے نہیں بننا، تو شریک ہو جائے گا تو بن جائے گا۔ جب کسی کام کی تخلیق میں کوئی شریک نہیں ہے تو عبادت میں کیسے شریک ہو گئے؟ وہ تنہا بناتا ہے تو تنہا وہ مہموم بھی ہو گا۔ ﴿إِنَّا نَاكَ نَغْبُذُ وَإِنَّا نَاكَ نَسْتَعِينُ﴾ ② ”تنہا آپ ہی کی عبادت کریں گے۔ تنہا آپ ہی سے مدد مانگیں گے۔“ مسلم کو اللہ نے یہ شان دی ہے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ یہ ذلت پیش کرے گا تو اللہ کے سامنے کرے گا۔ بندہ بندہ کے آگے ذلیل ہونے سکے لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ اسی واسطے شریعت نے بھیک مانگنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ کوئی کسی کے آگے بھیک نہ مانگے۔ اس لئے کہ مانگنے سے زیادہ ذلت کسی چیز میں نہیں ہے۔ بھیک مانگنا اپنے کو بے آبرو کرنا ہے۔ بندہ کو حق نہیں ہے کہ اپنے جیسے بندے کے آگے بے آبرو بنے۔

ایک دوستی میں مانگنا ہے۔ جیسے آپ کسی سے بے تکلفی میں یوں کہیں کہ بھئی! یہ چیز مجھے دے دو۔ یہ تعلق کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هَٰؤُلَاءِ تَأْكُلُوا مِنْ بَيْتُوكُمْ أَوْ يَبُوتُ آبَاؤُكُمْ أَوْ يَبُوتُ أَبْنَاؤُكُمْ أَوْ يَبُوتُ أَخَوَاتُكُمْ أَوْ يَبُوتُ أَخَوَاتُكُمْ أَوْ يَبُوتُ أَخَوَاتُكُمْ أَوْ يَبُوتُ أَخَوَاتُكُمْ﴾ ③ فرماتے ہیں اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھروں میں جس طرح تمہارا جی چاہے کھا سکتے ہو۔ ماں کے گھر سے مانگ کے کھا سکتے ہو۔ نہ مانگنا تکبر اور مانگنا تعلق کی علامت ہو گا۔ باپ، حقیقی بھائی، بہن، چچ، پھوپھی، ماموں، خال یا ایسے گھروں سے جن کی سنجیدہ تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھر سے بھی مانگ کر کھا سکتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ ان سے مانگ کر لو گے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ جب انہوں نے اپنا سمجھا، جب مانگا، کوئی دنیا کے آگے تو

① پارہ ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیہ ۶۸، ② سورۃ الفلق، الآیہ ۵، ③ پارہ ۱۸، سورۃ النور، الآیہ ۶۱۔

یہ مانگنا نہیں پھرتا۔ اس طرح بے تکلفی سے اگر کوئی مانگ لے تو یہ بجائے سبے آبروئی کے آبرو کا ذریعہ بنتا ہے اور تعلق کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک ہے بھیک مانگنا یعنی محتاج و مفلس بن کے کسی کے آگے آنا کہ تم ہمارا کام پورا کرو۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس ذلت کے اظہار سے ممانعت کی گئی ہے۔ وقار کے ساتھ مانگنا جو ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال سوال میں چونکہ ذلت تھی کہ ایسی ذلت صرف اللہ کے آگے اختیار کی جاسکتی ہے، غیر کے آگے نہیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے اور مانگو تو صرف خدا سے مانگو۔ فریاد اس سے کرو۔ اولاد، رزق، صحت سب کچھ اس سے مانگو۔

اس لئے کہ ہر چیز کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں۔ اس لئے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ ① رُحْمَن کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کو شریک نہیں مانتے۔ تنہا اسی کو پکارتے ہیں۔

حقوق العباد کے بارے میں رُحْمَن کے بندوں کے طریقِ عمل..... تو یہاں تک چال ڈھال، زبان، ہاتھ، پیر، مال و دولت اور روح کی سب عبادت آگئی۔ اب آگے دوسرے کے ساتھ معاملہ، دوسرے کے حقوق کو بتلایا گیا اس بارے میں رُحْمَن کے بندوں کی کیا شان ہے؟ ﴿وَلَا يَفْضُلُونَ النَّفْسَ الْغَنِیَّ حَرِّمَ اللَّهِ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ② ”رُحْمَن کے بندے وہ ہیں جو ناحق قتل نہیں کرتے“ کہ کسی کی جان لے لی، کسی کی گردن اڑادی۔ یہ رُحْمَن کے بندوں کی شان نہیں ہے۔ یہ مُسْتَقِی و مُتَجَارِح کی شان ہے کہ دوسروں کو ایذا پہنچائیں۔ اپنی بڑائی جتکانے کے لئے دوسروں کی حقارت چاہیں معاملات میں دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ یہ متکبروں کی شان ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کا انجام برا ہو جاتا ہے۔ جو دوسروں کی حقیر کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ ہی حکم دیں کہ قتل کرو، پھر قتل کرنا فرض ہے جیسے قصاص میں قتل کریں۔ کسی نے ناحق قتل کیا تھا تو سزا میں اس کا قتل کرنا یہ جائز ہے۔ یا کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے۔ اس کا قتل کروینا جائز ہے یا اسی طرح سے کوئی زنا کار ہو پھروں سے سنگسار کر دینا۔ یہ اس کا قتل کر دینا ہے یہ بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے پھروں سے قتل کیا جائے۔ غرض زنا کاری یا قاتلوں کو دنیا سے پاک کرنے کے لئے یا مرتدین جو دین کی کوئی اہمیت نہ سمجھیں اور اپنے دین کو بدل ڈالیں۔ ایسے لوگوں سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے قتل کرنا جائز ہے یہ قتل حق ہے۔ ناحق وہ قتل ہے کہ قتل کا کوئی استحقاق نہیں تھا اور چار پیسے کی خاطر گردن مار دی یا ڈاکہ ڈالنا تھا جس کے قتل کر دیا۔ یا جہد بآ یا بڑائی شروع ہوئی۔ ادھر سے بھی چمری نکل آئی، ادھر سے بھی نکل آئی۔ قتل و قمار شروع ہو گیا اس کا کوئی حق نہیں۔ تو یہی فرمایا گیا جن کی نسبت رُحْمَن کی طرف ہوگی اور وہ رحمانی ہوں گے وہ یہ کام نہیں کریں گے۔ یہ فساق و فجار کا کام ہے کہ وہ

بیلوں کی طرح پھرتے ہیں۔ بیل کا کام یہی ہے کہ جو سامنے آ گیا اس کے سینک مار دیا یا شیر کے کئے آگے کوئی گیا تو وہ دانت کھول کر چھاڑ کر کھانے کے لئے جا پڑا۔ غرض یہ بہانہ کام ہے۔ انسانوں کا کام نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ مومن کون ہے؟ مومن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا: "الْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ غُلًى وَنَسَاتِهِمْ وَأَمْنُوا لَهُمْ" ① مومن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جان، اپنے مال اور اپنی آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ یہ مومن ہے کہ یہ ہماری جان نہیں لے سکتا۔ یہ ہمارے مال کو ضائع نہیں کر سکتا اور ہماری آبرو کو خراب نہیں کر سکتا۔ لوگوں کو اتنا اطمینان پیدا ہو جائے۔ پھر سمجھا جائے گا کہ یہ مومن ہے۔

پھر "أَمِنَهُ النَّاسُ" میں لفظ بھی عام ہے کہ لوگ مطمئن ہوں۔ خواہ مسلم یا غیر مسلم ہوں۔ ہر ایک کو اطمینان ہو جائے کہ بھی ایسا مومن ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ ماروھاڑ کر کا پھرے یا آبروریزیوں کرتا پھرے۔ دنیا اس سے مطمئن رہے کہ یہ صالح آدمی ہے۔ اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ کسی سے ٹکلتے رہیں کہ بھی کہیں یہ چھری نہ مار دے۔ یہ مومن کیا یہ اچھا خاصا بیل ہے، بیل جب سڑک پر چلتا ہے تو آپ دامن بچا کے چلتے ہیں کہ کہیں پیشاب نہ کر دے کہ کوئی چیخٹ نہ آ جائے، کہیں سینک نہ مار دے تو اگر مومن سے بھی کوئی یوں بچتے ٹکے کہ بھی جیب بچاؤ کہیں جیب نہ کترے، کہیں جیب سے فون نہیں پھینک دے گا کہ لے جائے تو یہ مومن کیا ہوا۔ مومن کا یہ کام نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا کہ: رخص کے بندے وہ ہیں جو نفس انسانی کے درپے نہیں ہوتے۔ قتل و غارت کرنے نہیں پھرتے۔ ہاں خدا کا حکم آ جائے حکم کی تعمیل کے لئے قصاص لے لیں تو قتل کر دیں۔ ویسے ان کا کام نہیں۔ ﴿وَلَا يَزْنُونَ﴾ ② آبروریزی نہیں کرتے۔ سب سے بڑی آبروریزی زنا کاری ہے کہ ایک عورت کی آبرو ختم کر دی اور اس درجے ختم کر دی کہ عمر بھر کے لئے بے آبرو ہو گئی۔ اس سے اگر بچہ پیدا ہوا وہ ولد الزنا ہوگا۔ تو پوری برادری کہے گی کہ یہ حرام کا بچہ ہے اس کو بچی مت دو۔ اس سے معاملہ مٹ کر۔ تو کتنا عظیم اس نے گناہ کیا کہ ایک عورت کی پوری زندگی برباد و تباہ کر دی۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور آبرو باقی نہ رہی ایسا شخص کامل گردن زدنی ہے۔

پھر آبروریزی ایک کی کی اور دامن ساری سوسائٹی سے اٹھا دیا۔ دوسروں کو جرأت ہوگی کہ وہ بھی یہ حرکت کریں تو دنیا کے اندر بد امنی پھیل گئی۔ آبرو ہاتی نہ رہی تو ایک کی آبرو جائے گی اور دوسرے کو اس نے آبروریزی کرنے کی جرأت دلائی۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ توفیق یہ نہیں ہے کہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اس کا نصف حصہ زمین میں گاڑ کر پبلک اسٹنچی ہو اور پتھر مار مار کر اسے سنگسار کیا جائے۔ ظاہر میں تو یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وحشت والی سزا ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جرم کی نوعیت کو دیکھو کہ ایک

① السنن للترمذی، باب الايمان، باب المسلم من مسلم المسلمون..... ج: ۹، ص: ۲۱۵، رقم: ۲۵۵۱۔

② پارہ: ۱۹، سورۃ الفلق، الآية: ۶۸۔

فخص کی آبرو ضائع کی۔ سوسائٹی برباد کی، دنیا سے اس نے امن اٹھا دیا۔ ایسے شخص کو تو اس سے زیادہ سزا دینی چاہئے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ: رخصن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ نہ وہ کسی کی جان گنوائے جس نے کسی کی آبرو گنوائے جس۔ دونوں کی حفاظت کرتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾ ① ”پھر بھی اگر کوئی یہ حرکت کرے گا اسے اٹام میں ڈالا جائے گا۔“

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ”اٹام“ ایک دادی اور جہنم میں جنگل ہے۔ اس میں شدید عذاب ہے کہ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے اس میں اس کا ٹھکانا بنایا جائے گا۔ ﴿يُضَعَّفُ لَهُ الْعَذَابُ﴾ ② دو گنا تکنا عذاب اس کے اوپر بڑھتا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جیسے اس نے دنیا میں آبروریزی کر کے آبرو کو تہہ وبالا کیا کہ پھر آبرو ابھر ہی نہ سکے۔ اس طرح عذاب بھی تہہ بہ تہہ ڈالا جائے گا تاکہ وہ ابھر ہی نہ سکے۔ اسے بھی وہاں امن نہیں ہوگا۔ ﴿وَيُخْلِدُ فِيهِ مَثَاقِمْ﴾ ③ اور ایک لمبی مدت تک ذلت و رسوائی کے ساتھ یہ عذاب بھگتے گا۔

توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ..... ﴿الْأَمْنُ قَابُ﴾ ④ سوائے اس کے کہ کوئی توبہ کرے، اس سے آخرت کا عذاب ٹل جائے گا۔ دنیا میں تو عذاب آگیا کہ اسے سنگسار کر دیں گے، لیکن ابھی آخرت کی توبہ باقی ہے، اگر توبہ کر لی، وہاں کا عذاب ختم ہو جائے گا: ﴿الْأَمْنُ قَابُ وَامْنٌ وَغَيْبٌ عَمَّا صَالِحًا فَاَوْفَيْكَ يَنْفِقُ﴾ ⑤ سببِ توبہ خستہ ہے ⑤ جو توبہ کرے اور توبہ کے بعد نیک راستے پر چلے گئے۔ فضول حرکتوں کو ترک بھی کر دے۔ پھر فقط گناہ معاف ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کی نیکیاں بدیوں کو بھی مٹا دیں گی اس کی نیکیاں غالب آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں سے بدل دے گا اور اس تبدیلی کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص میدانِ محشر میں حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ اسے بلائیں گے وہ بے چارہ دیا تو توبہ کر کے گیا ہوگا یا توبہ نہ کی ہوگی تو حق تعالیٰ کا فضل مستوجب ہوگا۔ اسے فرمائیں گے قریب ہو جاؤ، قریب ہوگا۔ فرمائیں گے اور قریب ہو جا۔ یہ بے چارہ لرز رہا ہے، کپکپا رہا ہے، حیثیت زردہ اور ڈر رہا ہے فرمائیں گے اور قریب ہو جا، اتنا قریب آئے گا کہ حدیث میں ہے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ یاد دلائیں گے۔ فرمائیں گے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آ رہا ہوگا کہ اب میری نجات کی کوئی صورت نہیں اور حکم ہوگا جاؤ جہنم میں۔ اس لئے کہ ابھی تو چھوٹی چھوٹی برائیاں پوچھ رہے ہیں۔ جو میں نے بڑی بڑی حرکتیں کی ہیں۔ ان کی نوبت آگئی تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی باتیں تھیں ان کو پوچھا گیا ہے۔

عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی عرض کرے گا اللہ میاں! میں نے اپنی بد بختی سے ایسی حرکتیں کیں۔ بہت سی بدیاں گنوائے کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے ان سب کے بدلے ہم تجھے نیکیاں دیتے ہیں اور تیرے نامہ اعمال میں وہ لکھی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۶۸، ② پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۶۹، ③ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۶۹، ④ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۷۰، ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآية: ۷۰۔

جاتی ہیں۔ اب وہ حیران ہوگا کہ یہ تو دوسرا قصہ ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے لئے ہلاکت ہے۔ یہاں تو بدیوں کو نیکیوں سے بدلا جا رہا ہے۔ اب خود ہی کہے گا اللہ میاں وہ جو بہت بڑی بدی میں نے کی تھی وہ تو آپ نے پوچھی ہی نہیں۔ فرمائیں گے حق تعالیٰ وہ کیا تھی؟ بندہ عرض کرے گا وہ یہ تھی۔ فرمائیں گے اس کے بدلہ میں اتنی نیکیاں دیں۔ تو رحمت متوجہ ہو جائے تو ہلاکت کی کوئی صورت نہیں اور غضب خدا خواستہ متوجہ ہو جائے تو نجات کی کوئی صورت نہیں۔ آگے فرمایا ﴿وَمَنْ قَاتَلَ ضَالِحًا فَإِنَّهُ يَكُفُّ بِأَلْفِهِ مَنَابِقًا﴾ ① اس سے پہلے تو وہ گناہگاروں سے معاملہ تھا۔ اب آگے اصول بیان کیا جس سے جو بھی قصور ہو وہ توبہ درجوع کرے، توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔ مومن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے مایوس نہ ہو۔ توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اور قیامت کی بڑی علامت نمایاں ہوں گی اور دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا۔ اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوگا۔ اسی لئے اگر ستر برس سے بھی محصیت میں مبتلا ہو اور آج دل سے گئی توبہ کر لے۔ آج بھی سعائی مل جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے زنا کیا اور اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی آئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اے میرے پروردگار! فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بخش دیجئے۔ حق تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ ”اَنُفَعَلُمْ اَنْ لَّهٗ زَنًا“ یعنی یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کو کچھ کرے گا۔ فرماتے ہیں جب یہ جان گیا تو قیامت اس کے لئے یہ مغفرت مانگے۔ اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ مغفرت مانگ کر گیا اور اب پھر زنا کیا پھر ندامت ہوئی پھر آیتسا رب بھر حق تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اب بھی سمجھ گیا کہ ہے رب؟ پھر مغفرت مانگنے سے پہلے مغفرت کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو! تم معافہ کرتے کرتے تمھارے لئے اللہ بخشنے بخشنے نہیں تھکیں گے۔ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے مگر اس کی رحمت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ تو اس لئے یہ اصول فرمایا کہ ﴿وَمَنْ قَاتَلَ ضَالِحًا فَإِنَّهُ يَكُفُّ بِأَلْفِهِ مَنَابِقًا﴾ ② اس کے بعد ایک دوسرا معاملہ ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِمَرَامٍ﴾ ③ جن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب ان سے کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ جھوٹ میں نہیں پڑتے۔ زور کے معنی جھوٹی گواہی دینے کے ہیں۔ تو رحمن کے بندے جھوٹی گواہیوں اور جھوٹی مقدمہ بازیوں میں نہیں پڑتے اور جب وہ لغو اور فضول مجلسوں سے گزرتے ہیں تو سادگی اور صفائی سے گزر جاتے ہیں، ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔ کرام بن کے گزر جاتے ہیں۔

اور ان کی دعا ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ ﴿وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا﴾ ④ اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو ہماری بیویوں سے اولاد دے وہ صالح اور پاک اولاد دے اور ہمیں صالح اور

① پارہ: ۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۴۱، ② پارہ: ۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۴۱، ③ پارہ: ۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۴۲، ④ پارہ: ۹، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۴۳

پاک لوگوں سے آگے چلنے والے ہا کہ ہم خود اپنی اولاد اور بیویوں کو راہ دکھلائیں۔ اور یہ بھی فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يُخَوِّزُوا عَلَيْهَا ضَمًا وَعُمُيَانًا﴾ ① اور ان کے دلوں پر دینی سمجھ اور علم اتنا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہوں تو فوراً قلب کی سلامتی کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے ان میں سمجھ پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ان آیات کو اندھے بہروں کی طرح قبول نہیں کرتے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ شنوا دینا ہو کر قبول کرتے ہیں۔ وہ مطلب سمجھتے ہیں جو اللہ کا مطلب ہے۔

رحمن کے بندوں کی معاد..... آگے فرماتے ہیں: ﴿وَأُولَٰئِكَ يُخَوِّزُونَ الْعُرْفَةَ﴾ ② یہی وہ لوگ ہیں جن کو بالائی منزلوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بلندئیں عالم آخرت میں عطا کی جائیں گی مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ مخلقات اور باغات ان کو عطا کئے جائیں گے اور ان کو ابدی زندگی دی جائے گی گویا یہ ہمارے مقامات معد ہیں جہاں ہم کو جانا ہے اور ایک وہ جگہ ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ یعنی اللہ کی ذات بابرکات اور اس کا حکم وہ ہمارے لئے مبداء تھا جس سے ہماری ابتداء ہوئی اور یہ (جزاء عرفات) ہماری معاد ہوگی۔ اور سچ میں زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے کہ زبان، ہاتھ، پیر، روج اور مالیات کی بھی حفاظت ہو اور ہر چیز اللہ کے حکم کے مطابق صرف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر ہو اور یہ جیسی ہوگا جب شریعت سامنے آئے اس کا علم اور تعلیم ہمارے سامنے آئے، جس کے ذریعے ہم ہاتھ، پیر، قلب، دماغ، روج وغیرہ کو اس راستے پر ڈال سکیں۔

تو یہ جو ابتداء میں کہا گیا تھا کہ تین سوال ہیں اور فطرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہاں سے آئے؟ کہاں جائیں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں؟ تو جہاں سے ہم آئے؟ وہ اللہ رب العزت کی ذات بابرکات ہے جس کے ہر سے آئے۔ اس کے وجود سے ہمیں ہر تو (عکس) ملا تو ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جا، ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے۔ اور سچ میں ہم اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول اس کا فرمایا ہوا لے کر آئے ہیں۔ جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آجائیں۔ جیسی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔ اتنا آدمی اللہ صراط ہے کہ اسے راستہ ہی نہ ملے جس کے اوپر وہ چلے اور نہ یہ پتہ ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ بس یہ کہ دنیا یوں ہی چلتی آئی ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں سکون کبھی نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے اگر کوئی یوں کہے کہ بس ایسے چلتے رہیں گے نہ آخرت آئے گی نہ قیامت آئے گی نہ یہ عالم شرم ہوگا تو پھر یہ الجھن پیدا ہوگی، کہ جس چیز کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب اس عالم کی ایک ابتداء

ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ عالم کے ہر جز کی ابتداء ہے تو کل کی بھی ابتداء ہے۔ جب ابتداء ہے تو انتہا بھی ہوگی۔ گویا عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ مان اور اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ نہ مان، تو سکون پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر مان لیتا ہے تو سکون قلب پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک راستے پر لگ گیا اسے پھر طمانیت اور بشارت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس رکوع کی میں نے تفسیر کی۔ بس یہی تقریر تفسیر بھی تھی اس میں میں نے وہ جوابات عرض کئے جس سے فطرت کو تسلی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنی بھیجی ہوئی راہ پر لگا دے اور انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی ہمیں نصیب فرما دے۔ آپ کی زندگی پر ہماری زندگیوں کو مصطفیٰ بنا دے۔ ظاہر و باطن ہمارا ایسا بنا دے جس سے اللہ راضی اور خوش ہو۔ ہمارے قلوب کے اندر اطمینان اور سکون پیدا فرما دے اور انجام ہمارا بخیر فرمائے۔ آخرت ہماری درست فرمائے۔ دنیا ہماری صالح فرمائے۔ ہر مصیبت کو دفع فرمائے۔ جن مشکلات میں ہم مبتلا ہیں، ان سے رہائی نصیب فرما دے۔ (آمین)

”اللَّهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَاجْعَلْ دَعْوَتَنَا الْخَيْرَ اللَّهُمَّ رَبِّ الْعَالَمِينَ“

ادب اور اختلاف رائے

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسَبِّحُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ
أَنْفُسِنَا وَمِنْ مَنَابِتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ
إِلَى كَلَّاۤفَةِ النَّاسِ بِشَيْئٍ أَوْ نَذِيرٍ أَوْ دَاعِيٍّ إِلَيْهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. آمَنَّا بَعْدُ:

شعائر اللہ کا ادب..... بزرگان محترم! دین کے لئے ادب ایک بنیادی چیز ہے۔ جس حد تک ادب اور تہذیب
بڑھتا جائے گا۔ اسی حد تک انسان کا دین قوی ہوتا جائے گا اور جس قدر بے ادبی ستانی، جرات و جسارت اور بے
باکی بڑھتی جائے گی۔ انسان دین سے ہٹا جائے گا۔ خواہ ہم ہوں یا غیر علم ان میں شریعت نے آداب کی رعایت رکھی
ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ
وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ ① ”اے
ایمان والو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کریمہ نہ کر بلند آواز سے گفتگو نہ کرو، اپنی آوازوں کو پست
کر دو اور ایسی آواز نہ ہو کہ نبی کی آواز سے بڑھ جائے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اعمال خط ہو جائیں
گے۔ اس پر اجر مرتب ہوگا نہ ثواب۔“

حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلطی طور پر بلند آواز اور جبری انصوت تھے۔ آواز ہی اس
طرح بلند تھی کہ آہستہ بولنے تو ایسا معلوم ہوتا کہ زور سے بول رہے ہیں۔ لیکن اس آیت کے اترنے کے بعد اتنا
آہستہ بولنے لگے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سن پڑتا اور فرماتے ”مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری آواز بلند ہو جائے اور
میرے اعمال خط نہ ہو جائیں۔“ ②

اس سے مسئلہ نکل آیا کہ ادب سب سے بڑی چیز ہے۔ حقیقتاً تو ادب حق تعالیٰ شانہ کا ہے۔ عظمت والی ذات
اللہ ہی کی ہے۔ اس واسطے کہ اس کی بارگاہ میں ادب اور تواضع چاہئے۔ پھر جس جس کو اللہ سے نسبت ہوتی جائے
گی۔ اس کا ادب قائم ہوتا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم کا ادب قائم کیا گیا کہ ﴿لَا يَمْسَسُكَ إِلَّا الْمُنْظَرُونَ﴾ ③

① پاور: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآية: ۲، ② المسنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجرات، ج:

۱۲ ص: ۹۱، ③ پاور: ۲، سورۃ الرالعة، الآية: ۷۹.

اگر حالت جنابت تک پنج گلی تو تلاوت بھی ناجائز ہوگئی گویا زبان بھی پاک نہ رہی۔ یہ قرآن کا ادب سکھلایا گیا کہ اس کلام کی نسبت اللہ کی طرف ہے جس کا نام کلام اللہ ہے۔ اللہ کا ادب ضروری ہے تو یہ تو کاغذوں کا مجموعہ ہے جو حروف و نقوش لکھے ہیں یہ کلام کی علامات ہیں۔ کلام وہ ہے جس کا تکلم کیا جائے۔ بھر وہ حروف و نقوش جن کاغذات میں درج ہیں انہیں بے وضو ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا، وہ کاغذات جس جہد میں ہی لئے جائیں وہ بھی واجب التحظیم بن جاتی ہے۔ حقیقت میں یہ کلام کا ادب بتلایا گیا لیکن جو چیزیں اس کی طرف منسوب ہوتی گئیں، ان کا ادب بھی واجب ہوتا چلا گیا۔ کلام کی وجہ سے نقوش اور نقوش کی وجہ سے کاغذ اور جلد درجہ بدرجہ سب کی تعظیم ضروری پھرنی لگی۔ اگر کوئی درجہ بھی گستاخی ان میں سے کسی چیز کی کی جائے۔ تو اعمال کے ضبط و ضبط ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ بے ادبی کے ساتھ دین قائم رہ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب اللہ کا ادب واجب ہے تو بیت اللہ کا ادب بھی واجب ہو گیا۔ ”اللہ کا گھر“ یہ نسبت جب آگئی تو ادب لازم پھر۔ حالانکہ حق تعالیٰ چیز اور جسم و مکان سے بڑی ہیں۔ لیکن نسبت جب آتی ہے کہ وہ تجلیات ربانی کا مرکز ہے تو اس گھر کا ادب ضروری ہو گیا۔ جب بیت اللہ کا ادب واجب ہوا، تو جس مسجد حرام میں بیت اللہ واقع ہے وہ مسجد بھی واجب التحظیم ہوگئی اور اس درجہ بابرکت بن گئی کہ اگر ایک نماز یہاں پڑھی جائے، تو ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اس کی نسبت کی برکت ہے۔

مسجد حرام جس محل میں واقع ہے، وہ مکہ مکرمہ ہے۔ تو مکہ مکرمہ بھی واجب التحظیم ہو گیا اور اس کا ادب ضروری ہو گیا اور مکہ مکرمہ واقع حجاز میں ہے تو حجاز اور سارے عرب کا ادب واجب ہو گیا۔ حدیث میں فرمایا گیا: ”خُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْإِنْسَانِ وَنُفُصُ الْعَرَبِ مِنَ الْبَشَرِ“ ① ”عرب سے محبت کرنا ایمان اور بغض رکھنا، نفاق کی علامت ہے۔“ غرض درجہ بدرجہ سارے آداب واجب ہوتے چلے گئے۔ اگر بے ادبی اور گستاخی کسی ایک میں بھی آگئی، تو دین کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

غیر اختیاری کمالات کا ادب..... اس لئے تا ادب اور توقیر و تعظیم لازم قرار دی گئی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ”فَنُفُصُ لَمْ يَرْخَمُ صَغِيرًا وَلَمْ يُؤَفِّرْ كَبِيرًا فَلَيْسَ مِنَّا“ ② ”جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا، اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہوگا۔“ اکابر کی تعظیم و توقیر واجب قرار دی گئی اور ہم سب کی اگر اسے نہ انجاء ہو گئے، ہماری جماعت میں شہر نہیں ہوگا اور یہ توقیر، ادب عمر کی بڑائی کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی علم رکھتا ہے تو علم کی وجہ سے ادب ہوگا۔ علم کے ساتھ زہد و قناعت کے جذبات اور اخلاق رکھتا ہے، تو ان کا ادب واجب ہوگا

① المستدرک، کتاب معرفة الصحابة رضى الله عنهم، باب ذكر فضائل القبايل ج: ۱ ص: ۳۱۹، اوسدھام

نرائے ہیں: هذا حديث صحيح الاسناد ولم يعر جاء.

② السنن للترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الصبيان، ج: ۲ ص: ۵۵، اولم: ۱۸۳۴.

لیکن اگر کوئی بھی کمال نہ ہو، صرف عمر کی بڑائی ہو، اس وجہ سے بھی اس کا ادب ضروری ہوگا۔

حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بوڑھا ہونے کی وجہ سے کرے تو وہ اس سے پہلے نہیں مرے گا کہ حق تعالیٰ اس کے لئے چھوٹے پیدا کر دیں گے جو اس کی تعظیم کریں گے۔ حدیث میں فرمایا کہ جو شخص سفید داڑھی والا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے حیا آتی ہے کہ اسے خالی داہن کر دوں تو یہ اس کی داڑھی کا عند اللہ وقار ہے۔ جو شخص عمر کی بڑائی کی وجہ سے اسے حاصل ہو گیا ہے۔ اگر اس بڑائی کے تحت اور بڑائیاں بھی جمع ہو جائیں۔ علم، اخلاق تو ادب بھی بڑھتا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ہنر نہ ہو تو خلق کمال پر بھی ادب کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد ہے: ”يَوْمَ الْقَوْمِ أَقْرَأَهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ“ امامت کرنے کا حق اس کا ہے، جو سب سے صحیح قرآن پڑھنے، سب سے زیادہ قرآن کا علم ہو۔ ”فَإِنِ شَاءُوا لِيُحْيِيَ الْفِرَآءَ سَوَاءً فَاعْلَمَهُمْ بِالنَّبِيَّةِ“ ① (پھر) جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے بڑھایا جائے، اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو مسائل صلوة سے جو زیادہ واقف ہو اسے آگے بڑھاؤ۔ اگر سارے کے سارے حسین و جمیل جمع ہوں۔ فرمایا جس کا نسب اونچا ہو اسے آگے کر دو۔ تو کوئی خصوصیت مقدم کرنی چاہئے کہ مقتدیوں کو عار لاحق نہ ہو۔ اگر بڑے بڑے اہل کمال جمع ہیں اور کسی جاہل کو امامت کے لئے بڑھایا، انہیں عار لاحق ہوگا کہ کسے بڑھا دیا؟ اگر سب حسین و جمیل ہوں اور کسی اندھے بہرے کو بڑھا دیا انہیں حقارت پیدا ہوگی کہ یہ کہاں سے آگے بڑھ گیا؟

جب اور کمالات میں سب برابر ہوں پھر خوبصورتی کو آگے رکھا گیا حالانکہ یہ کوئی اختیاری کمال نہیں، خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ لیکن غیر اختیاری چیز بھی بعض اوقات خصوصیت کا سبب بن جاتی ہے۔ تقدم و تقدیم کے لئے آداب کی ضرورت ہے اور ان آداب میں بعض دفعہ نگوئی چیزیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ باوجودیکہ کہ عمر یا حسن اللہ کی دی ہوئی چیز ہے مگر اس کے باوجود فرمایا، اس کا ادب کرو۔ حاصل یہ نکلا ہر بڑھائی تعظیم کی مستحق ہے۔ خواہ وہ نگوئی ہو یا تشریف، اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔ اگر تو قیر کی گئی تو فرمایا کہ ممکن ہے تمہارے اعمال اور دین پر اثر پڑ جائے۔ نسبت کا ادب..... یہاں تک کہ نسبتوں کا ادب سکھایا گیا، یہ جو اللہ والوں کے ہاں نسبتوں کی توقیر کی جاتی ہے کہ شیخ کی عظمت کرتے ہیں۔ شیخ کی اولاد اور وطن کا بھی نسبت کی وجہ سے ادب کرتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: ”فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي مَنْ إِذَاهَا فَقَدْ أَذِنِي“ ② ”فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ جس نے اسے ستایا اس نے مجھے ستایا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی توقیر کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی توقیر کی۔ یہ توقیر شرف صحابیت کی وجہ سے نہیں سکھائی گئی، یہ تو اور صحابہ میں بھی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

① الصحيح لاسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوة، باب من احق بالامعة، ج: ۳، ص: ۲۸، رقم: ۱۰۷۸.

② الحديث أخرجه الامام مسلم في صحيحه ولفظه: برذني ما اذاها، كتاب فضائل الصحابة باب فضائل فاطمة بنت النبی علیہ الصلوة والسلام.

اوانہ ہونے کی جو نسبت ہے اسی کا ادب سکھایا گیا۔ اس لئے فرمایا کہ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے صحابہ میں داخل ہے۔ صحابیت کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی جمع ہو گئیں۔ جو اولاد رسول ہوتا ہے کہ یہ جزو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو جب قلب میں رسول کا ادب ہوگا تو اولاد رسول کا بھی ہوگا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق سنا کہ ان کی عادات میں ادب کا لحاظ بے حد ہوتا۔ اگر سادات کا کوئی نابالغہ بچہ بھی آجاتا تو سر باندہ چھوڑ کر پختی کی طرف بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ دنیا خندوم زادوں کی عزت کرتی ہے۔ یہ سارے عالم کے خندوم زادے ہیں۔ سارے عالم پر ان کی تعظیم واجب ہے۔ حالانکہ بچہ نابالغہ ہے مگر فرماتے یہ خندوم زادہ ہے۔ یہ اولاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا سبق آموز واقعہ..... ایک دفعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مرواؤ بادشہ رفیع لے گئے اور جانا آئے تھے۔ مرواؤ آباد بھی ٹھہرے، پروگرام میں حضرت نے صرف ایک دن رکھا تھا لوگوں نے اصرار کیا، مگر آپ نے انکار فرمادیا تو علماء کا طبقہ جمع ہو کر آگیا کہ ٹھہر جائیں انکار کر دینا کہ نہیں ٹھہروں گا۔ پھر بعض امراء جمع ہو کر آگئے۔ امراء نے کہا کہ جب علماء کی نسی ہو تو آپ کی کیسے مانوں؟ مرواؤ باد کے لوگوں کے دل میں ٹھن گئی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھہرو، تو ایک نے مشورہ دیا کہ ان کو ٹھہرانے کی ایک ہی صورت ہے۔ فلاں دفتر میں ایک کلرک زکا چودہ چودہ سال کا ہے، اسے بلا لاؤ، وہ ٹھہرائے گا۔ جب وہ آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ادب سے اپنی مسند چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جب تک کرمصہ نہ کیا اور اپنی جگہ پر اس کو ٹھہرایا خود مودب ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا کہ حضرت، جی چاہتا ہے کہ کچھ ٹھہر جائیں، فرمایا بہت اچھا۔ ٹھہر گئے اور اتنے ٹھہرے کہ ایک ہفتہ تک ٹھہر گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ حضرت اس وقت تک نہیں جائیں گے، جب تک وہ لڑکا نہیں کہے گا۔ تب آکر اس نے اجازت دی۔

وہ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے شیخ میاں جی نور محمد تھے چچا نانوی اعلیٰ اللہ مراد تھے اور یہ لڑکا میاں جی مرحوم کا نواسہ لگتا تھا، تو شیخ کی نسبت کا اتنا ادب تھا کہ ان کے حکم کی وجہ سے وہیں رک گئے، کسی کا تحم نہ مانا۔ یہ نسبت کا ادب تھا۔ شیخ کے بھی نہیں شیخ الشیخ کے نواسے تھے اور یہ ادب تب ہوتا ہے۔ جب اصل شیخ کا ادب دل میں ہو۔ حتیٰ کی وطن کی نسبت کن وجہ سے شیخ کے وطن کے ساتھ شریف لگاتے ہیں۔ دیوبند شریف، نانوتو شریف، مکہ شریف۔ تو وہ شریف کا لفظ تعظیم کی وجہ سے لگاتے تھے۔ نسبت کا ادب اور عظمت یہ کوئی غیر شرعی چیز نہیں۔

اہل اللہ نے نسبتوں کا اس درجہ ادب کیا ہے کہ شیخ کی اولاد اگر جاہل اور کندہ ناتراش بھی ہوتی، پھر بھی حد درجہ ادب کیا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس سنگوہی قدس اللہ سرہ جو مشائخ چشتیہ میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے پوتے ہیں شاہ ابوسعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو سلسلہ چشتیہ کے مشائخ میں سے ہیں۔ شاہ ابوسعید کا ابتدائی زمانہ بہت آزادی کا تھا۔ نہ نماز، نہ روزہ، نہ پابندی، لباس کے شوقین، ہر وقت پر تکلف پہنڈے، بس اسی میں گئے رہتے۔ نہ علم

سکینے کی طرف توجہ نہ اٹھانے کی اصلاح کی طرف، جوانی کا زمانہ تھا، رنگ رلیوں میں پڑے رہے۔ وہ ایک دن منگھوہ میں کسی گلی میں جا رہے تھے۔ بھٹکن نے نوکرہ کبانہ کا کہیں پھینکا اور سارا گردن کے کپڑوں کو لگ گیا، تو غضبناک ہو گئے اور کہا حرام زادی، بے حیاء، تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ بھٹکن تھی بوزمعی اور اس نے حضرت شیخ عبدالقدوس کا زمانہ پایا تھا تو اس نے خان کر کہا کہ کس برتے پر کڑتا ہے؟ دادا کی میراث کمانی تھی، جو آج اتنے فخر سے بولتا ہے؟ بس وہ دن تھا، اسی وقت واپس ہوئے اور گھر میں آ کر والدہ سے کہا کہ اب میں منگھوہ اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ دادا کی میراث نہ سنبھال لوں، اور پوچھا کہ اس وقت حضرت شیخ کے خلفاء میں سے کون کون سے لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ اجلاء خلفاء میں سے شیخ نظام الدین بنی ہیں۔ انہوں نے خلافت کے کربلج کا سفر کیا تو بتایا گیا کہ حج میں بڑی خانقاہ ہے۔ لاکھوں کی اصلاح اور افادہ ہو رہا ہے تو شیخ نظام الدین کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں۔ شیخ کو صاحبزادہ کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو جو پہنچنے کا دن تھا۔ اس زمانے میں موٹر کاریں تو نہ تھیں مہینہ دو مہینہ قطع مسافت کے بعد کہیں جا کر پہنچے اگرچہ صاحبزادہ جاہل ہیں نہ علم نہ ہنر اور شیخ وقت کے ہزاروں متوسل، ہزاروں مرید اور ہزاروں کو علم اور دین کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مگر اسی نسبت کے ادب کی وجہ سے کئی میل آگے جا کر استقبال کیا اور جب شیخ نکلے تو تمام بچے، امراء بچے حتیٰ کہ شاہ بچے بھی ساتھ نکلے۔ دورے دیکھا کہ صاحبزادے گھوڑے پر ڈاڑھے ہیں تو حضرت نظام الدین آگے بڑھے اور قدموں پر ہاتھ رکھا۔ صاحبزادے گھوڑے سے اترنے لگے۔ فرمایا نہیں آپ نہ اتریں، اوپر رہیں۔

اب اس شان سے صاحبزادے چلے آ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور قدموں پر شیخ نے ہاتھ رکھا ہے اور جب شیخ نے ہاتھ رکھا تو دوسری رکاب پر خود شاہ بچے نے ہاتھ رکھا۔ اس شان سے بچے آئے سہانہ داری بڑے اعلیٰ پکانے پر ہوئی تمام ملازمہ و مشائخ اور امراء کو صاحبزادہ کے احترام میں دعوتیں دیں۔ جب تین دن گزر گئے اور شیخ کا یہ عالم کہ دو دن تو بیٹھے ہیں۔ صاحبزادہ کو مسند پر بٹھ کر رکھا ہے۔ پھر پوچھا صاحبزادے! اتنا لمبا چوڑا سفر کیسے کیا؟ کہاں ہندوستان اور کہاں بچے، کیا ضرورت پیش آئی؟ صاحبزادے نے کہا کہ دادا کی میراث لینے آئے ہوں، جو آپ لے کر آئے ہیں۔ اور یہ وہ نسبت اور تعلق مع اللہ کی میراث ہے۔ فرمایا، اچھا یہ غرض ہے۔ کہانی ہاں۔ فرمایا کہ وہاں جوتیوں میں جا کر بیٹھ جاؤ اور خود جا کر مسند پر بیٹھ گئے۔ اب نہ وہ ادب ہے نہ وہ تعظیم اور بیعت کر کے تکیہ نفس کے لئے کچھ اعمال بتلائے۔ خدمت یہ سپرد کی کہ مسجد میں بیٹھ کر استیفاء کے لئے ڈھیلے توڑیں تاکہ نمازی آئیں تو تکلیف نہ ہو۔ سال بھرا ہی حالت میں گزر گیا کہ کوئی بڑا سن حال نہیں یا تو شاہ بچے رکاب تھامے آئے تھے۔ آج صاحبزادے کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

جب ایک برس گزر گیا تو شیخ نے امتحان لینا چاہا کہ کس حد تک نفس کی اصناف ہوئی۔ کہہ، غرور و رفع ہو یا نہیں۔ تواضع، لذیت پیدا ہوئی یا نہیں نفسانیت ختم ہو گئی یا نہیں۔ تو بھٹکن کو حکم دیا کہ کوڑا کبانہ کا نوکرہ لاکر

صاحبزادے کے قریب ڈال دے۔ تاکہ تھوڑا سا گردِ صاحبزادے کے اوپر پڑ جائے اور جو کچھ کہے۔ وہ ہم سے آکر کہہ دے۔ بھٹکن نے جا کر نوکرا زور سے ڈال دیا تو سارا گرد صاحبزادے سے پڑا تو اس نے آنکھیں لال پیلی کر کے کہا کہ ”بے حیاء! نہ ہوا گلوہ کہ تجھے تھلا تا“ اس نے آکر شیخ سے عرض کیا کہ وراخت نہیں ملی۔ ابھی نفسانیت کافی موجود ہے۔ اگلے دن پھر حکم ہوا، اتنے کے ڈھیلے توڑنا تو خیر ہے ہی مگر نمازی نماز پڑھ کر نکلیں تو جوتے سامنے رکھو، ان کی حفاظت بھی کرتے ہو۔

اب اس خدمت پر لگ گئے۔ جب ایک برس گزر گیا تو بھٹکن کو پھر حکم دیا کہ قریب ہی نہیں بلکہ جا کر صاحبزادے کے اوپر سارا گوزا کر کٹ ڈال دو۔ اس نے سارا نوکرہ جا کر ڈال دیا۔ تو صاحبزادے نے کہا ”اوہ بی، کیوں اس کباڑ کو تو نے مجھ پر ڈال دیا۔ یہ مجھ سے زیادہ افضل ہے تو نے اس کباڑ کو بھی عیب لگایا۔ میں ایسی ناپاک ہستی ہوں کہ یہ کباڑ بھی میرے اوپر گرنے سے ناپاک ہو گیا۔ میرے اندر تو کوئی خوبی نہیں“ بھٹکن نے جا کر شیخ سے یہ سب کچھ عرض کیا۔ فرمایا اب دادا کی وراخت مل چکی ہے۔ اس کے بعد اگلے دن شیخ نے حکم دیا کہ ہم شکار کے لئے جائیں گے۔ صاحبزادے سے فرمایا تم ہمارے ساتھ چلو۔ شیخ گھوڑے پر سوار ہوئے اور حکم دیا کہ تم رکاب تھام کے چلو جب وہ آئے تھے تو شیخ نے رکاب تھامی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ گرتے پڑتے شیخ کے ساتھ دوڑتے جا رہے ہیں، لہو لہان ہو گئے، پیروں میں زخم آئے، خون نکل آیا مگر کیا مجال کہ یہ رکاب سے الگ ہو جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شیخ حکم دیں اور اطاعت نہ کی جائے؟ اسی شان سے سارا دن بسر ہوا، شام کو واپس پہنچے تو صاحبزادہ کو حکم دیا کہ غسل کرو، صاحبزادے نے غسل کیا، کپڑے وغیرہ بدلوائے۔ اس کے بعد مجمع کیا اور بھرے مجمع میں صاحبزادے کو کھڑے کر کے جوتا تھام میں دیا اور فرمایا۔ یہ غلام حاضر ہے، سرجا حاضر ہے، یہ جوتا ہے۔ میں اسی طرح خانہ زاد غلام ہوں۔ دادا کی میراث مل نہیں سکتی تھی اگر یہ محنت اور ریاضت نہ ہوتی۔ نفس کا کبر فزع نہ ہوتا۔ اب تمہیں دادا کی میراث مبارک ہو، خلافت دی اور پگڑی سر کے اوپر باندھی۔ وہ گویا بے ادبی نہیں تھی بلکہ مجاہدہ تھا کہ اس کے بغیر نفس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی تو ریاضت اور مجاہدے اس لئے ہوتے ہیں کہ ادب کا مضمون قلب میں پیدا ہو جائے۔ تو اللہ اور اس کے نیک بندوں کا بھی ادب کرو، ہر بڑی چیز کا ادب کرو، جس میں کوئی بڑائی اور خوبی ہو۔ فرمایا: ”مَنْ لَّمْ يَزَحْمْ ضَعِيفٌ نَا وَلَمْ يُؤَقِّرْ خَجِيزٌ نَا فَلَيْسَ مِنَّا“ ① ”جو ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے۔ اس کا ہمارے سے کوئی تعلق نہیں۔“

ادب میں کمزوریاں کا لحاظ..... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا میں نے واقعہ اپنے بزرگوں سے سنا کہ کلیر شریف جب کبھی حاضر ہوتے۔ عرس وغیرہ سے یہ حضرات بچتے تھے کہ بدعات ہیں۔ لیکن بہرحال اللہ والوں کی قبروں پر جاتے تھے، استفادہ بھی کرتے تھے۔ کلیر شریف حاضر ہوتے تو کلیر شریف رنڈی سے پانچ چھ

① السنن للترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی رحمۃ العیال، ج: ۱، ص: ۵۵، ۱۸۴۲۔

میل کے فاصلہ پر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے تو چلتے وقت جوتے نکال دیتے تھے۔ ننگے پیر چھ میل کا فاصلہ طے کرتے۔ یہ چھ ادب کا غلبہ حال تھا۔ آپ اگر پوچھیں کہ کیا شرعاً ایسا کرنا ضروری تھا؟ تو شرعاً تو ضروری نہیں ہے کسی جگہ حکم نہیں ہے کہ جاؤ تو ننگے پیر جایا کرو۔ لیکن ادب جب غلبہ حال کے درجہ میں آتا ہے تو ادب و تداب کے وہ شمسلات سامنے آتے ہیں کہ ظواہر شریعت میں نشان بھی نہیں ہوتا۔ مگر قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ بھی ادب ہے اور اس پر عمل ضروری ہے۔ وہ قانونی عمل نہیں ہوتا، وہ اخلاقی عمل ہوتا ہے۔ قانون کی رو سے اسے واجب یا مستحب نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قلب اور محبت کے قانون کے لحاظ سے وہ واجب ہوتا ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عمر بھر سیاہ جوتا نہیں پہنا سرخ یا زرد رنگ کا پہنا کرتا تھے۔ فرمایا سیارنگ کا جوتا ممنوع نہیں۔ مگر بیت اللہ کا غلاف سیاہ ہے۔ تو پاؤں میں اس رنگ کا جوتا کیسے پہنوں؟ اس ادب کی وجہ سے سیارنگ کا جوتا پہننا چھوڑ دیا۔ پگڑی تو باندھتے سیاہ رنگ کی کہ یہ تو ادب کا مقام ہے مگر قدموں میں نہیں۔

اب اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! کسی روایت، کسی حدیث میں تو نہیں آیا تو حدیث میں تو ادب کا حکم آیا ہے۔ لیکن ادب جب راجح غلبہ حال کے درجہ میں آجاتا ہے تو بید سے بعید چیز بھی ادب کے درجہ میں آتی ہو، انسان اس کا لحاظ رکھتا ہے اور عمل کرتا ہے جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض چیزیں بڑی شمسلات ہوتی ہیں۔ لیکن آداب شریعہ کے لحاظ سے وہ ضروری قرار پا جاتی ہیں۔

الغرض اس طرح سے یہ آداب سکھائے گئے کہ اس کے بغیر دین کا تحفظ نہیں ہو سکتا اگر دل میں ذرا سا بھی ان چیزوں کے لئے تمسخر و استہزاء کا مادہ موجود ہے تو دین اس کا صحیح سالم نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے ضروری ہے کہ قلب کے اندر رنجیدگی و قار اور احترام ہو۔ آیات اور روایات کا اور ان شخصیتوں کا جن سے آیات و روایات اور دین کا تعلق ہے۔ جن کا ادب و احترام ضروری ہے جس کے بغیر دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا غایت درجہ ادب..... حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حرم مکہ میں سیلاب آیا اور حرم شریف میں پانی بھر گیا تو مقام ابراہیم، یعنی وہ چتر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قہر کی تھی بیت اللہ کی، وہ اب بھی محفوظ ہے اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان بھی ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہے۔ اس کے اندر وہ نشان محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُصَلًّی﴾ ① جب طواف کر کے دو گنا ادا کرتے ہیں تو مقام ابراہیم کوچ میں لینا مستحسن ہے۔ الغرض سیلاب جو آیا تو مقام ابراہیم پر پانی ہوئی عمارت کا برج گر پڑا اور وہ مقام ابراہیم کے اوپر آ گیا تو اس کا ایک کھمبہ ٹوٹ گیا اور وہ کنارہ اسی وقت شریف مکہ کے خزانے میں پہنچا دیا گیا وہ چیز

مقدس تھی۔ شریف مکہ، علماء و مشائخ کو قوتاً و فوٹاً اس پتھر کی زیارت کراتے تھے۔ خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ اس کے دو تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس میں سے ایک چھوٹا ٹکڑا، شریف مکہ نے ہدیہ کے طور پر بعض مشائخ کو دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح پھٹل ہو کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ اس مقام ابراہیم کے ٹکڑے کو نکال کر پانی میں ڈالتے اور وہ پانی اہل مجلس میں تقسیم کیا جاتا۔ اس ٹکڑے میں سے کھیریزے گر گئے۔ حضرت نے فوراً ریزوں کو جمع کر کے آنکھوں کے سرمہ میں شامل کر لیا۔ جب آنکھوں میں سرمہ لگاتے تو وہ حل کیا ہوا پتھر بھی آنکھوں میں جاتا تو یہ ادب کی بات تھی۔ طبی اصول پر دیکھ جائے، تو آنکھوں کے اندر مٹی یا پتھر کا ریزہ ڈالنا چنانچہ کے لئے نقصان دہ ہے مگر اس چیز کی پروا نہ تھی۔

بیانی کیا چیز ہے؟ اس شرف کے مقابلہ میں جو مقام ابراہیم کی محاورت اور قرب سے نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال دین کی بنیاد ادب و توقیر اور تعظیم کے اوپر ہے۔ اللہ اور شعائر اللہ کی تعظیم، بیعت اللہ، کتاب اللہ، اہل اللہ کی تعظیم، غرض جو بھی اللہ کی طرف سے منسوب ہو جائے۔ اس کی عظمت و توقیر کرنا یہ دین کی بنیاد ہے۔

اختلاف رائے..... مشائخ لکھتے ہیں، اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو اور فرض کیجئے کہ اس کی سنت کے خلاف کوئی بات دیکھے اور ارادہ کیا کہ کسی متبع سنت سے بیعت ہو جائے۔ تو مشائخ بالاجماع لکھتے ہیں کہ اس شیخ سے بیعت ترک کر دینی چاہئے۔ جس سے سنت کے خلاف اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن بے ادبی کا کلمہ کبھی نہیں کہنا چاہئے۔ گستاخی کا کلمہ کبھی نہ کہے۔ اس کے حق میں کبھی جائز نہیں کہ اس کی بے ادبی کرتا پھرے۔ ورنہ معنویت اور روحانیت کو نقصان پہنچے گا۔ یہ وہی احترام کی بنیاد ہے کسی عالم سے فرض کیجئے کہ آپ کسی مسئلہ میں مختلف ہو جائیں یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے۔ تو مسئلہ میں اختلاف کرنا تو جائز ہے، جب اپنے کو ”ذینا نذا علی التَّحْقِیْقِ“ سمجھے، لیکن بے ادبی اور تمسخر کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے، کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے اور اختلاف کرنا محبت سے، یہ عین دین ہے۔ دین جائز ہے اور خلافت دین جائز نہیں۔ اختلاف رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے احکام اور ادراکات جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے ذاتی جائز نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْتَ أَعْلَمُ بِمَا لَوْحَدَّثُوا﴾ ”اِذَا لَطَسَ النَّاسُ أَنْفُهَا فِي الْكُفْرِ، فَحَسَبْنَاهُم مِّنْ غُلَامٍ مَّیْمِنٍ“ (کسی مومن اور مومنہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آجائے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو پھر اس کے سامنے چوں و چرا کی جائے۔“

تو جہاں تک احکام دین کا تعلق ہے رسول تبلیغ فرمادیں تو تامل بھی جائز نہیں۔ چہ جائیکہ قول نہ کرے۔ لیکن اگر رسول یہ فرمائیں کہ میری ذاتی رائے یہ ہے۔ اگر آدمی نہ مانے تو اس پر کوئی الزام و ملامت نہیں۔ حدیث میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان ہوا، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہانسی تھیں۔ حضرت معیت رضی اللہ عنہ، بریرہ

رضی اللہ عنہا کے سوجان سے عاشق تھے اور بریرہ رضی اللہ عنہا کو نفرت تھی۔ اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو آزاد کر دیا اور مسند شریعیہ ہے کہ ہاندی اور مشکوچہ اگر آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا نہ رکھنا اس کے اختیار میں ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ فلاں شخص غلام ہے تو جائز ہے کہ نکاح منقطع کر دے۔ اب حضرت مغیث رضی اللہ عنہ پریشان ہیں، وہ سوجان سے عاشق اور بریرہ رضی اللہ عنہا کی ضیعت کو مناسبت نہیں اور بات آگئی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ۔ تو لکھا ہے حضرت مغیث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کی گلیوں میں بھر رہے ہیں، درود رہے ہیں، آنسو داڑھی پر گر رہے ہیں، اور ہر ایک کے پاس جاتے ہیں کہ تم سفارش کر دو کہ بریرہ رضی اللہ عنہا نکاح کو منقطع نہ کرے، آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا یا رسول اللہ! آپ بریرہ کو فرمائیں کہ وہ نکاح نہ توڑے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے بریرہ! نکاح کو منقطع مت کرو۔ مغیث کا برا حال ہے۔ اسے محبت اور تعلق ہے۔ مگر بریرہ رضی اللہ عنہا بہت دانش مند تھی۔ عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ حکم شریعی ہے یا حضور کی ذاتی رائے ہے؟ فرمایا نہیں مشورہ ہے، حکم شریعی نہیں، عرض کیا میں تو نہیں مانتی، فرمایا تجھے ماننے نہ ماننے کا حق ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا حق ہے۔ یعنی کوئی ملامت اس میں نہیں۔ نہ انبیاء کی نہ شریعت کی، یہ الگ چیز ہے کہ ادب کی وجہ سے ہم حضور کے منشاء کو بھی سوائے حکموں سے زیادہ سمجھیں گے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے پہلے پوچھ دیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکم خداوندی ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے؟ جب معلوم ہوا فرمایا کہ میں نہیں مانتی۔ ذرہ بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر گرائی نہیں ہوئی، لیکن رائے کے نہ ماننے کی وجہ سے کیا ہے جائز تھا کہ بریرہ رضی اللہ عنہا معاذ اللہ، ادنیٰ درجہ کی شان رسالت میں بے ادبی کرے۔ اگر ذرہ بھی بے ادبی ہوتی تو ذین ختم ہو جاتا۔ ادب اور عظمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ لیکن شریعت نے جوق دیا، اس کو استہمال کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو نہیں مانتی یہ میرا خانگی معاملہ ہے اور اگر حکم شریعی ہے تو سر جھکا ہوا ہے۔ اسے سے اندازہ ہوا کہ اختلاف رائے اگر اہل اللہ اور علماء میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی۔ اس نے کہ وہ بہر حال عالم دین ہے۔ جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے اس کی عظمت واجب ہوگی۔

ہم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پچاسویں مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر ادنیٰ درجہ کی بے ادبی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں نہیں آتی۔ اور جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجب التعلیم ہیں، ویسے ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ دونوں مایہ ناز آفتاب ہیں دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجہ کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے۔ گستاخی و استہزاء کرنا جہالت کی بھی علامت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاں مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) کو ذبح کر کے اس کا گوشت میت

سے ملا دیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ﴿التَّحِلُّنَا هَٰذَا﴾ ① آپ کیا مذاق کرتے ہیں؟ اس بات میں کیا تعلق ہے کہ گوشت کو مردہ سے ملا دیا جائے۔ مومن علیہ السلام نے فرمایا: ﴿أَعْلَوْذُ بِاَللّٰهِ اَنْ اُكْمُوْنَ مِنْ اَلْجَنَّةِ لَيْسَ﴾ ② میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں، یعنی دل لگی، تمسخر جاہلوں کا کام ہے، عالموں کو من سب نہیں کہ تمسخر کریں۔ اس لئے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی، بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں۔ اختلاف جائز ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد رضا خاں (مرحوم ان)..... میں نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم سے بہت سی چیزوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ قیام، عرس، میلاد وغیرہ مسائل میں اختلاف رہا۔ مگر جب مجلس میں ذکر آیا تو فرماتے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھنے والے ایک شخص نے کہیں بغیر مولانا کہ احمد رضا کہہ دیا۔ حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا کہ عالم تو ہیں، اگرچہ اختلاف رائے ہے۔ تم منصب کی بے احتزائی کرتے ہو، کس طرح جائز ہے؟۔ رائے کا اختلاف اور چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کو خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ان کی توہین اور بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”مولانا“ نہ کہنے پر برامانا، حالانکہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابل جو مولانا تھے وہ انتہائی گستاخی کیا کرتے تھے۔ مگر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم میں سے تھے۔ وہ تو نام بھی کسی کا آیا تو ادب ضروری سمجھتے تھے۔ چاہے بالکل معاندی کیوں نہ ہو۔ مگر ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔

کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا سلوک..... میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا واقعہ سنا کہ دہلی کا قیام تھا، حضرت کے خدام میں سے چند مخصوص ملازمہ ساتھ تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ امر و ای، حاجی، امیر شاد خاں صاحب مرحوم یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے اپنے بھویوں میں بیچہ کر فرمایا کہ بھی لال کنویں کہ مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قرأت بہت اچھی ہے۔ کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھ لیں۔ تو شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی، بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر کرتا ہے۔ ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جیلے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پہنچے۔ اگلے دن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے اس امام کے پیچھے جا کر نماز پڑھی۔ سلام پھیرا، چونکہ یہ اجنبی تھے۔ نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علماء صورت، تو پوچھا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ مولانا محمد قاسم ہیں اور وہ ان کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن اور یہ مولانا احمد حسن محدث امر وہی، ان کے تلمیذ ہیں۔ امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن انہیں کافر کہتا ہوں اور یہ

نماز کے لئے میرے پیچھے آ گئے۔ امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ حضرت میں آپ کی تکفیر کرتا تھا، میں آج شرمندہ ہوں۔ آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ حالانکہ میں آپ کو کافر کہتا رہا۔ حضرت نے فرمایا کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے کیوں؟ اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں تو بین رسول کرتا ہوں۔ تو آپ کی غیرت ایمانی کا یہی تھا تھا۔ ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔ مگر بہر حال تکفیر کی جیسا تو بین رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور تو بین رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمان کرے گا، تکفیر واجب ہوگی، دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ تو فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی غیرت ایمانی کی قدر ہے۔ ہاں شکایت اس لئے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط، تو میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی کی توہین کرے۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں۔ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" اب امام بے چارہ قدموں پر گر پڑا، بچھا جاتا ہے۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں تو اضع لہ اور ادب مع اقداس درجہ درجہ چاہا تھا کہ نفسانیت کا شاہد نہ رہا تھا۔ استہزاء اور تمسخر تو بجائے خود ہے اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صحیح محسوس پر اتار کر یہ کہتے ہیں کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں۔ یہ ان کی توت ایمانی کی دلیل ہے۔ طلبہ یہ تحقیق کر لینی چاہئے کہ واقعہ ہم تو بین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں؟ ہم معاذ اللہ دشمنان رسول ہیں یا دوستان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی یا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہئے۔ تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادب دینا کی بنیاد ہے۔ جس کو عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

از خدا خواہم توفیق ادب بے ادب محروم شدت از فضل رب

حق تعالیٰ شائد کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں جو مستغ اور بے ادب ہے۔

بے ادبی کی وجہ سے علمی فیض سے محرومی..... بہت سے ایسے فضلاء ہماری نگاہوں میں ہیں۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ اچھے اور ذی استعداد تھے۔ مگر اساتذہ سے بے ادبی کا معاملہ تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد علم کی خدمت سے محروم رہے، کوئی دکانداری کر رہا ہے، کوئی گاڑی چلا رہا ہے۔ یہ نصیب نہیں ہوا کہ تحریک یا مفسرین کر بیٹھیں اور ایسے بھی ہماری نگاہوں میں ہیں کہ استعداد اور علمی قوت بہت محدود تھی۔ لیکن تادب اور خدمت اتنی تھی کہ رات دن اساتذہ کی خدمت میں ادب کے ساتھ لگے رہتے، ادب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اتنی خدمت کر رہے ہیں کہ بڑے بڑے ذی استعداد فضلاء اتنی نہیں کر رہے، تو مقبولیت ان کے اندر ادب کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ کا دوسرا واقعہ..... حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک رسالہ خود لکھا اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو اب گئے مرید ہیں، دیا کہ اس کی نقل کر کے لاؤ، اس کے

اندر ایک جگہ علماء کی غلطی تھی، عین کے بجائے ہمزہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت مولانا نے از خود صحیح نہیں لکھا بلکہ وہ جگہ چھوڑ دی اور حضرت سے آ کر کہا کہ یہ نقطہ کچھ میں نہیں آتا، یہ کیا ہے؟ تو اشتباہ کا راستہ اختیار کیا تلقین کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ شیخ کو جا کر یوں کہیں کہ آپ نے غلط لکھا ہے جرات نہ تھی کہ یوں کہیں کہ یہ غلطی ہوئی۔ گویا صورتاً بھی بے ادبی نہ کر سکے۔ حقیقتاً بے ادبی کیا کرتے؟

آداب سے غفلت برتنے کا نتیجہ..... بہر حال دین کا دار و مدار تادیبات اور آداب پر ہے۔ یہ شریعت کا مستقل باب ہے، جہاں احکام ہیں وہاں اس کے ساتھ کچھ آداب ہیں۔ ادبیات پر اگر آدمی تو رہتا ہو تو وہ اصل احکام سے بھی کورا اور محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے آداب کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے غالباً ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ پوری طرح یاد نہیں، نقل کئے دیتا ہوں۔ تفسیر فتح العزیز میں ہے۔ ”مَنْ تَهَآوَنَ بِلِیْ الْأَدَابِ خَرُمَ مِنَ السُّنَّةِ وَمَنْ تَهَآوَنَ بِالسُّنَّةِ خَرُمَ مِنَ الْوُجِبَاتِ وَمَنْ تَهَآوَنَ بِالْوُجِبَاتِ خَرُمَ مِنَ الْمَغْرَبَاتِ وَمَنْ تَهَآوَنَ بِالْمَغْرَبَاتِ خَرُمَ مِنَ الْمَغْرَبَاتِ“ جس نے آداب پر عمل کرنے میں سستی دکھائی، وہ سنت سے محروم ہو گیا جس نے سنت پر عمل سے سستی کی وہ واجبات سے محروم ہو جائے گا اور جس نے واجبات پر عمل سے سستی دکھائی وہ فرائض پر عمل سے محروم ہو جائے گا اور جس نے فرائض کی ادائیگی میں سستی کی وہ اس کی بیچوں سے محروم ہو گیا۔ ”فرائض پر عمل کرے گا تو معرفت بڑھے گی۔ اس واسطے سنتوں کو کم سے فرائض کہا گیا تو جس نے آج سنیوں چھوڑ دیں، صرف فرائض کو پڑھ لیں کل وہ بھی نہ پڑھے گا۔ رفتہ رفتہ محروم ہو جائے گا۔

سد ذرائع اور اس کی مشملہ..... شریعت میں احکام کی دو قسمیں ہیں۔ مامورات یعنی کرنے کی چیزیں اس کے لئے آداب رکھے گئے کہ انہیں کرو گے، تب جا کر مامورات پر عمل کرنا نصیب ہوگا اور ایک تنہیات ہیں، روکنے کی چیزوں میں مکروہات رکھے گئے کہ مکروہات سے بچو گے، تب حرام سے بچنا نصیب ہوگا اور اگر مکروہات میں ڈوبے رہو گے تو ایک نہ ایک دن حرام میں پڑ جاؤ گے اور اس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں سد ذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی ذرائع اور وسائل سے بچنا تاکہ اصل ممنوع سے بچ جائے اور واجبات میں وسائل کو اختیار کرنا تاکہ فرائض پر عمل نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں سد ذرائع۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ ”مَا سُكِرَ تَجْنِيزُهُ لِقَبْلِيلِهِ خَوَامٌ“ ① ”جس چیز کے زیادہ حصہ میں نشہ ہو اس کا کم حصہ بھی ناجائز ہے۔“ شراب کے ایک گھونٹ میں نشہ ہے۔ ایک قطرہ میں تو نہیں، لیکن قطرہ پینا بھی اس طرح حرام ہے، جس طرح گھونٹ پینا حرام ہے۔ حالانکہ حرمت تو سکر کی وجہ سے ہے اور ایک قطرہ میں ظاہر ہے کہ سکر نہیں۔ مگر سد ذرائع کے لئے ایسا کیا گیا کہ جو ایک قطرہ شراب پی لے گا، کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، پوسوں پورا

① السنن لابی داؤد، کتاب الاشریۃ، باب البہی عن المسکر، ج: ۱۰، ص: ۱۰۲، رقم: ۳۱۹۶ حدیث صحیح ہے۔ روایت

صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۸، ص: ۱۸، رقم: ۳۶۸۱

جسم پینے کا اور شرابی بن جائے گا۔ تو شرابی بننے سے بچانے کے لئے قطرہ کو حرام کیا گیا تاکہ وہاں تک پہنچنے نہ پائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ”مَنْ أَتَى غُرْفًا فَفَقَدَ تَخَفَرًا بَعَا أَتَرَكَ عَلَى مُحَمَّدٍ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) ① ”جو کسی جادوگر یا کافر کے پاس گیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے ساتھ کفر کیا۔“

حالانکہ جادوگر کے پاس سے جانے سے توحید و رسالت اور قیامت کا انکار نہیں ہوتا، کوئی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی فرماتے ہیں کہ اس نے شریعت اسلام کے ساتھ کفر کیا۔ اس لئے کہ آج جادوگر کے پاس گیا تو محر کی برائی اس کے دل سے نکل گئی۔ تو کل کو محر سیکھے گا اور پرسوں پورا جادوگر بن جائے گا۔ تو اسی جادو کے کفر سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کو کہتے ہیں سید ذرائع اصل مقصود کو کبیرہ منہا کہتے ہیں اور وسائل کو صغیرہ منہا تو وسائل سے روکتے ہیں تاکہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔

مثلاً چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ کسی کے مال معصوم کو آدمی یا اسی کی مرضی کے اخلائے۔ لیکن یہ تو ہے اصل خرابی۔ مگر اس کی وجہ سے کسی کے مال کو تاک جھانک کرنا، نقب لگانا، دیوار سے جھانکنا، یہ سب صغیرات ہیں اور اسی لئے ناجائز ہیں کہ جب یہ کرے گا تو ایک دن اصل بھی کر بیٹھے گا۔ گواہی ذات سے کسی کے سامان کو دیکھنا، کسی کی دیوار کو تاک لگانا ممنوع چیز نہیں۔ مگر اس لئے ممنوع ہوئے کہ یہ چوری کا وسیلہ بننے ہیں۔ یا مثلاً زنا کے سلسلہ میں اصل ممنوع وہ فعل (حرام) ہے مگر اس سے بچانے کے لئے نامحرم عورت سے تخلیہ کرنا، اس پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھنا، ہاتھ سے چھونا، سب ممنوع قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ چیزیں اصل حرام فعل کے ذرائع بنتی ہیں۔ تو شریعت نے چاہا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دوائی سے بھی بچو یہ سب شریعت کے آداب ہیں۔

عبادات کے وسائل بھی عبادت ہیں..... مامورات میں نماز فرض ہے۔ اس فرض کو بجالانے کے لئے کچھ چیزوں کا اہتمام کیا گیا کہ اذان جب سنو تو اس کا جواب دو تاکہ اذان سنتے ہی فکر پیدا ہو جائے کہ اب مجھے نماز کو جانا ہے۔ اس کے بعد وضو کا اہتمام کرو۔ پھر تریغ دی گئی کہ مسجد میں جاؤ گے تو ہر قدم پر ایک نکل نکلی جائے گی اور ایک ہدی منادی جائے گی۔ حالانکہ قدم رکھنا اپنی ذات سے کوئی عبادت نہیں۔ لیکن نماز کے لئے قدم رکھنا عبادت قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ قدم نماز پڑھنے کا ذریعہ بنے گا۔ تو اس اذان کا جواب دینا، قدم اٹھانا، وضو، استنجاء اور طہارت وغیرہ کی تفصیلات آئی۔

اہل اللہ کو نیکی کی حرص..... حتیٰ کہ بعض اہل اللہ کی یہ شان سنی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ کا واقعہ اپنے بزرگوں سے شاگرد مسجد کے دوراتے ہوں۔ ایک ذرا لمبا راستہ اور ایک مختصر راستہ، تو لمبا راستہ اختیار کرتے اور فرماتے، جتنے قدم زیادہ پڑیں گے، اتنی بدیاں ملیں گی۔ تو کیا ہم محروم رہیں اور ساتھ میں قدم بھی چھوٹے چھوٹے رکھتے۔ یعنی بالطبع چال سے کم چال سے چلتے کیونکہ قدم اٹھانے پر اجر کا وعدہ ہے تو یہ ہمارے

① مسند احمد، ج: ۱۹، ص: ۱۲۱، رقم: ۹۱۷۱۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترہیب ج: ۳، ص: ۹۸۰۔

اختیار میں ہے کہ جتنے چاہیں قدم رکھیں کہ ٹیکیاں اتنی لکھیں چاہیں۔ سو قدم سے اگر مسجد تک پہنچتے تو آہستہ آہستہ چل کر انہیں دو سو قدم بنا دیتے۔ اور یہ حضرات ٹیکوں پر حریص ہوتے ہیں جیسے دنیا والے دنیا کے بارے میں کہ انہیں سولہ جائے تو ہزار اور ہزار مل جائے تو لاکھ اور لاکھ لڑ جائے تو کروڑ کی تمنا اور حرص ہوتی ہے۔ اللہ والے دین کے بارے میں ایسے ہوتے ہیں۔ اگر ایک ثواب ملتا ہے تو اس پر قناعت نہیں، دول جائیں تو تیسرے کی خواہش۔ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ..... امام ابو داؤد بہت بڑے محدث ہیں۔ وہ دریا کے کنارے کھڑے تھے اور کنارے پر پانی کم تھا۔ ایک جہاز دو تین سو قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا کنارے تک آ نہیں سکتا تھا۔ جہاز میں ایک شخص کو چھینٹ آئی اور اس نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کہا اور اتنے زور سے کہا کہ ان کے کان میں آواز آئی تو مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جواب "بِزَحْمُکَ اللّٰہ" کہہ کر دینا چاہیے۔ مگر یہ مسئلہ مجلس سے متعلق ہے۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی بازار میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کہے تو تم گھر سے جواب دینے جاؤ۔ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" کی آواز پڑی۔ یہ لوگ چونکہ ٹیکوں کے حریص تھے۔ چھوٹی سی ٹیکی سننے کا امکان ہو تو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ٹیکی اور خبر کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاز دور تھا، آواز پہنچ نہیں سکتی تھی۔ تین درہم میں کٹمی کراہیہ پڑی۔ اس میں بیٹھ کر جہاز کے اوپر چڑھے۔ وہاں جا کر کہا "بِزَحْمُکَ اللّٰہ"۔ ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ غیب سے آواز کان میں آئی کہ اے ابی داؤد! آج تین درہم میں تو نے جنت کو خرید لیا۔ حالانکہ امام کتنے بڑے محدث، کتنی حدیثیں لکھیں، کتنے مجدد پڑھے، کتنے جہاد کئے ہوں مگر جنت کی خریداری میں بڑے بڑے اعمال کا ذکر نہیں بعد از کراہیہ "بِزَحْمُکَ اللّٰہ" کہنے کا، جو بظاہر بہت چھوٹا اور معمولی سا عمل تھا مگر کیوں آیا؟ اس لئے کہ ایسے اخلاص سے عمل کیا کہ اس چھوٹے سے عمل میں اتنا وزن پیدا ہوا کہ بڑے سے بڑے عمل میں اتنا نہ ہوگا اور اللہ کے ہاں عمل کی صورت نہیں، وزن دیکھا جاتا ہے۔ کٹمی لے کر جہاز پر جا کر "بِزَحْمُکَ اللّٰہ" کہنا نہ فرض تھا نہ واجب مگر یہ لوگ آداب پر عمل کے حریص ہوتے ہیں تاکہ فرائض پر عمل کی کوتاہی نہ آئے۔ تو تادب مع اللہ اتنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی زیادہ ہو گئی۔ ایک دوسرے کے حق میں زبان طعن و مامت اور زبان تضحیک کھوٹنا بہت معمولی بات بن گئی۔ اس واسطے میں نے یہ مساع خراش آپ لوگوں کی کی، کہ اگر بالفرض کسی عالم سے اختلاف آ بھی جائے۔ تو اگر آپ خود عالم ہیں، تب آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متبع ہیں اور وہ اقتدی کر رہا ہے دوسرے عالم کی، تو عمل اپنے مقتدی و متنبوع کی تحقیق پر کریں۔ مگر دوسرے کے ساتھ حسرت کرنا۔ آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں۔ بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی رحمت ہے، جو ہر کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جو وہ کہتا ہے مندا اللہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ اگر خطا ہو جائے تو بھی اسے اجر ملتا ہے اور آپ اس پر عقاب اور عذاب بھیجئے لگیں، یہ تو خدا کا مقابلہ ہو گیا۔ حق تعالیٰ کے ہاں اجتہاد کی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ آج کل فروغی اختلاف کی

وجہ سے مسخر و ہن بڑھ گیا ہے یہ دین کے منافی ہے۔ بے شک آدمی عس اپنی تحقیق پر کرے اور دوسرے کو معذور رکھے۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرز عمل..... آئمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے، تو امام کا مسلک ہے، نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زور سے کہنا افضل واولیٰ ہے۔ مگر جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی، تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا مجھے حیا آتی ہے اس صاحب مزار سے کہ اس کے قریب آ کر اس کے اجتہاد سے خلاف کروں۔ یہ ادب اور تادب ہے۔ یعنی جس حد تک گنجائش ہو ایک تو حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز، دوسرے کے ہاں حرام، اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں اولیٰ اور غیر اولیٰ کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل پر عمل ترک کر دیا اور غیر افضل پر عمل کیا امام کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں۔ مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادب کی بات تھی۔

مسائل اور جذبات نفسانی..... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے، آئمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں وہ صحابہ میں بھی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ادب و احترام اور عظمت و تعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ کے لئے مسائل کی خاصیت نہیں ہے، بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے کے لئے مسائل کو اڑ بنا رکھا ہے۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ لڑتے کیوں کہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔ اس کے بعد آئمہ مجتہدین کے ہاں لڑی چلتی۔ پھر علماء ربانین آپس میں لڑتے، مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ دراصل اختلاف رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔ جب مسلمانوں کے پاس یہ چیزیں نہ ہیں۔ نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت، سو چاکہ بھی ادا دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو اڑ بناؤ تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے فروغی اختلاف پر عیسائی حج کا طنز..... ایک عرصہ پہلے ایک یورپین عیسائی کلنر تھا۔ اس کے زمانہ میں احناف اور اہل حدیث میں لڑائی ہوئی اور لڑائی ”آمین“ کہنے پر ہوئی۔ خفیوں نے آہستہ پڑھی۔ اہل حدیث نے زور سے کہی تو لڑائی چل گئی۔ بہت لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ کلنر کے ہاں گیا۔ فریقین کے وکلاء نے کلنر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی! آمین کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں؟ وکلاء نے کہا،

نہیں آئین ایک قول ہے جو زبان سے نکالے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر سے حدیث آئی ہے کہ آئین زور سے پڑھو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے، آہستہ پڑھو اس نے کہا، جس کو جو حدیث معلوم ہے اس پر عمل کرے۔ تم لڑتے کیوں ہو؟ اور اس کی سمجھ میں بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے کی بات بھی نہ تھی۔

بہر حال اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی مثل دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں آئین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ”آئین بالہجھو“ زور سے پڑھنا، ایک ”آئین بالیسو“ آہستہ پڑھنا اور ایک ”آئین بالشر“ یعنی جھگڑنے لڑنے کے لئے پڑھنا اس لئے کہ پہلے دونوں کے بارے میں حدیث موجود ہے ایک کو ایک امام نے، دوسرے کو دوسرے امام نے اختیار کر لیا۔ اس میں لڑائی کی بنیاد ہی نہیں۔ یہ آئین بالشر کی لڑائی ہے۔ لہذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لئے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لئے، وہ ویسا جھگڑت سے رائے قائم کرنے کے لئے ہوتے ہیں تو یہ ہمارے قلوب کا قصا ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کے لئے آڑ بٹالیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لئے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں راہ صواب..... اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے کیونکہ اس سے مسخرہ کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزاء کرے۔ آپ نے بیان کیا امر بالمعروف کا حق ادا ہو گیا۔ اب اگر کوئی نہیں مانتا، نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی جہت ہے تو وہ عند اللہ جو اب دے گا تم ذمہ دار نہیں، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا اور پھر دین متوانا (یعنی اصول دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا متوانا بھی ضروری ہو۔ بہر حال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت..... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں مقام پر جا کر دین کی تبلیغ و اشاعت کرو، چلتے چلتے مرید نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمائیے مجھے شیخ نے فرمایا کہ وہ باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ مت کرو اور نبوت کا دعویٰ مت کرو۔ وہ حیران ہوا کہ حضرت! میں برہا برس آپ کی صحبت میں رہا۔ کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ تھا کہ میں خدائی اور نبوت کا دعویٰ کروں گا؟ فرمایا کہ خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو، پھر بات کرو۔ خدا کی ذات وہ ہے کہ وہ جو کہہ دے وہی اہل ہو اس سے اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو انسان اپنی رائے کو اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اہل ہو۔ اس کے خلاف نہ ہو سکے۔ کوئی بندہ اپنی رائے پر اتنا اصرار کرے، تو اس سے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ کیا ہوگا؟ اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے وہ سچی بات ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے قول کے بارے میں کہے کہ یہ

اتنی جی بات ہے کہ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ وہ درپردہ گویا نبوت کا مدعی ہے کہ میری بات غلط نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کی رائے ہے۔

فساد یا اصلاح؟..... تو ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جھوٹ کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے۔ یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں فساد ہے۔ تو ایک چیز کو چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے۔ تم ذمہ دار اور خدا کی ٹھیکہ دار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خواخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔ تبلیغی اور ترجیحی مسائل میں فرق..... ہاں ایک ہیں دین کے اصول، نماز فرض ہے، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ آپ زور سے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فردی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں۔؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذاہب ہی نہیں آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو! تم حنفی بن جاؤ اور شافعی مت نہو۔ یا شافعی کہے کہ لوگو! شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو یہ ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا فضیل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذاہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کو کوئی جزئی تحقیق ہو۔ خواخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔ بہر حال آج کل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے۔ بہت گستاخی، جسارت اور جرات ہو رہی ہے اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے عمل کی۔

”اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ“

حقوق مالیه

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنُسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهٖ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضِلِّهٖ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَوَسَدْنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهٗ اللّٰهُ اِلَى كَاٰلَةِ النَّاسِ بِشِيْرًا وَنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاَذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّبِيْنًا۔

اُمَّا بَعْدُ:..... فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ اِنْ رَبُّكُمْ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ ؕ یُعْجِزُ السَّاعِیَ النَّهَارَ یَسْطُلُہٗ حَبِیْبًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ مُسْحَرٰتٍ بِاَمْرِہٖ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ ①

بدن اور اس کی ضروریات کا خالق..... بزرگان محترم! مجھے اس وقت کوئی ایسی چوڑی تقریر کرنا نہیں ہے۔ مختصر طریق پر چند کام کی باتیں آپ حضرات کے سامنے گزارش کروں گا اور اس میں بھی کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا تمہید جو اصل مقصود کی باتیں ہیں، وہی کہتی ہیں۔ اچنی بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارا خالق اور مالک اللہ رب العزت ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارے بدن کو بھی اور ہماری روح کو بھی اور روح و بدن کے لئے جن سامانوں کی ضرورت ہے، ان سامانوں کو بھی اس نے پیدا کیا۔ بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت تھی۔ تو زمین سے لئے کرۂ آسمان تک ان ضروریات کو پھیلا دیا۔ زمین میں طاقت رکھ دی کہ ہماری غذا آئیں اگائے۔

اس میں طاقت رکھ دی کہ ہمارا لباس بھی اگائے۔ گویا زمین کو اللہ نے غذاؤں کا گودام بنا دیا۔ یہ گیہوں چنے، چاول، پھل پھول اور فروٹ سب اسی سے نکلتے ہیں۔ پھر اپنی حکمت سے زمین ہی کو شرک بنا دیا۔ ہم اس پر چلتے پھرتے ہیں۔ پھر زمین ہی میں ہمارے لئے پانی کا سامان رکھا اور دریا جاری کر دیئے، زمین ہی کے اوپر ہوائیں پھیلا دیں کہ ہم سانس لے سکیں۔ تو زمین گودام، دائرہ و کس، اور ہمارے کپڑوں کا صندوق بھی ہے جس سے روئی اور جانوروں کی اونٹ نکلتی ہے۔ ساری بدنی ضروریات اس میں مہیا کی ہوئی ہیں۔

بدن کو روشنی کی ضرورت تھی تو پہلے آسمان کی چھت قائم کی۔ اس میں چاند سورج اور ستاروں کے انڈے

① پارہ ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۴۔

لگا دینے پھر ایک ہی چیز سے بہت سے کام لئے سورج ہمیں روشنی بھی بخشتا ہے۔ گرمی کی ضرورت ہے تو حرارت بھی بخشتا ہے۔ نائٹم اور وقت کی ضرورت ہو تو اچھی خاصی گھڑی بھی ہے۔ جس سے ہم اوقات بھی معلوم کرتے ہیں۔ ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ ① ستاروں سے لوگ راستے بھی پاتے ہیں سمندروں میں جہاز رانی ہوتی ہے وہاں سرنگیں بنائی ہوئی نہیں ہوتی سمتوں سے چلتے ہیں اور سمتیں ستاروں سے متعین کرتے ہیں۔ تو ستاروں سے راہ، سورج سے روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ نیز ستاروں سے جڑی بوٹیوں میں خاصیتیں اور تاثیر پیدا ہوتی ہیں۔ ہڈیوں کی ٹیلیوں میں گودا اور روغن پیدا ہوتا ہے۔ غرض انسان کے لئے فحشی بدن کی ضروریات درکار ہیں۔ وہ سب زمین اور آسمان کے وسط میں رکھ دی ہیں تو وہ ہمارے بدن کا بھی خالق ہے اور بدن کی ضروریات کا بھی۔

روح اور اس کی ضروریات کا خالق..... اسی طرح وہ ہماری روح اور اس کی ضروریات کا بھی خالق ہے۔ جیسے بدن کی ضروریات ہیں، بدن کے لئے غذا کی بھی ضرورت ہے تو روح کے لئے بھی ضرورت ہے۔ بدن کو گراحت کی ضرورت ہے تو روح کو بھی سکون و تسکین کی ضرورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بدن مادی چیز ہے اس کے سامان بھی مادی ہیں روح ایک پاکیزہ اور لطیف چیز ہے اس کے سامان بھی لطیف ہیں روح کی غذا علم و معرفت، اخلاق ربانی اور ملکیت ہے۔ یعنی ملائکہ کی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں۔ اس سے روح کو سکون ملتا ہے۔ روح کو آپ کے اس روٹی اور کپڑے کی ضرورت نہیں ہے اس کا روٹی کپڑا اس کے مناسب حال ہے جو علم کامل دین و دیانت اور اخلاق ہے۔

جس طرح پانی کے لئے بادل مقرر کئے جو اپنے وقت پر آ کر برس جاتے ہیں، جس سے آپ کی زمین سیراب ہوتی ہے اس طرح علم کے بادل پیدا کئے وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے ذریعے وحی کی بارش ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”مَنْ شَرِبَ مِنْ عَيْنِي الْغَدَى وَالْغَدَى الْغَدَى“ ② میری اور میرے دائرہ علم و کمال ایسی مثال ہے جیسے بہت زور کا بادل اٹھا اور گھٹا اٹھی اس میں سے بارش برسی شروع ہوئی سو سلا دھار پانی پڑا تو زمین کی تین قسمیں ہو گئیں۔ ایک زمین وہ ہے جو پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور پھل پھول اگا کر باغ و بہار بنا دیتی ہے، ایک وہ کہ باغ و بہار اور پھل پھول نہیں نکالتی لیکن پانی کو جمع کر لیتی ہے گہرے تالاب ہیں ان میں پانی بھر جاتا ہے پھر لوگ وہاں سے پانی لے کر پیتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ جو بالکل چھٹیل میدان ہے جس میں تداگانے کی صلاحیت ہے نہ پانی کے جمع کرنے کی، پانی آیا اور بہ کر نکل گیا۔ نہ جمع کیا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں نہ کوئی پھل پھول ہی اگا گیا کہ خود اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک قلوب وہ ہیں کہ جب وحی کا پانی آتا

① ہارہ: ۱۳، سورۃ النحل، الآیہ: ۱۶۔

② الصحيح للبخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم و علم ج: ۱ ص: ۱۴۱ رقم: ۵۷۰۔

ہے تو وہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے علم و حکمت کے پھل پھول نکال کے پیش کرتے ہیں۔ جس سے روحانیت میں باغ و بہار آ جاتی ہے۔ یہ ہیں فقہاء کدین اور علم پہنچا، انہوں نے اجتہاد کیا مسائل نکال نکال کر دنیا کے آگے رکھ دیئے تاکہ لوگ عمل کریں۔

ایک قلوب کا وہ طبقہ ہے، جو پھل پھول تو نہیں اگا سکتا مگر امانت داری کے ساتھ وحی کے پانی کو جمع کر لیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں، کوئی اس سے پتا ہے، کوئی کبھی کو دیتا ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے محمد ثین اور خطا قرآن حکیم کہ وحی آئی اور انہوں نے اسے اپنے سینے میں جمع کر لیا۔ ان میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس میں سے مسئلہ نکال لیں۔ مگر جو آئے گا، اسے پانی پہنچا دیں گے وہ اس میں سے مسائل نکال لے گا۔

تیسرا طبقہ گمراہ کہا گیا وہ ہے کہ وحی کا پانی برسا لیکن اس کے دل ایسے ہیں جیسے اونچی زمین ہوتی ہے کہ آیا اور بہ گیا۔ نہ اس میں جمع ہوا نہ پھل پھول نکلے۔ جیسے مادی پانی کے لحاظ سے زمین کی تین قسمیں ہیں اسی طرح وحی کے پانی کے اعتبار سے بھی قلوب کی تین قسمیں ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے جیسے بدن کے لئے غذا نہیں پیدا کی گئیں، روح کے لئے بھی پیدا کی گئیں، بدن کی غذا بھی ہر ایک نہیں نکال سکتا۔ کسی کے اندر ایجاد کا مادہ ہے کہ زمین میں سے معدنیات نکالے، سونا چاندی اور سیسہ نکال کر طرح طرح کے سامان بنائے۔ ایک وہ مزدور ہیں جن میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایجاد کریں وہ سونا چاندی نکال نکال کے پیش کریں۔ تاکہ دوسرے اس سے کام لیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن میں نہ عقل ہے نہ ہمت نہ ایجاد کر سکتے ہیں نہ وہ کوئی چیز جمع کر سکتے ہیں بلکہ دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ غرض جیسے وہاں تین قسمیں ہیں۔ یہاں بھی تین ہی قسمیں ہیں۔

روح و بدن کو شیخ کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے۔۔۔۔۔ تو بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے روحانی غذاؤں علم و کمال وغیرہ کی ضرورت ہے اور یہ سارے سامان اللہ میاں نے پیدا کئے۔ تو ہم بھی، ہماری جان بھی، ہمارا مال بھی سب خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم اللہ کی ملک و ملک ہیں۔ نہ ہمارا بدن ہماری ملک ہے نہ روح۔ ہم امانت دار ہیں مالک نے پیدا کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم امانت داری کے ساتھ اسے سونپ دیں اور صحیح کر کے اسے سونپیں تو ہم اس بدن کے خود مالک نہیں ہیں۔ یہ سرکاری مشین ہے۔ اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔

اس لئے اگر بدن پر بیماری آجائے تو سنت ہے کہ علاج کیا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے کہ ہماری ملک ہو تو چاہے اپنے کو ختم کر دیں، چاہے قتل کر دیں، خود کشی کر لیں۔ مگر یہ ہماری ملک نہیں، مالک کی چیز ہے۔ ہمیں امانت داری کے ساتھ اسے سونپنا ہے اس واسطے اس کے کہنے کے مطابق ہم بدن میں تصرف کرتے ہیں، بدن بیمار ہو تو علاج کرتے ہیں۔ پھوڑا پھنسی ہو تو مرہم لگاتے ہیں اندر کا زخم ہو تو آپریشن کراتے ہیں، دوائیں پیتے ہیں تاکہ صحت ہو جائے اسی طرح روح کے اندر بھی پھوڑے اور پھنسیاں نکلتی ہیں۔ بیماریاں بھی آتی

ہیں۔ اخلاق کی بیماریاں ہیں اگر بد اخلاقی پیدا ہوگئی۔ حرص، حسد، بغض، تکبر اور غرور پیدا ہو گیا دوسرے کو ایذا پہنچانے کا جذبہ پیدا ہو گیا یہ روح کی بیماریاں ہیں۔

جیسے بدن کی بیماریوں میں علاج کے لئے آپ ڈاکٹروں اور اطباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ اس کی تدبیر جانتے ہیں، مادی ڈاکٹر نہیں جانتے۔ وہی بتائیں گے کہ تکبر کو کیسے دور کریں، لالچ کو کیسے چھوڑیں، حسد کو کیسے دور کریں۔ اس کے علاج اور تدبیر کے لئے کتابیں ہیں علوم و فنون ہیں۔ جو قرآن و حدیث میں سب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہم نہ اپنے بدن کے مالک نہ روح کے مالک اور جب ہم اپنے بدن اور روح کے مالک نہیں ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ہم آسمان اور زمین کے مالک کیسے ہوئے؟

روح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور وہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر آپ بدن اور روح کے مالک ہوتے تو جان آپ کے قبضے میں ہوتی۔ کوئی بھی نہ مرا کرتا، کسی کا انتقال نہ ہوا کرتا، کوئی مارتا تو فوراً کہتے کہ میں مالک ہوں۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری جان نکال سکے تو ملک الموت سے بڑی لڑائیاں ہوا کرتیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے۔ کہ آپ جان نکالنے آگئے جان تو میری ہے۔ مگر جب جان نکلنے کا وقت آتا ہے تو ایک منٹ کے لئے نہیں روک سکتے۔ پیدا بھی ہونا ہی پڑتا ہے، مرنا بھی پڑتا ہے، نہ جینا اپنے قبضے میں نہ مرنا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ نہ ہم جان کے مالک ہیں نہ بدن کے مالک اگر بدن پر اہمارا تسلط ہوتا، ہم کبھی بیمار نہ ہوتے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بدن خراب ہو، یا میرا بدن کمزور پڑ جائے۔ لیکن جب بیماری آتی ہے، بیمار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب کوئی آفت آتی ہے تو سبھی ہی پڑتی ہے۔

اس لئے جیسے بدن دوسرے کا ہے، اسی طرح اس پر غور و خوض آتے ہیں، وہ دوسرے کی طرف سے آتے ہیں۔ تو جب اسی طرح سے ہم بے بس ہیں کہ نہ آنا ہمارے قبضے میں، نہ جانا ہمارے قبضے میں۔ قصلاً قاتی ہے، آنا پڑتا ہے قضا لے جاتی ہے، جانا پڑتا ہے۔ جب ہم اپنے مالک نہیں تو اس زمین و آسمان کے مالک کیسے ہوئے؟ اسی طرح رات دن، اس کے بھی مالک نہیں۔ یہ ہمارے قبضے میں نہیں کہ رات کو لہبا اور دن کو چھوٹا کر دیں۔ یہ اس کے قبضے میں ہے جو رات دن کو پیدا کر رہا ہے۔ جب ہر صورت میں خالق و مالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدن کو پیدا تو وہ کرے۔ عبادت ہم دوسرے کی کریں، حکم دوسرے کا مانیں، گردن دوسرے کے سامنے جھکائیں۔ اسی کے آگے گردن جھکے گی، جس نے گردن کو بنایا ہے، اسی کے آگے ہماری روح اور بدن جھکے گا، جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب مالک و خالق وہ ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں، تو غلام کا کام یہ ہے کہ بے چون و چرا مالک کے حکم پر گردن طاعت سے جھکا دے۔ سر کٹی کرے گا تو غلامی سے نکل جائے گا۔ اسی لئے قرآن

کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ① ”ہم نے جنوں اور انسانوں کو خلق اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری بندگی کریں۔“ اس لئے کہ جب ہم پیدا کرنے والے ہیں، ہم مالک ہیں، تو کون ہے جو ہماری بندگی نہ کرے ہمارے سامنے نہ جھکے۔

بندے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے..... آپ ارادہ کریں نہ کریں، جھکنا تو پڑتا ہے موت آئے گی تو آپ جھکیں گے؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں موت کو قبول کرتے، مجبور ہونے پڑے گا۔ صحت و بیماری آئے گی۔ مجبور ہو کے اسے قبول کرنا پڑے گا مالک کے آگے جھکنا ہی پڑے گا محتاج کا کام یہ ہے کہ غنی کے آگے جھکے۔ اگر آپ غنی ہیں، جھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر غنی نہیں محتاج ہیں، تو پھر محتاج ہونے کو جھکنا ہی پڑے گا۔ تو بجائے اس کے کہ آدمی مجبوراً جھکے، رضا مندی سے کیوں نہ جھکے۔ مجبوراً تو آسمان، زمین اور پہاڑ بھی جھک رہے ہیں۔ یہ ان پر قہر ہے۔ لیکن انسان کو عقل و ارادہ اور اختیار دیا گیا۔ تو اور چیزیں ملے ارادہ جھکتی ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ارادہ سے جھکے، عقل سے سوچ کر جھکے، اپنے اختیار سے جھکے۔ اسی کا نام عبادت ہے تو بندے کا کام بندگی کرنا ہے اور بندگی کا معنی غایت تدلل کے ہیں۔ پوری طرح اپنے مالک کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت ہے۔ یہ کیوں اختیار کرے؟ اس لئے اللہ کی اتنی عزت ہے کہ عزت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے ہاں نہ ہو۔ تو بندہ اس کے سامنے انتہائی ذلت ایسے پیش کرے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ انسان کے اندر سب سے بڑی چیز عزت کی اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ نماز میں زمین پر اس کو ٹیکا جاتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی سب سے زیادہ عزت کی چیز کو تیرے آگے پامال کرتا ہوں۔ کیونکہ تیری عزت سب سے بلند ہے۔ غرض بندے کا کام بندگی کرنا ہے۔ جان سے بھی، مال سے بھی اور آبرو سے بھی۔ اس لئے کہ عزت کی ضرورت پڑے تو وہ وہاں سے آئے گی۔ مال و جان کی ضرورت پڑے، وہ وہاں سے آئے گا۔ اس لئے کہ بندہ نہ اپنی جان کا مالک نہ اپنی آبرو اور مال کا مالک۔ تو بندگی کا حاصل یہ لگنا کہ مال، جان، آبرو، سامان سب سے عبادت کرے۔

اس لئے اللہ نے عبادتوں کی قسمیں رکھ دی ہیں۔ ایک جانی عبادت ہے، وہ جان سے ادا کی جاتی ہے۔ جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں بدن کو، روح کو جھکاتے ہیں اور حج کرتے ہیں اس کے لئے سفر کرتے ہیں۔ ایک مالی عبادت ہے۔ جیسے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور غرباء کی خدمت کرتے ہیں۔ تو تینوں قسموں کی عبادتیں فرض کر دی گئیں۔ بندے کا کام یہ کہ جان، مال، آبرو سے بھی جھکے۔ جان سے نماز میں اور آبرو سے حج میں جھکنا ہے۔

آبرو سے عبادت..... اس لئے کہ جتنے وقار اور ظاہری عزت کے سامان ہیں، سب کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ذہن میں آدمی آبرو اور وقار جھٹلاتا ہے۔ تو مک چھڑوا دیا، تو جو وقار گھر کا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب مسافر بن کے چلا جا رہا ہے۔ پھر لباس آبرو اور وقار پیدا کرتا ہے، نیا لباس پہنتا ہے، اکڑ کے چلتا ہے۔ تو ختم دیا گیا کہ لباس اتارو، کسفی

پہنو، اور ننگے سر رہو۔ پھر آدمی بدن کی زینت سے اور چہرے کے بنانے سنوارنے سے وقار حاصل کرتا ہے۔ یہاں حکم یہ ہے کہ جب احرام باندھ لیا، بال، ناخن کتروانے کی اجازت نہیں، بدن میں جو کس چیز کا کس تو مارنے کی بھی اجازت نہیں، شکار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ بندہ عاشق بن کر جاتا ہے، عاشق کا زینت سے کیا کام؟ عاشق اگر اپنی زینت اور آرائش کرے گا تو محبوب کی طرف کیسے متوجہ ہوگا؟ وہ پکا عاشق نہیں اس لئے یہ سب کچھ چھڑوایا گیا محبوب کے گھر آیا تو پروانوں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے، طواف کر رہا ہے۔ محبوب نے کہا کہ مٹی جا، وہاں چلا گیا کہ سر منڈا، سر منڈا دیا۔ پھر کبھی آدمی چال سے وقار حاصل کرتا ہے کہ بن بن کر چلتا ہے۔ تو سارا وقار نکال دیا گیا۔ جب بیت اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ تو جس طواف کے بعد سعی کرنی ہوتی ہے، اس میں رتل بھی ضروری ہوتی ہے۔ کہ چار پھیروں میں اکڑ کے چلے۔ اب کوئی عالم ہو، لہو داڑھی ہو، وہ جبکہ کر چلا، مگر اب اکڑ کے چل رہا ہے جیسے پہلوان جا رہے ہوں۔ پھر رتل کا حکم دیا گیا جب تم رتل کرو اور پہلوانوں کی طرح چلو تو احرام کی چادر کو دائیں موڑ دے کے نیچے رکھ کے بائیں موڑ دے پر ڈال لو، تو سارا بدن کھل گیا۔ جڑ لوگ اپنا بدن کھولنا وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ وقار بھی ختم ہو گیا اسی طرح منامرہ میں دوڑنے سے وقار ختم ہوتا ہے۔

غرض وقار کی جتنی چیزیں تھیں۔ وہ سب ممنوع قرار دے دیں۔ توجہ میں آ رہا ختم کر کے اسے منا کر عبادت کرائی جاتی ہے۔ نماز کا قصہ برعکس ہے کہ گھر سے نکلے دوڑ کے مت چلو فرمایا گیا: "لَا تَأْتُواَهَا وَأَنْتُمْ فُتَحُونَ" ① "مسجد میں آؤ تو وقار کے ساتھ چلو۔ ایسے دوڑ کے مت چلو جیسے بچے دوڑا کرتے ہیں"۔ وہاں یہ حکم تھا کہ لباس اتار کر کٹھی پہنو۔ یہاں یہ فرمایا کہ پورا لباس پہن کر ننگے سر بھی نہیں، پورے وقار کے ساتھ نکلو۔ حج میں فرمایا کہ: خبردار! اگر تم نے خوشبو لگا لی۔ نماز کے بارے میں فرمایا، خود بھی خوشبو لگاؤ اور مسجد کو بھی معطر کرو۔ تو بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ نماز میں جان سے اور حج میں آ رہے عبادت کرائی جاتی ہے۔

عبادت مالی..... اب مال رہ گیا تھا تو زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھ دی کہ اس میں سے غرباء کا حق نکالو۔ پہلی امتوں کو حکم یہ تھا کہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ کر دو ایک پائی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر تم نے رکھا تو تمہاری روحانیت نہیں بنے گی۔ اخلاق درست نہیں ہوں گے۔ بس کھالیا، پی لیا اور پہن لیا۔ باقی جوڑا کہ ہے، صدقہ کر دیا اور اگر کوئی صدقہ لینے والا نہ ملے، تو حکم یہ تھا کہ اس مال کو آگ لگا دو "لَا تَحْمِلُہُ النَّارُ"۔ آگ اس کو کھا لیتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ صدقہ قبول ہو گیا، لیکن یہ امت ضعیف ہے۔ اس واسطے رعایت کی گئی کہ کھاؤ بھی، پیو بھی۔ اگر حج رہے تو یہ نہیں ہے کہ سب دے ڈالو۔ اس میں کچھ حقوق مقرر کر دیئے کہ اس طرح سے اپنے مال کو خرچ کرو اور اس میں فرائض مقرر کئے۔

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب السعی الی الصلوٰۃ، ج: ۲، ص: ۱۸۳، رقم: ۳۸۵، حدیث حسن صحیح ہے۔ دیکھئے:

صحيح وضعيف سنن ابی داؤد ج: ۲، ص: ۲، رقم: ۵۷۴.

جس مال کے حاصل کرنے میں آدمی کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اللہ نے اپنا حق کم کر دیا، تاکہ دینے میں آسانی ہو۔ جو مال کم محنت سے حاصل ہوتا ہے، اس میں اپنا حق بڑھا دیا کیونکہ دینے میں سہولت رہے۔ جس مال میں بالکل محنت نہ پڑے تو حصہ اور بھی بڑھا دیا۔ جسے حاصل کرنے میں آسانی تھی، تو دینے میں بھی آسانی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی کو دینہ یا خزانہ مل جائے۔ مثلاً لاکھ دو لاکھ کا زمین سے مل جائے۔ تو یہ بلا محنت کے ملا کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی اتفاق سے جنگل میں گئے زمین کو کھودنے لگے تو ایک بڑی بھاری دیگ نکل آئی یہ بلا محنت ملا۔ اس میں حق تعالیٰ نے پانچواں حصہ رکھا ہے۔ اگر سو روپے ہیں تو پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کرے گا۔ یعنی تیس روپے غریب کا حق ہے اور اسی روپے تمہارا حق ہے۔ اس لئے کہ سو میں سے تیس دینا مشکل نہیں ہوگا۔ جبکہ اسی بھی بغیر محنت و مشقت کے مل رہے ہیں۔ چونکہ اس میں محنت کم تھی تو اللہ نے اپنا حق بڑھا دیا۔

اگر کھیتی باڑی کی، تو کھیتی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اپنا حق گھٹا دیا۔ دینے میں پانچواں حصہ تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ دسواں حصہ دینا پڑے گا۔ یعنی سو روپے میں سے دس روپے دینے پڑیں گے۔ یہ بیت المال کا حق ہوگا جو غریبوں پر خرچ ہوگا۔ نو سو روپے تمہارے اپنے ہیں تو کھیتی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حق گھٹا دیا۔

اور اگر آدمی تجارت کرنے لگے تو تجارت میں زیادہ محنت ہوتی ہے تاجر کا دماغ صبح سے شام تک لگا رہتا کہ مال بھی باقی رکھوں، سامان میں بھی کمی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ گاہک آئے اور میری دوکان میں چیز نہ ہو تو صبح سے شام تک دماغ لڑاتا ہے گویا محنت زیادہ کرتا ہے۔ یہاں سے مال منگواؤ، وہاں سے مال منگواؤ، کہیں جنگل کا قصبہ ہے، کہیں لالری کا سسٹم ہے۔ غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس میں پھر ہر ایک کو خوش رکھنا، گاہک سے بھی معاملہ نرمی سے کرنا، اگر گاہک نے کوئی بے تمیزی کی، پھر بھی تاجر کا فرض ہے کہ اخلاق سے پیش آئے۔ بد اخلاقی برتنے گا تو گاہک دوکان چھوڑ کے چلا جائے گا۔

غرض یہاں بھر پور محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ نے اپنا حق اور کم کر دیا کہ تم بجائے خمس و عشر کے چالیسواں حصہ دے دو۔ سو میں سے اڑھائی روپے دے دو۔ تو سو روپے میں سے اڑھائی روپے دینے کوئی مشکل نہیں ہوتے۔ اور اس میں یہ آسانی کر دی کہ جس دن سو ہوئے، ذکوۃ تو واجب ہوگئی، لیکن ادا کرنا واجب نہیں جب تک کہ ایک برس نہ گزرے ایک برس میں اگر اور کمائے گا تو سو سے زیادہ ہو جائیں گے۔ پھر اڑھائی روپے دینا کچھ مشکل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ نے یہ عجیب اصول رکھا کہ جس میں بندے کی محنت بڑھتی ہے۔ اتنا اپنا حق گھٹا دیتے ہیں، جتنا بندہ بے محنت کمائے، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں تاکہ دینے کے اندر اسے عار نہ پیدا ہو، مشکل نہ پیش آئے۔

تو ذکوۃ میں غریبوں کا حق رکھ دیا گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کمانے میں آپ اپنے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی۔ غریب بھی اسی طرح آپ کی اولاد ہے۔ اگر یہ آپ کی کسی اولاد ہے تو حیثیت کے لحاظ سے وہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ ان کو اگر نہ دیا، آپ کے لئے پھر دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔ جب غریبوں کو حقوق

نہیں پہنچیں گے۔ پھر سرمایہ اور مزدور کا سوال پیدا ہوگا۔ وہ سارے کھڑے ہو جائیں گے کہ ان سرمایہ داروں کو نکالو یہاں سے اس میں زیادہ مصیبت پڑے گی۔

میں تو کہاں کرتا ہوں کہ اللہ میاں نے سو روپے میں اڑھائی روپے پر رکھے تھے۔ جب اس کے دینے میں پس و پیش کیا اور نہ دیا۔ تو اتنے بڑے بڑے ٹکس لگوائے کہ اسی فیصد گورنمنٹ کا اور بیس فیصدی تمہارا۔ اگر اڑھائی روپے دیتے رہتے، تو ساڑھے ستانوے روپے تمہارے ہوتے لیکن اب سو کماؤ گے تو اسی حکومت لے گی، میں تمہارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ یہ کفران نعمت کا نتیجہ ہے۔ اگر خدا کا حق پورا دیتے رہتے اور اس کے اصول پر قائم رہتے۔ دوسرا غلبہ نہیں پاسکتا تھا۔

بہر حال شریعت نے یہ ایک اصول رکھا کہ جتنی محنت اور مشقت زیادہ ہے اللہ میاں اپنا حق گھٹا دیتے ہیں اور جب بندے کی محنت کم ہو، اپنا حق بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً بکریاں ہیں، اگر تجارت کی ہوں تو چالیس بکریوں پر ایک بکری دینی پڑتی ہے اور گائے قتل ہوں، تو بیس گائے پر ایک گائے کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ بدن بڑھ گیا۔ تو اس کی تعداد گھٹا دی اور اگر اونٹ ہیں، پانچ اونٹ ہوں گے تو ایک اونٹ کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اونٹ گائے سے دو گنا تین گنا ہے۔ بدن بڑھ گیا تو عدد کم کر دیا۔ تو عجب حکمت سے ایک نظام قائم کیا ہے۔

عبادت مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم کرنا ہے..... اور مقصد یہ کہ امیر اور غریب کے اندر قرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو۔ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ غریب کو اوپر چڑھا دیا تاکہ توازن پیدا ہو جائے۔ یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا ایسی کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تاکہ غریب میں بانٹ دی جائے۔ اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو محضرت پہنچے گی۔

اول تو یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپیہ لے جاتا ہے۔ تو ہزار روپے کما کے لاتا ہے۔ اور ایک اتنا حق ہے کہ ہزار روپے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو جائیں گے؟ تو جو محنت کرے گا، اس کا حق زیادہ ہوگا۔ جو نہیں کرے گا، اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہو گئے۔ بلکہ صریح فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُ الْقَسَمَ بَيْنَهُمْ مَثْوً شَرًّا لَّيْسَ فِي الْاٰيَاتِ اِلَّا لِقَاؤُكُمْ فِيهَا بِمَا كُنْتُمْ فِيهَا تَخْتَلِفُونَ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھایا ہے۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا، کوئی امیر، کوئی غریب تاکہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور حمد ان پیدا ہو“۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدق کہہ دیتے۔ جسے دیتے وہ کہتا، میرے گھر میں بہت سا بچا ہوا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ تو تعاون اور ایک دوسرے

کی خدمت گذاری ختم ہو جاتی۔ اور اگر سرے کے سرے ہی بھٹک گئے ہوتے تو نہ آپ اسے دیتے، نہ دوا آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق، آپ اس سے بے تعلق۔ بالکل سارے مغفل ہوں جب بھی تعاون اور تہذیب نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں، جب بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تہذیب بھی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں، کچھ غریب، امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر سے اٹھی ہوئی ہو۔ اس واسطے حکمتِ باری اور تعاونِ باری کے لئے اللہ نے فرق پیدا کیا۔ تو فرق کو مٹا دینا یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقول کا فرق بھی مٹانا چاہئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے، اسے تو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بیوقوف ہے اسے عقلمند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے، رنگوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کالا، کوئی گورا۔ زبانوں میں اختلاف ہے۔ کسی کی عربی، کسی کی انگریزی، تو زبانوں، صورتوں، سیرتوں کا اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے، تو جب مختلف عقل سے مائیں گے، پس میں بھی اختلاف ہوگا۔ کوئی زیادہ کمائے گا، کوئی کم کمائے گا، اب اگر آپ جبر کر کے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے کہ سب برابر ہو جائیں۔ اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بعد پیدا ہوگا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہو گئے فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دے دوں اس کا جی نہ چاہے گا فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا، جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہو جائے گا غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حق رکھ دیئے کہ کچھ وہ نیچے اترے، کچھ یہ اوپر ہو جائے تاکہ یکجہتی پیدا ہوں۔

مثلاً رمضان شریف آیا اور فرض کیجئے آپ ایک لاکھ کے مالک ہیں۔ اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا واجب ہوا۔ ایک لاکھ کا چالیسواں حصہ اڑھائی ہزار ہوگا۔ تو اڑھائی ہزار غریبوں کے لئے ہوگا۔ غریب نے کیا سمجھا کہ میں غریب ہوں ہی میرے سر پر ایسے امیر موجود ہیں۔ جو میری خدمت کرتے ہیں۔ میں غریب نہیں ہوں، میں بھی دولت مند ہوں۔ تو وہ شکر گزار ہوگا کہ یہ اولاد کی طرح مجھے پال رہے ہیں۔ اس کے دل میں محبت بڑھے گی۔ رمضان شریف میں آپ نے دس ہزار روپیہ بنا اور فرض کیجئے کہ دس نہیں آدھی ہیں، انہوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں تقسیم کیے۔ اب یہ لاکھ دو لاکھ غریب کے پاس جو پہنچے گا۔ تو اس کے دل میں ممنونیت پیدا ہوگی کہ انہوں نے میری خبر گیری کی۔ یہ درحقیقت جتنے امراء ہیں، میرے۔ باب کی جگہ ہیں، میں ان کی اولاد کی جگہ ہوں، مجھے ان کا حق پہنچانا ہے۔

امیر نے یہ سوچا کہ میرے سے خدا نے کام لیا، میرے سے ان کی خدمت سرائی۔ میری دنیا بھی جی آخرت

بھی بنی۔ وہ غریب کا ممنون ہوگا کہ اگر یہ غریب نہ ہوتا تو میں صدقہ و زکوٰۃ کسے دیتا۔ خدا نے میرے سے ادا کر دیا، میری دنیا و آخرت بن گئی۔ غریب اپنی جگہ خوش، امیر اپنی جگہ خوش اور دونوں میں محبت پیدا ہو گئی۔

لیکن اگر غریب آدمی کہے، جو کچھ امیر کے پاس ہے سب پر قبضہ کر لوں۔ تو امیر کے دل میں یہ ہوگا کہ اگر میں نے نہ بھی دیا یہ کم بخت اسے اٹھالے جائے گا اور غریب کے دل میں کیا آئے گا۔ وہ کہے گا، امیر کے ذمہ ہے ہمیں دینا۔ ہمیں کوئی شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امیر کہے گا اگر میرا بس چل جائے تو میں سارے غریبوں کی گردن مار دوں۔ کمانی میری ہے، ہرے یہ اٹھا رہے ہیں اور غریب اس فکر میں رہے گا کہ جتنے امیر ہیں سب تباہ ہوں۔ میرے پاس حکومت آئے، میں آج ہی سب کو ختم کر دوں۔ جو برسرِ اقتدار آئے گا، وہ دوسرے کو ختم کرنے کی فکر میں رہے گا۔ یہ تو اسلام نے ایک تو ذرا قائم کیا کہ غریب امیر کا محبت اور عاشق بن جائے گا۔ امیر غریب پر شفیق اور مہربان بن جائے گا۔ تو اتحاد، تمدن بھی بنا، محبتیں بھی بڑھیں لیکن جبری تقسیم اور مساوات و برابری سے غیض و غضب پیدا ہوتا ہے۔ اس واسطے اسلام نے پہلی چیز تو یہ رکھی کہ محبت باہمی اور خلوص سے امیر غریب کو دے۔ ایک حصہ پر جبر کیا گیا کہ چالیسواں حصہ بھائی کو ضرور دو۔ ورنہ وہ بھائی ہی نہیں۔ اگر آخرت پیشِ نظر ہو تو خوش ہوگا کہ میری آخرت بن گئی۔ تو رمضان میں تو آپ نے یہ دیا۔

اب رمضان گزرا تو عید الفطر آئی، تو اسلام نے صدقہ فطر واجب کر دیا۔ ہر بچے کی طرف سے خواہ وہ عید سے پہلے ہی پیدا ہو، اس کی طرف سے بھی دینا پڑے گا۔ اب اگر ایک گھر میں بارہ آدمی ہیں تو بارہ روپے مثلاً نکلے اور سو آدمی ہیں تو سو روپے گھر سے نکلے۔ تو غریب کہے گا کہ رمضان میں انہوں نے مجھے نوازا تھا۔ عید آئی اب بھی انہوں نے مجھے نوازا دیا۔ ان سے بہتر میرا اور کوئی خیر خواہ نہیں، اب محبت اور بڑھ گئی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دکان تھی کہ کپڑا بکوا دیا۔ جگہ جگہ کپڑے بننے اور سپلائی کرنے کے کارخانے تھے اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ مانسیں بھی تھیں۔ مگر چھین کر دو روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا۔ جو انہوں نے چھوڑا۔ مگر ان ہتھکن کر وڑے کیا ہوتا تھا؟ یہ سب غریبوں خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ کونے میں جتنے غریب، یتیم اور یتیم تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھیں اور ان کے نقد و قیامت بنے ہوئے تھے۔ کہ فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں جوان ہے، فلاں بچہ ہے۔ غریبوں کے ہر گھر کیلئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے کپڑے عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور جہاں عید کا دن آیا صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ تو غریب کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے۔ بہتر سے بہتر کپڑا ملا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس قائم کی۔ بڑے بڑے علماء و آئمہ اس میں جمع تھے۔ وہ فقہ کے ہر مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ جس کو آپ آج فقہ حنفی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے اماموں کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، بڑے بڑے آئمہ و علم و فضل ان کی ایک کمیٹی بن گئی تھی۔ ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب چھ مہینے چھٹا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی۔ تو بیس جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا۔

یہ جو بچاس کی کمیٹی تھی، ان سب کو تنخواہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے خزانے سے دیتے تھے۔ کسی کو پانچ سو ماہوار، کسی کو ہزار۔ یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی۔ غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلعے ملانے کیڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ موزعین لکھتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ برس دن میں ادا کر دوں گا۔ مدت گزر گئی، اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا نہیں دیا۔ جب وقت گزر گیا اور نہیں ادا کیا۔ وہ اب امام صاحب سے کھڑے لگا کہ سامنے آؤں گا، تو شرمندگی پیدا ہو گئی۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آ رہے ہیں، اس گلی میں گھس گئے، اس کو پے میں چلا گیا تاکہ سامنا نہ ہو۔ ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خیال پیدا ہوا تو ایک دن آپ جا رہے تھے، ادھر سے وہ آ رہا تھا۔ وہ دیکھ کر ایک گلی میں گھسے، دوڑ کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ بھائی تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے وہ دینے کو نہیں تھے، اس لئے شرمندہ نہ ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا، تعلق بڑی چیز ہے روپیہ بڑی چیز نہیں ہے۔ تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت مگوار کرو۔ تعلق کو کیوں ختم کیا۔ ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کر دیئے۔ دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا، اس سے معاف کر دیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ..... پھر اس میں تقویٰ کا یہ حال تھا کہ۔ آخر مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے کپڑا ہوا کر سلائی کیا، کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے، کپڑا روک لیا تاکہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں چنانچہ یہی ہوا۔ جب یہ میعاد گزر گئی۔ اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جا کر بڑی خوشی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رکھے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے۔ یہ دو لاکھ کیسے ہو گئے؟ اس نے کہا

کہ میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا لیا تھا کہ جب ضرورت پڑ جائے گی، تب فروخت کروں گا۔ فرمایا، مضافاً اللہ اسی کا نام احکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ کہہ کر خدا ہوئے اور فرمایا یہ دولاکھ غریبوں کے اوپر صدقہ کر دے۔ یہ مال میرے کام کا نہیں ہے۔ اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جب ضرورت کا وقت تھا، تمہیں مقررہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے حتی کے سامنے غریب کا دل کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ ہر غریب کہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ میں غریب نہیں رہا۔ نہ میری بیوی، بچے اور گھر غریب ہے، کھانے پینے کو آ رہا ہے اور ام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی، میں نے غریبوں کی خدمت کی، مجھے اجر ملا، آخرت بنی اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی۔ اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔ بہر حال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی، مگر خوش ولی کے ساتھ، جبری صورت پر نہیں رکھی گئی۔ جہاں جبر کیا، وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو۔ سو پراڑھائی روپے اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں، سال بھر کی مدت رکھی تاکہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے جمع کے اصول پر نہیں..... اسلام نے مالیات کی جو بنیاد رکھی ہے وہ تقسیم کے اصول پر رکھی ہے، جمع کے اصول پر نہیں رکھی۔ یعنی روپے کو رکھا ہے کہ چلتا رہے، گھومتا رہے۔ جمع ہو کر ایک جگہ نہ پڑا رہے۔ زکوٰۃ آئی تو ادا کی۔ پھر صدقہ فطر کا وقت آیا، پھر خرچ کروایا، تو رمضان میں دیا۔ عید الفطر پہ دیا اب بقرعید آئی۔ اس میں قربانی واجب ہوئی۔ قربانی میں مستحب یہ ہے کہ چوتھا حصہ غریبوں پر صدقہ کر دے، اپنے رشتہ داروں کو دو، خود بھی کھاؤ اس موقع پر غریبوں کے گھر گوشت پہنچ گیا، سامان پہنچ گیا۔ اس سب کچھ کے بعد پھر فرمایا: "إِنَّ فِي قَابِ الْقَبْرِ حَقَّ سَبْعِ الزَّكَاةِ" "آدی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو ضرورت کے وقت ادا کرے۔"

اس کو اسلام نے یوں اہل بنایا کہ اخلاقی حانت درست کی اور کہا کہ سخاوت افضل ہے اور بخل اللہ کے پاس مغضوب ہے اس سے بغض وعداوت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا: "الْمَسْكِينُ حُبُّهُ مِنَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ اللَّهِ وَالْبَخِيلُ عَدُوُّ اللَّهِ يَبْعِدُ مِنَ اللَّهِ" ① "خفی اللہ کا دوست ہے اور اس کے قریب ہے بخل اللہ کا دشمن اور اس سے بعید ہے۔"

اس لئے کہ سخاوت اللہ کی صفت ہے، بخل اللہ کی صفت نہیں ہے دوست ہو دشمن، سب کو مل رہا ہے۔ سورج چمکاتے ہیں، دشمن بھی فائدہ اٹھاتے ہیں دوست بھی، مسلم بھی، کافر بھی، زمین پر غذا آگتی ہے، مومن بھی لیتا ہے کافر

① الحدیث أخرجه الإمام الترمذی فی سننه بطریق ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولفظہ: المسکین قریب من اللہ قریب من الجنة، قریب من الناس، بعید من النار، والبخیل بعید من اللہ، بعید من الجنة، بعید من الناس، قریب من النار..... أبواب البر والصلة، باب ما جاء فی السخاء، ج: ۵، ص: ۲۴۴، رقم: ۱۸۸۳۔

بھی، دوست بھی حصہ پارہا ہے دشمن بھی۔ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہے نکل نہیں ہے۔

البتہ مومن کے لئے خصوصی رحمت ہے کہ اسے دولت کے ساتھ اسلام ایمان، علم اور آخرت کا عقیدہ بھی دیا۔ یہ خصوصی توجہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے دوست، دشمن، مسلم و کافر سب برابر ہیں۔ تو جو دوسرا اللہ کا خاص وصف ہے۔ اس کے خزانوں میں سے رات دن خرچ ہو رہا ہے۔ جوئی ہوگا، اس نے گویا اللہ کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لی۔ نکل اللہ کی صفت نہیں ہے اگر کوئی نکل ہوگا تو اللہ سے دور ہو گیا۔ اسے اللہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے جہاں خرچ کا حکم دیا۔ وہاں سخاوت کی تفصیلات بیان کی تاکہ دینے پر آمادہ ہو۔ طبیعت میں گھٹن پیدا نہ ہو۔

قرن اول کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت..... اور یہ اتنا بڑھایا کہ قرن اول کے مسلمانوں میں دینا اتنا محبوب تھا کہ روکنا اتنا محبوب نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ گھریا رلا دیں۔ صحابہ میں حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہ بہت زبردست تاجر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ روم، شام اور مصر جگہ جگہ ان کا مال جاتا تھا اور نفع جو آتا تھا تو وہ یہ نہیں تھا کہ دو چار آدمی لے کر چلے جائیں۔ نوٹوں کو گڈی ڈالی اور لے کے چلے آئے۔ بلکہ ایسا تھا کہ اونٹوں پر لہ کر روپیہ، سونا، چاندی آتا تھا اور کثرت یہ تھی کہ جب گھر میں رکھے کو جگہ نہیں رہتی تھی، تو عاجز آ کے کہتے تھے کہ گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ اور اشرفیوں کا چھت تک ڈھیر لگ جاتا تھا۔ یہ دولت کی کیفیت تھی۔ گویا کروڑ پتی لوگوں میں سے تھے مگر اس کے ساتھ معاملہ کیا تھا؟ فرماتے کہ اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور معاہدہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ چودہ سو۔ تو ایک خاص برتن منگوا دیا جاتا۔ اس میں روپیہ اور اشرفیاں بھر بھر کر چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر گھر بھجوائی جاتیں کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ اسے قبول کر لیں۔ پھر پوچھتے کہ اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کتنے ہیں۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی معلوم ہوا تین سو تیرہ۔ پھر ان تین سو تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اشرفیاں بھجوائی جاتیں کہ یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔ جن کے ہاں پہنچتیں، وہ کہتے کہ اتنا مال ہم کیا کریں گے؟ وہ بھی آگے غریبوں میں بانٹنے۔ تو روپیہ پیسہ ادھر سے چل رہا ہے، ادھر سے نکل رہا ہے۔ سب سے زیادہ دولت کی محبت عورتوں کو ہوتی ہے۔ ان میں بھی سخاوت کا جذبہ اتنا بھر گیا تھا کہ دینا انہیں عزیز بن گیا تھا، رکھنا عزیز نہیں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہوں نے ایک بوری اشرفیوں کی بھر کر اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی خالہ کے گھر پہنچائی۔ جب یہ بوری پہنچی، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اتنا کیا کروں گی؟ خادمہ کو حکم دیا کہ اسے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ اس نے تقسیم کرنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک تقسیم کی ساری بوری ختم ہو گئی۔ باندی نے کہا، ام المومنین! تین دن سے آپ کے اوپر فاقہ ہے۔ خدا میں کچھ میسر نہیں تھا۔ آپ نے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا، فرمایا: "جا بے وقوف!"

پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی۔“ گویا یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر فائدہ ہے اور گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اس درجہ غنا اور سیر چشمی پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ کچھ ہے بھی یاد نہیں۔ عورتوں کے دلوں میں سخاوت کا اتنا جذبہ اور اتنی ہے تعلقی، یہ ایسی تعلیم اور فیض اور صحبت کا اثر تھا کہ جس میں آپؐ نے اخلاق سکھائے سخاوت کی فضیلت اور نکل کی مذمت بیان کی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب شام کے اوپر قافلہ بنے اور پوری خلافت ان کے ہاتھ میں آ گئی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ مگر خلافت کا استحقاق میرا ہے۔ مگر میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر تا ہوں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں سخاوت غیر معمولی ہے۔ تو ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر دستخط کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا کہ جتن چاہو لکھ دو۔ اتنا ہی آپ کو سنانا اور ماہانہ دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے لکھ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ وہ آتا اور تین دن میں ختم ہو جاتا۔ غریب، یتیموں اور فقیروں کو دینے میں ہی خوشی تھی جس پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ”لا تخیر فی الاسراف.....“ ”اسراف اور فضول خرچی میں خیر نہیں ہے۔ ڈھنگ سے دینا چاہئے۔ یہ نہیں کے ایک لاکھ آیا تو دو دن میں لے کے برابر کیا۔“ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ”لا ايسراف فی الخیر.....“ ”اسراف خیر کے اندر ہوتا ہی نہیں۔“ ① جب اللہ کے لئے دیتے ہیں تو اس میں ایک لاکھ دو لاکھ سب برابر ہیں۔ اس میں کوئی اسراف نہیں۔ غرض یہ کیفیت تھی اور یہ فیض صحبت کا اور اس تعلیم کا اثر تھا تو دینے کے کا قانون بھی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی قلوب میں دینے کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔

سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے..... یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی حیثیت سے سخاوت موجود ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی فرد یا شخص بخل پیدا ہو جائے۔ لیکن قوم کا مزاج جمع کا نہیں ہے۔ خرچ کرنے کا ہے۔ غریب امیر سب کے اندر جذبہ موجود ہے کہ دینے کی عظمت دل کے اندر موجود ہے، جمع کرنے کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی واقعہ پیش آ جائے، رکاوٹ پیدا ہو جائے تو الگ بات ہے۔ لیکن قوم کا مزاج قومی حیثیت سے سخاوت کا ہے، نکل کا نہیں ہے۔ مہمان نوازی ہوگی تو اپنے آپ کو بچھا دیں گے۔ دینا ہوگا تو دینے میں کمی نہیں کریں گے۔ قیموں کی خبر گیری کریں گے۔ اور اقوام میں دیکھنے میں آتا ہے کہ قومی طور پر یہ مزاج نہیں ہے۔ افراد بڑے بڑے نجی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں غریب ہووہ بھی نجی ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج دیا ہے۔ امیر نجی ہے، غریب نجی ہے حتیٰ کہ جو پیشہ ور لوگ تھے، ان میں سخاوت کا جذبہ ہے۔

معبد چنئی ایک بہت بڑا گویا تھا اور فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ منصور کے زمانے میں یہ گزرا ہے۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ جاکے غزل سنائی۔ تو چالیس ہزار روپیہ اس کی ایک دفعہ کی فیس تھی اور امراء اس کو دیتے تھے۔ شاہی

نزدانے سے دس ہزار روپیہ روزانہ مقرر تھا، خواہ وہ سنانے کے لئے آئے یا نہ آئے۔ گویا اس کی روزانہ دس ہزار روپے تنخواہ تھی۔ اندازہ کیجئے مبینے میں کتنا بڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے بارہوی خانے کے لئے تین بکرے مقرر تھے۔ دو ذبح کئے ہوئے، ایک صبح سالم زندہ۔ یہ تین بکرے روز بچتے تھے۔

اور کیوں بچتے تھے؟ تھا تو گویا مکر مہمان داری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو مہمان اس کے دسترخوان پر ہوتے تھے۔ امرا آئے تھے، کوئی گانا سیکھنے کے لئے کوئی اس کی مجلس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور وہ مہمانداری کرتا تھا۔ اس کا بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے اتنا کمایا کہ اگر ہم چاہتے تو سونے چاندی کی اینٹوں کے کل بنالیتے۔ لیکن جب انتقال ہوا تو نوے لاکھ روپے قرضہ چھوڑا جو بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ مہمانداری پر ادھر غریبوں، یتیموں، ناداروں پر خرچ کرتا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں رکھتا تھا۔

تو اسلام میں گویوں اور پیشہ وروں کی یہ حالت تھی۔ یہ اس تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا تھا۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے چلے تو ستر مینا کی پلٹن بارہ میل آگے رات تھی جو جا کے بادشاہ کے خیمے نصب کرتی تھی اور وہاں دو تین دن قیام ہوتا تھا جب وہاں سے روانہ ہوتا وہ سفر مینا کے لوگ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور آگے جا کر خیمے وغیرہ لگاتے تو یہ جو پلٹن تھی جو خیمے وغیرہ لگاتی تھی اس کے انچارج آفیسر کا نام شمع تھا۔ ایک موقع پر جا کر اس نے خیمے نصب کئے، عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچنا تھا۔ سامان سب مرتب ہو گیا۔ ایک فقیر کو پتہ چلا کہ یہ بادشاہ کا یکمپ پڑا ہوا ہے، تو اس نے کسی سے معلوم کیا کہ انچارج آفیسر کا نام کیا ہے اسے پتہ چلا کہ اس کا نام شمع ہے تو اس نے آکر بڑی خوش آوازی سے طرز سے ایک شعر پڑھا:

شمع بدست کوہ دیا ہاں غریب نیست ہر گاہ کہ رفت خیمہ زد بارگاہ ساخت

شمع کسی جنگل میں بھی غریب نہیں، جہاں جاتا ہے، شہر بنا ہوا تیار ہے، خیمے، شامیانے تیار۔ شمع کو خدا نے ایسی دولت اور انعام دیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں جائے جب بھی غریب نہیں، جنگل میں جائے جب بھی غریب نہیں۔ جہاں بھی جائے گا، خیمے لگ جائیں گے، بارگاہیں بن جائیں گی۔ اس نے اس خوشی آوازی سے جو پڑھا۔ اس کی آواز سارے کمپ میں پھیل گئی۔ تو شمع کو بڑا پسند آیا۔ حکم دیا، اس فقیر کو حاضر کر۔ تو تین لاکھ درہم اس کو دیئے۔ ایک غریب اور بھک متلے کو ایک دم تین لاکھ روپے مل گئے۔

اگلے دن صبح کے بعد اس نے آکر پھر اسی خوشی آوازی سے شعر پڑھا۔ اسے نے پھر بلایا اور تین لاکھ روپے اور دے دیئے۔ تیسرے دن اس نے پھر شعر پڑھا۔ تو تین لاکھ اور دیے دیئے۔ تین دن میں نو لاکھ روپیہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ چوتھے دن نہ آیا۔ اب شمع انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ وہ آئے تو میں دوں۔ مگر وہ نہ آیا۔ حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لاؤ، آج کیوں نہیں آیا۔ سپاہی اور پیادے دوڑے اور اسے پکڑ کے لائے۔

منعم نے کہا کہ تو کیوں نہیں آیا؟ اور تو بڑا بے وقوف ہے مجھے تو یہاں دس دن ٹھہرنا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس کے دس دن تجھے روزانہ تین لاکھ روپے دوں گا، بڑا احمق ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے کہ تین دن میں مجھے نو لاکھ روپے ملے ہیں یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ میری سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ میں نے یہ سمجھا یہ میرے لئے کافی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ جذبے میں آ کر دے دیا اور اگر کہیں یہ جذبہ آگیا کہ چھین لو اس سے تو پھر ایک پائی بھی میرے پاس نہیں بچے گی۔ اس لئے قناعت بھی نہ آنے کی باعث ہوئی، کہ میرے لئے کافی تھے اور خوف بھی باعث ہوا کہ کہیں چھین نہ لیں۔ اس واسطے نہیں آیا۔

اس نے کہا کہ یہ حیران عمل تھا۔ مگر میں نے یہ نتیجہ کر لیا تھا کہ دس دن میں روزانہ تجھے تین لاکھ دوں گا۔ تو ایک ایک افسر گویہ پشدر، اور ایک ایک عورت کا اسلام نے یہ مزاج بنا دیا تھا۔ سخاوت کے فضائل سنا کر، قانون کی فضیلت بتا کر کہ کس طرح خرچ کریں۔ مگر اس میں جبر نہیں تھا۔ دل کے واسطے اور جذبے سے آدمی دیتا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں جبراً دلوائی جاتیں، آدمی دینے سے ہزار ہو جاتا کہ کون اس قانون کے تحت اپنی دولت کو کھوئے کہ میں محنت کروں اور جبراً دوسرے کو دلوادیا۔ اس لئے جبر کرنے کی بجائے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا۔ خود اپنی خوشی سے دیں اور جو حصہ جبری تھا، جیسے زکوٰۃ، صدقہ فطر اور قربانی ہے۔ اس میں آخرت کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ بھی دل کے جذبے سے آدمی دیتا ہے۔ اسلام نے کہا کہ تو ایک حصہ قربانی کر۔ اس نے کہا، نہیں میں تو پورا اونٹ دوں گا۔ ساتوں حصے میری طرف سے ہوں گے۔ بلکہ لوگ کئی کئی قربانیاں کرتے ہیں تاکہ غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ تو ایک مسلم دولت مند بن کر خوش دلی سے دیتا ہے۔

تقسیم دولت میں اسلام اور کمیونزم میں فرق..... کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے مگر جبری طور پر اس سے غصہ اور غیض و غضب ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کر دو۔ یہ کائی میری ہے، لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کر دو، جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا، اسے ختم کر دے گا۔ وہ غالب آئے گا اسے ختم کر دے گا۔ آپ کے سامنے روس اور امریکہ کا مسئلہ ہے۔ ایک جگہ سرمایہ ہے ایک جگہ مزدوری کا دعویٰ ہے۔ یہ اس فکر میں ہے اور وہ اس کی فکر میں ہے دونوں کے انہم بم تیار ہیں وہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں، یہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں۔ یہ درحقیقت ایک دوسرے کا رطل ہے۔ یہ وہی جبر و تعدی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اسلام ہے۔ اسلامی قانون آجائے تو دونوں کی صلح ہو سکتی ہے اور یہ نہیں ہوگا تو دونوں ایک دوسرے کے مقابل ٹھریں گے۔

اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا..... اسلام اعتدال کا بل پر ہے کہ دلواتا بھی ہے اور اتنا دلواتا ہے کہ غریب کا گھر بھر دیا۔ مگر مساوات اور برابری قائم نہیں کی۔ بلکہ توازن پیدا کیا کہ امیر کو نیچے اتار دیا کہ

اگر حرے پاس ایک ناکھ ہے تو اپنے دل کے جذبے کے ساتھ غریبوں کو تیس چالیس ہزار روپے تو اسے نیچے اتار اور غریب کو اونچا کر دیا کہ وہ اس درجے پر سر ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میری پیدائش ہی اس لئے ہے کہ میں جو تیاں اٹھایا کروں، تکلیف اٹھایا کروں۔ حدیث میں ہے کہ جو غلام جنگ میں پکڑے ہوئے آتے تھے۔ لوگوں کو ان کو بیچ دینے کا حق تھا۔ یہ قانون تھا۔ لیکن تعلیم یہ دی کہ ”خَوِّلُكُمْ اِخْوَانُكُمْ“ یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنتے ہو، انہیں پہناؤ۔

حدیث میں فرمایا گیا: اگر کسی شخص کے ہاں باندی آگئی تو باندی کا نام براہوتا ہے، ایک حقیر لفظ ہے۔ باندی کی اگر اولاد ہو جائے۔ اسے بھی لوگ حقیر سمجھتے ہیں کہ یہ باندی کا بچہ ہے، سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام نے تعلیم دی کہ جس شخص نے اپنی باندی کو تعلیم دی، تربیت کی، اسے شائستہ اور مہذب بنایا پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو دو گنا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔

مثلاً فرمایا کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا، تو اسے اجر ملے گا جیسے کہ بنی اسماعیل میں سے اس نے سو غلام آزاد کر کے خاندان نبوت کو آزاد کر دیا۔ یہ اجر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاد میں جتنے غلام آتے تھے اس سے زیادہ وہ آزاد ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لئے لوگ آزاد کرتے تھے، تعلیم دیتے تھے، جو خود کھاتے تھے انہیں کھلاتے، جو خود پہنتے، انہیں پہناتے۔ تو وہ ان کے عاشق، یہ ان کے عاشق، تمدن بنا ہوا تھا۔ اس درجہ اسلام نے گویا غلاموں کے حق میں تعلیم دی۔

تو باندی کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی۔ ”فَاَحْسَنَ تَعْلِيْفَهَا“ اچھی تعلیم دی ”وَاَذْبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْذِيْبَهَا“ اس کو ادب سکھلایا، تہذیب سکھلائی، تربیت دی اور بہت عمدہ تربیت کی اور پھر اس سے خود نکاح کر لیا، گویا اس کو برابر بٹھلایا۔ وہ بے چاری باندی تھی۔ اس کو حر بنا کر اپنے برابر بٹھلایا۔ فرماتے ہیں اس کو دو گنا اجر ملے گا اور قیامت کے دن اس کو اجر و ثواب ہے۔ تو ہزاروں لوگوں نے باندیوں کو تعلیم دیں، تہذیبیں سکھلائیں۔ ①

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور اکابر تھے، وہ سب غلام ہی تھے۔ سب جہاد ہی سے آئے ہوئے تھے ان کو آزاد کیا گیا۔ حضرت حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ غلام ہی تھے۔ آزاد کر کے تعلیم دی گئی، تو مسلمانوں کے امام بن گئے اور صوفیاء کے اندر عظیم اشخاص شیوخ میں سے ہیں۔ سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ جہاد سے پکڑے ہوئے غلام بن کے آئے تھے۔ لیکن آزاد کر کے تعلیم دی تو اب بہت بڑے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ غلاموں میں سے تھے۔ لیکن بہت بڑے امام بنے۔ غرض اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلاموں میں اتنے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے کہ ہر مرفن میں انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ تو یہ اس تعلیم ہی

① الصحيح للبخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امته واخذ: ج ۱، ص ۱۷۰۔

کانتیجہ ہے بہر حال اسلام نے امیروں کو فریبوں کے اوپر شفیق بنادیا ہے اور اس درجہ پر شفیق بنادیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ غریبوں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جو وہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ انہیں بھی وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جان بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ ہماری روح بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ مال خدا کی ملک ہے تو مالی عبادت بھی رکھی گئی۔ آبرو خدا کی بخشی ہوئی ہے تو آبرو کی عبادت رکھی گئی۔ تو اللہ کے سامنے مال، جان اور آبرو کی کوئی پروا مت کرو۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اس لئے اس کے نام پر لٹاؤ۔

اسلام نے خرچ کرنے میں حدود بتلائی ہیں..... ہاں اس کی حدود بتنا دیں کہ حد کے اندر خرچ کرو، نہ اسراف کرو اور نہ فضول خرچی کرو کہ آج جذبے میں آ کے سب کچھ لٹا دیا۔ کل کو بھیک مانگنے کے قابل ہو گئے۔ لوگوں کے آگے ہاں پھیلاؤ اور اور نہ اتنا بغل کرو کہ ہاتھ ہی سکیڑ لو۔ ﴿وَلَا تَبْسُطْهُنَّ أَشْجُلَ الْاِنْسِطِ فَتُغْعَذَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾^① "نہ اتنا پھیلاؤ کہ سارے ڈالو اور کل کو بھیک مانگو۔ نہ ہاتھ اتنا سکیڑو کہ ہاتھ سے کچھ نہ نکلے۔"

درمیان میں جو اعتدال کا راستہ ہے وہ اسلامی تعلیم ہے کہ دو بھی اور رو کو بھی۔ مگر مصرف کو دیکھ کر کہ یہاں دینا صحیح ہے، یہاں اجر ہے لہذا دینے میں دریغ نہ کرو۔ برا مصرف ہے تو دینے میں بغل بن جاؤ۔ یہاں نہ دینا زیادہ بہتر ہے، یہاں نہ دینا ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے تھیز اور سینما پر خرچ کر دیا تو جائز چیزوں پر تو مال بھی گیا اور اوپر سے گناہ بھی سر پر۔ دنیا بھی ختم ہوئی، آخرت بھی برباد ہوئی۔ اور اگر آپ نے غریبوں، یتیموں، یتیم خانوں کو دیا تو گناہ نہیں گیا۔ اس لئے کہ غریب کو دیا۔ تو وہ آپ کا خادم ہو گیا وہ آپ کے کام آئے گا۔ اس لئے گویا وہ اپنے ہی گھر میں رہا اور اپنے بھائی کو دیا، تو اپنے گھر میں رہا اور آخرت الگ بن گئی۔ اللہ کے کہنے کے مطابق دینے سے دنیا بھی فنی ہے، آخرت بھی فنی ہے، اور اللہ سے کٹ کر دینے میں دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی جاتی ہے۔ غلط راستے پر خرچ کرنا ظاہر بات ہے، یہ غلط ہی ہوگا۔ اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔

مال حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے..... بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مال غلط طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ غلط ہی مصرف میں خرچ بھی ہوتا ہے۔ جو جائز طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے، مگر جائز راستہ پر خرچ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ محض مال کے مصرف کو دیکھ کر کہ کہاں خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس سے ماخذ کا پتہ چلاؤ کہ یہ آیا کہاں سے ہے۔ جب برے راستے پر جا رہا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ برے ہی راستے سے آیا ہے۔ حرام مصرف میں جا رہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کمانے میں ضرور کوئی ناجائز صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے یہ برے مصرف میں گیا۔ اگر خالص حلال کی کمائی ہوئی تو برے مصرف میں نہ جاتا۔ تو حلال کی کمائی مقدار میں تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر بدن کو بھی لگتی ہے۔ روح میں بھی بتاشت پیدا کرتی ہے اور اس سے آخرت

بھی بن جاتی ہے۔ اور ناجائز کمائی اگر بہت بھی ہو جائے تو نہ روح میں تسکین آتی ہے۔ نہ بدن کو تسکین ہے نہ دوسرے کے کام آتی ہے۔ ناجائز طریق پر ہی بناتی ہے۔ اس لئے جائز فی طریق پر کمایا جائے گا۔ وہی کارآمد ثابت ہوگا۔

لحمہ حلال قرب خداوندی کی شرط اول ہے۔ اسلام میں لحمہ حلال اللہ کے قرب ہونے کی سب سے پہلی شرط ہے۔ حرام غصے سے کبھی قرب پیدا نہیں ہوتا۔ توفیق مجھن جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ ناجائز کمائی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے قلب میں نور ہوتا ہے نیک کام کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے۔ ناجائز کمائی کھا کر توفیق مجھن جاتی ہے اور سرکشی کرنے اور برے کام کرنے کو جی چاہتا ہے برا فرق پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔ شاہ جی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو کہتے تھے۔ بالکل بے پڑھے لکھے تھے مگر صواب نسبت تھے۔ ذکر و شغل ان کا مشغہ تھا۔ اللہ والے تھے۔ انہیں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے معاش کا یہ مسئلہ نہ رکھا تھا کہ گھاس کھو کر بیچتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی کے چھ میسے متعین تھے۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے اور نہ زیادہ اور لوگوں کا دیوبند میں یہ حال تھا کہ جنہیں جانوروں کے لئے گھاس خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔ اور بھی بہت سے مرد و عورت گھاس بیچنے والے تھے۔ ان کی گٹھڑیاں رکھی ہیں۔ مگر کوئی نہیں ان سے بیٹا تھا۔ ہر ایک کا جذبہ یہ تھا کہ شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے ہر میں برکت ہو جائے گی۔ اس لئے سب انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور جہاں دیکھا کہ شاہ جی گٹھڑی لے کر آئے۔ لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے۔ بس جس نے پہلے ہاتھ لگا دیا شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے کہ بس نے چاہا۔ اسی کی گٹھڑی ہو جاتی تھی اور چھ پیسے متعین تھے۔ سردی ہو اگر میوہ برسات ہو نہ ایک پائی کم نہ زیادہ۔

اس کا مصرف ان کے ہاں یہ تھا کہ دو پیسے اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ اس زمانے میں پیسوں کے کچھ تاجرانے کٹے کٹے آتے تھے۔ جنہیں منصور کی پیسہ کھانا چاہتا تھا۔ ایک پیسے کے بہت سے کٹے آ جاتے تھے۔ تو دو جیسوں کے بہت سے کٹے آئے اور وہ کٹے غریبوں میں تقسیم کر دیئے۔ اور دو پیسے روزانہ ان کے گھر کا خرچ تھا۔ ایک پیسے میں اوصید کا آنا اور کچھ تیل وغیرہ لے لیا۔ بہر حال گھر کی ضرورت دو پیسے میں پوری کرتے۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب اس کے کچھ چھ سات روپے بن جاتے۔ تو اس رقم سے ہمارے ان بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ مولانا رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا رشید احمد صاحب گٹھوی، مولانا محمد یعقوب صاحب اعلیٰ اللہ مرآۃ جم جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے۔ حضرت حاجی امجد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی دارالعلوم آتے۔ ان کی بھی دعوت کرتے سال میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہ یہ فرماتے تھے کہ سال بھر نہیں انتظار رہتا تھا کہ سب دعوت کا وقت آئے اور شاہ جی کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا، جس دن ان کے گھر کا کھانا

کھاتے۔ چالیس دن قلب میں نورانیت رہتی اور جذبہ انھما کہ نماز پڑھو، تلاوت بھی کرو، ذکر اللہ میں مشغول رہو۔ یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں سال بھر دعوت کا میں انتظار رہتا۔

ایک دفعہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ بے چارے بیمار ہو گئے۔ تو مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہلا کے بھیجا کہ میں تو مریض ہوں آنکس سکتا یہ سات آٹھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میری طرف سے ان بزرگوں کو کھلا دیں۔ یہ پیسے جب مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس پہنچے تو غسل کیا، کپڑے بدلے، زمین کو پاک کیا، اس پر بیٹھ کر خود کھانا پکایا اور ان سب بزرگوں کی دعوت کی، تو حلال کے لقمہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ عبادت و طاعت کا جذبہ انھما ہے۔

حلال کمائی ہی میں برکت و نورانیت ہے..... آج جو ہماری کیفیت چھن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کمائیاں مشتبہ ہو گئیں۔ اے ماشاء اللہ۔ اللہ کے نیک بندے ہزاروں، لاکھوں ہیں۔ وہ اپنے نزدیک اپنی ہمت صرف کرتے ہیں کہ جائز طریق سے کمائیں، لیکن ہمارے بھائی بہت سے ایسے ہیں کہ انہیں پرواہ نہیں ہے۔ جائز ہو، ناجائز ہو۔ بس چیرا آنا چاہئے۔ اس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو مال کی وجہ سے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے، چیرا آنا چاہئے۔ لیکن انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پیسے میں برکت نہیں ہوتی اس قسم کی ناجائز کمائی اپنے کو بھی ضرر پہنچاتی ہے اور بعض اوقات پورے خاندان کو بھی لے ڈالتی ہے۔ یہ ناجائز کمائی سختی نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ”مَنْ خَالَطَ الصَّدَقَةَ مَا لَا فَلَ إِلَّا أَهْلَكَتْهُ“ ① ”جس مال میں زکوٰۃ ملی رہ جاتی ہے، وہ اس المال کو بھی لے ڈالتی ہے۔“

زکوٰۃ ملے ہوئے رہ جانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ فرض ہوئی اور نہ دی، وہ اس المال کسی نہ کسی دن تباہ ہوگا۔ ایک یہ ہے کہ دوسرے نے زکوٰۃ دی کہ غریبوں کو دے دینا۔ اس نے خود رکھی، حالانکہ خود امیر تھا اسے اپنے مال میں ملا لیا تو یہ اس کے اس المال کو تباہ کر کے رہے گی۔ غرض جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہ جاتی ہے۔ وہ غنی کے مال کو لے ڈالتی ہے۔ تو وہی بچتا ہے، جو بالکل جائز اور حلال طریقے سے کمایا جائے اس میں برکت بھی ہوتی ہے، دل میں نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اور ویسے مال بڑھ جائے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کی مثال بالکل ایسی ہے زکوٰۃ اگر نہیں دے گا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے۔ ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار روپے دیے جاتے، جب نہیں دے گا تو ایک لاکھ پورے ہیں اور جو زکوٰۃ دے رہا ہے، بظاہر اس کا مال گھٹ رہا ہے۔ مگر حقیقتاً بڑھ رہا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے جس نے صحت حاصل کرنے کے لئے مسیبل کیا، تو بالکل

① شعب الایمان للبیہقی، فصل فی الاستصاف عن المسائلۃ ۳/ ۱۵۹، علامہ عجلی فرماتے ہیں: رواہ البیہقی وابن

عدی عن عائشۃ بسند ضعیف ج: ۴ ص: ۱۸۸۔

لاغر اور کمزور ہو گیا۔ مگر وہ کمزوری صحت کی علامت ہے کہ مادہ فاسد نکل گیا۔ چار دن کے بعد قوت آئے گی اور صحت مند و توانا ہو جائے گا۔ یہاں بظاہر بدن گھٹ گیا مگر حقیقتاً بڑھ گیا۔ کیونکہ چار دن کے بعد صحت بحال ہونے والی ہے اور اگر خرچ نہ کیا اور مال رہ گیا۔ یہ ایسا ہے جیسے بدن میں رول پڑ گئی۔ تو دیکھنے میں تو پهلوان معلوم ہو رہا ہے۔ مگر صحت ساری برباد ہو رہی ہے۔ چند دن کے بعد یہ صحت ساری ختم ہو جائے گی۔ جو دے کر مال گھٹتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے سہل سے بدن گھٹتا ہے، وہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اور نہ دینے سے جو مال بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ ایسا ہے جیسے رول چڑھ گیا کہ دیکھنے میں آدی بہت سونا نظر آتا ہے اور حقیقت میں اندر سے جان نکل رہی ہے۔ تو یہ ظاہری توانائی اور ظاہری زیادتی کا بل اعتبار نہیں ہوتی۔ اصلیت جس سے بدن میں توانائی اور نور پیدا ہوتا ہے وہ حلال اور جائز کمائی سے ہوتی ہے۔

بہر حال اسلام نے جہاں مال کے خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا۔ اس کی رو آد طریقہ بھی بتلایا کہ اس طرح سے کماؤ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ اور ایسے پیشوں سے روک دیا ہے۔ جو حقوق کے لئے ضرر پہنچانے والے ہوں۔ چوری، ڈکیتی سے روک دیا، سود، سٹے سے روکا، جوئے سے روکا، قمار بازی سے روکا، کہ ان میں ظاہر میں بڑھتا ہے، حقیقت میں گھٹتا ہے۔ عموماً دیکھا ہے کہ سودی لین دین کرنے والوں کا ابتداء میں مال بڑھ جاتا ہے لیکن جب دعوایہ ہوتے ہیں۔ تو ایسے ہوتے ہیں کہ بھک مگے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ کسی کا ہارٹ فٹس ہو گیا کوئی گریز اتوا قسم کا مال بچانے کی بجائے اور زیادہ وبال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اول تو یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز کمائی ظاہر میں تو آدمی خود کھاتا ہے اور حسبِ دیوالیہ ہوتے ہیں تو فقیر کو تھوڑا دینا پڑتا ہے، بادشاہ اور افسران کو زیادہ دینا پڑتا ہے۔ بس رات دن ہزاروں روپے اسی میں لگا رہے ہیں۔ کچھ کسی نے چوری کر لیا تھا، کسی نے ڈکیتی کر لی اور گورنمنٹ نے ٹیکس بھی لگا دیئے اور اب پریشان ہو رہا ہے کہ اتنی مشکل سے کمایا۔ لیکن اگر اعتدال کے ساتھ کمائے اور اعتدال کے ساتھ خرچ بھی کرے۔ اس کا یہ برا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کا بھی ڈھنگ بتلایا۔ دونوں میں اعتدال پیدا کیا۔ اور قانونی طور پر جبر نہیں کیا۔ جبر کیا بھی تو بہت معمولی کہ دینا آسان ہو۔ اخلاقی طور پر زیادہ زور دیا ہے۔ لاکھوں نظیریں موجود ہیں کہ قانونی طور پر زکوٰۃ و صدقات واجبہ دیتے ہیں اور اس کے بعد بھی دینا اور دے کر خوش ہونا، مہمانداری وغیرہ، یہ مسلم کا گویا ایک پیشہ اور شعار ہے۔

اتفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرزِ اسلوب..... اس طرح سے اسلام نے مالی عبادت بھی سکھائی اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا تو کیسے پیارے انداز میں حکم دیا کہ واقعی دینے کو جی چاہے۔ فرمایا ﴿وَاتَّقُوا مِمَّا رَزَقْنَكُمْ﴾ ① ”خرچ کر اس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے“۔ یعنی تم کہاں سے لے کر

آئے ہو، مال تو ہمارا دیا ہوا ہے۔ پھر اس میں سے خرچ کرتے ہوئے تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے، کیوں تمہارا جی ٹھہراتا ہے۔ اگر یوں فرماتے کہ اپنی کمائی دے ڈالو۔ تو آدمی کو ذرا دکھ ہوتا کہ بھی! کمائوں میں اور دوسرے کو دے ڈالوں۔ اس لئے عنوان یہ اختیار کیا کہ ﴿وَأَنْفَقُوا مِنْهُ زَوَاقِفَكُمْ﴾ ① جو ہم نے دیا تھا اس میں سے دو۔ آدمی سمجھے گا کہ میرا تو ہے ہی نہیں، انکا ہے۔ دو مانگ رہے ہیں، میں دے دوں۔

یہ ایسا ہے جیسے آپ کا ایک بچہ ہو اور اسے آپ دو روپے دیں۔ اس کے بعد کہیں کہ بیٹا دو پیسے ہمیں بھی دے دے ظاہر بات ہے کہ بچہ جو دے گا۔ وہ خود کما کے تھوڑا ہی لایا ہے، وہ تو باپ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اسے دینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ باپ ہے اور پھر مجھ سے مانگ رہا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ تو دینے والے حق تعالیٰ خود ہیں۔ پھر کہتے ہیں بھی! جو ہم نے تجھے دیا تھا۔ اس میں سے ہمیں بھی کچھ دے دے۔ تو دینے والے کو بھاری نہیں گزرے گا کہ دینے والے اور مالک بھی خود ہیں، وہ مانگ رہے ہیں۔ پھر یہ مانگنے کے بعد جو رقم نے دے دیا۔ پھر یہ نہیں کہ تمہارا تعلق اس سے ختم ہوا۔ نہیں، فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْفَرُ مِنَ اللَّهِ قَرَضًا خَسَنًا﴾ ② ”کوئی ہے جو اللہ میاں کو قرض دے“۔

دنیا میں تو قرض کے اوپر سود حرام قرار دے دیا کہ جتنا قرض لو، اتنا ہی رو۔ قرض دینے والا اوپر سے زیادتی لے، وہ سود ہے، ناجائز ہے اور خود سود دیتے ہیں۔ بلکہ سود رسو کہ اگر کسی نے دس روپے ہماری راہ میں دیئے تو تمہیں دس کے ستر دیں گے۔ یہاں قرض کے اوپر سود دے رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں میں سود اس لئے حرام قرار دیا کہ کمائی محدود ہے، تھوڑی سی کمائی ہے۔ اس کے اوپر ہم نے دس روپے قرض پر پانچ اور بڑھا دیئے تو دینے والے پر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کی دولت محدود تھی۔ جب ظلم کے طور پر اس سے پانچ اور لیں گے تو کیسے دے گا؟

اور اللہ میاں کی دولت لامحدود ہے۔ اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آ سکتی۔ تو اپنے حق میں سود کا سلسلہ جائز رکھا، انسانوں کے حق میں ناجائز رکھا اور فرمایا: ﴿مَنْ لِي الَّذِي يَنْفَقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِي سَبِيلَ اللَّهِ كَمَنْ لِي خَيْبَةُ أَنْتَبَسَتْ سَبِيلَ لِي كُلِّي سُبُلِيَّةٍ بَقَاةٌ خَيْبَةُ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ ③ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے گیسوں کا ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جائے، گیسوں کا درخت اگا۔ تو سات بالیاں اس میں سے نکلیں اور ہر بالی کے سودا نے تو ایک دانہ ڈالا تھا اور سات سودا نے نکل آئے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ نے اللہ کو ایک دانہ قرض دیا اور سات سودا نے وصول کئے۔ تو سات سو گنا کون سود دیتا ہے۔ یہ تو اللہ میاں ہی دیں گے۔

اور آگے یہ بھی فرمایا کہ: سات سو پر بس نہیں۔ اللہ اگر بڑھا نا چاہیں تو کون روکنے والا ہے۔ وہ لاکھوں گنا سود دے دے۔ جب بھی اس کے ہاں کمی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص چھوہارے کی ایک محضل صدقہ

① پارہ ۳۸: سورۃ المنافون، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ ۲۷: سورۃ الحديد، الآیۃ: ۱۰۔ ③ پارہ ۳: سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۶۱۔

کہتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے پالتے ہیں اور ایسے پالتے ہیں، جیسے تمہارے ہاں گھوڑے کا کوئی بچہ ہو تو تم اسے دودھ پلا کر پال لو۔ چند دن کے بعد ہی وہ گھوڑی بن جائے اور سواری کے قابل بن جائے۔ فرمایا، جو ایک غھٹلی بھی صدقہ دیتا ہے ہم اسے پال کر جنس احد کے برابر کر دیتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ اجر کے ڈھیر سامنے آئیں گے۔ تو بندہ حیران ہوگا کہ میں نے کون سا ایسا صدقہ کیا تھا۔ جس کے بدلے میں یہ پہاڑ جیہہ اجر سامنے ہے۔ فرمائیں گے، تو نے غھٹلی صدقہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تیرے غلوں کے جب سے اس کو پال کر پہاڑ کے برابر کر دیا۔ اندازہ کیجئے ایک پہاڑ میں ست چھوہارے کی کتنی غھٹلیاں نکل سکتی ہیں۔ ایک غھٹلی اس نے صدقہ کی اور اربوں کھربوں غھٹلیوں کے برابر اس نے اجر لے لیا۔ تو اللہ کے ہاں نہ سوسے کی، نہ سو سو سے کی۔ وہ درد نیا ستر و آفریت، کا مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دس دے دو، آخرت میں ستر مل جائیں گے۔

ایمان اور سکون قلب و دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں..... اور آخرت تو آخرت دنیا میں بھی مل جاتا ہے، اللہ کی راہ میں دینے والے کبھی محروم نہیں ہوتا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ان بھی لیں کہ اس نے دینے۔ مگر اس کے بدل میں کچھ نہ ملا۔ مگر جو قرب میں ایمان اور سکون کی دولت ہوتی ہے۔ وہ کروڑوں سلطنتوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے جو اس پر عطا کی جاتی ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ بس جب مل گیا، پہن لیا۔ کبھی شابانہ لباس، کبھی پھنے پرانے کپڑے وہ بزرگ پھنے پرانے کپڑوں سے چلے جا رہے تھے ایک شہر سامنے آیا تو سارے شہر کے دروازے بند۔ اب ہزاروں گاڑیاں اندر جانے والی، وہ باہر کی ہوئیں، اور اندر کی اندر۔ تجارت و کاروبار بھی سب بند۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھی! یہ دروازے کیوں بند ہو گئے۔ لوگوں نے کہا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز کھو گیا باز ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ کھو گیا ہے۔ تو بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھو گیا۔ شہر کے دروازے بند کر دو اور اسے کہیں سے پکڑ کے لاؤ۔

انہوں نے کہا، کیسا احمق بادشاہ ہے بھی! پرندے کو اس سے کیا کہ دروازے بند کئے ہیں۔ وہ اڑ کے باہر چلا جائے گا۔ اسے دروازے کی کیا ضرورت ہے ایسا احمق آدمی ہے۔ پرندے کو اگر پکڑنا تھا تو شہر پر جال لگو اور بتا کہ اوپر سے اڑ کے نہ ٹٹکے۔ دروازے بند کرانے کی کون سی نیکی ہے اور اس بزرگ نے کہا۔

یا اللہ! یہ آپ کی عجیب قدرت ہے کہ اس کندہ تا تراش کو تو بادشاہ بن دیا جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے یا شہر کے دروازے بند کرانے چاہئیں اور مجھ جیسے فاضل، عالم کو جب تک منہ نہ دکھا ہے کہ جو تیناں چننا تے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔ عجیب آپ کی قدرت ہے اور آپ کا نظام کہ اس احمق کو سلطنت دے دی اور مجھے جو تیناں چننا نے کے لئے چھوڑ دیا اس بزرگ کے دس میں یہ دسویں گدرا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ یہ تمہارے لئے تیار ہو کہ تمہارے دل کی، ایمان کی دولت اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی منفعت تمہیں دے

دیں۔ حجاز اگلے عرض کیا۔ نہیں، یا اللہ! ایمان نہیں دیتا چاہتا۔ فرمایا اتنی بڑی دولت دے دی۔ پھر بھی بے وقوف اپنے کو بھکڑا سمجھ رہا ہے، یہ دولت ظاہری جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوگی، جس کے پاس ایمان ہے وہ دولت ہے جو ابد آباد تک چلنے والی ہے۔ تو تجھے ابدی دولت دی اور اسے عارضی دولت دی، تو نے اس کی قدر نہ کی۔

پھر تو پہ کی اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر۔ واقعی تو نے مجھے دولت مند بنا دیا۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر کون دولت مند ہے۔ یہ دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی دی۔

مسلم کو دنیا بطور حق نہیں بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے..... میں تو کہا کرتا ہوں، دنیا میں جتنی دولت ہے۔ مسلمان اس کا قطعاً حقدار نہیں ہے۔ یہ کفار کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی آخرت نہیں ہے۔ انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دیا جاتا ہے اور یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایک مسلم یوں کہے کہ آخرت بھی مجھے ملے، دنیا بھی مجھے ملے اور کافر غریب کو کچھ بھی نہ ملے۔ دوسرے کے حق کو ساقط کر دینا، اسے محروم کر دینا، یہ کوئی دانش مندی کی بات ہے؟ مسلمانوں کو جو دولت ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ جہاد کرے گا، حکومت مل جائے گی۔ جدوجہد کرے گا، دولت مل جائے گی۔ غرض مسلمانوں کو دولت اور دنیا جو ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے اس کا حق نہیں ہے۔ کافر کو خدمت کے صلے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا حق ہے اس لئے کہ آگے اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ یوں چاہیں کہ اس دنیا کی دولت بھی میرے ہی پاس آ جائے۔

پھر بھی یہ اللہ کا فضل ہے کہ اگر خدمت کرتا ہے تو مسلم کو دولت دنیا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ مقصود اصلی نہیں ہوتی، مقصود اصلی آخرت ہی ہوتی ہے۔ یہ دولت بھی اس کے لئے وسیلہ بنتی ہے۔ حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا کے موقع پر جب آپ کی ازواج مطہرات نے جان و نقد طلب کیا اور گھبرا ڈال کر بیٹھیں کہ ہمیں بھی تو کچھ دینا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کورنگ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنارہ کشی کر کے اوپر ایک حجرہ تھا اس میں بیٹھ گئے اور بول چال بند کر دی۔ چہرہ مبارک پر بشارت نہیں رہی کہ میرے گھر والے مجھ سے دولت طلب کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر بیٹھ گئے۔

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اوپر آنے کی اجازت چاہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اور ایک چمڑے کا چھوٹا سا برتن۔ جس میں تھوڑا سا شہد تھا۔ یہ کل سامان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر اٹھ بیٹھے تو کمر مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ یا رسول اللہ! قیصر و کسریٰ جو بادشاہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے تخت، نرم بستروں اور محلات میں آرام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور اس حالت میں کہ بدن مبارک

کے اوپر چٹائی کے نشان اتر آئے ہیں۔ کوئی چیز بچانے کی میسر نہیں تھی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے فرمایا: ”أَوْفَىٰ هَذَا أَثَنٌ يَأْتِيَنَّكَ الْخَطَابُ؟“ ”اے ابن خطاب! کیا تو ابھی تک حیرت میں پڑا ہوا ہے؟“ ”أَوَلَيْكَ فَوْمٌ غَجَلَتْ لَهُمْ طَبِيبَةُ لَهُمْ فِي الْخَبْلَةِ الدُّنْيَا“ ”تو نے قیصر و کسریٰ کا نام لیا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور تیرے اندر ہم و ایمان اور دین کی دولت ہے۔ پھر بھی تجھے حرص پیش آئی اور اس قوم کی جس کے لئے انعام میں کچھ نہیں ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔ یہ مت کرو۔ یہ حرص ٹھیک نہیں۔ شکر کی چیز یہ ہے کہ دولت ایمان عطا کر دی۔ جس کے پاس ایمان ہے، وہ کبھی غفلت نہیں ہو سکتا۔ اللہ دولت دنیا دے تو شکر کا مقام ہے اور نہ دے تو تب بھی دولت مند ہے۔ اس لئے کہ بڑی دولت میسر ہے۔ ①

بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے۔ اس لئے چونکہ جان بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، روح بھی اللہ کی دی ہوئی ہے مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور یہ چیزیں نہ صرف دی ہوئیں بلکہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو وہی مالک بھی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے یہ چیزیں اسی کے کہے کے مطابق لٹائی جائیں گی اور خرچ کی جائیں گی۔ کیونکہ مالک وہ ہے اگر وہ یوں کہے کہ سب مال لادو، لادو، لادو چاہئے۔ اگر وہ یوں کہے کہ بخیل بن جاؤ، بخیل بن جانا چاہئے۔ اگر یوں کہے کہ جان دے دو، دے دینی چاہئے۔ وہ کہے ہرگز مت دو، روک لینی چاہئے۔

اصل میں عبادت اسی کا نام ہے کہ اطاعت محض کی جائے۔ جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دی جائے۔ یہی عبادت ہے۔ ظاہر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا نام عبادت ہے۔ یہ عبادت نہیں ہے یہ جزئیات ہیں، عبادت کی مثالیں ہیں۔ کہنا ماننے اور زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے۔ پانچ وقت مؤذن اعلان کرتا ہے کہ نماز پڑھو۔ نماز پڑھنا عبادت ہے۔ پانچ وقتوں میں نماز فرض ہے۔ نماز ادا کی جائے گی اور تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ جب آفتاب طلوع و غروب ہو رہا ہو یا سر کے اوپر آ گیا ہو، ان تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ اگر پڑھے گا تو قبول نہیں ہوگی۔ معلوم ہو: نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں پڑھو، جب ہم کہیں رک جاؤ، یہی بندہ کا کام ہے۔ رمضان شریف میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ اگر نہیں رکھو گے تو گنہگار ہو گے اور عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر رکھو گے تو گنہگار ہو گے۔ معلوم ہو: روزہ رکھنا نہ رکھنا عبادت نہیں کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں کہ مت رکھو، پھر چھوڑ دینا عبادت ہے۔

خودکشی حرام ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنی جان کو خود ختم کر لے۔ لیکن اگر وہ حکم دیں کہ میدان جہاد میں جا کے خود بھی شہید ہو جاؤ۔ اب یہی عبادت ہے معلوم ہوا نہ جان رکھنا عبادت، نہ گنانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب کہیں کہو، تو عبادت اور جب کہیں کہ ہرگز مت دو تو روک لینا عبادت ہے۔ یہی صورت مال کی بھی ہے۔ اگر

① الصحیح للبخاری، کتاب المظالم، باب العرفۃ العلیۃ المشرفۃ، ج: ۸، ص: ۳۵۷، رقم: ۲۲۸۸.

یوں نہیں کہ ہرگز مت خرچ کرو۔ یہ مصروف بہت برا ہے۔ تو روک لینا اور بخیل جتنا ہی عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ خرچ کرو، تو خرچ کرنا عبادت ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ جان، مال، آبرو، طاقت و قوت سب کے لحاظ سے بندہ ہے اور بندے کو یہ معلوم ہے کہ حوالہ کو حق ہوگا، غلام وہی انجام دے گا غلام اپنی مجبوز سے کچھ نہیں کرے گا۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلاوے کیا پئے گا؟ جو آقا پہناوے کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام لے لے۔ اس نے کہا تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا، اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو غلام ہی کیوں بنتا؟ آقا کیوں نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری مرضی، میرا ارادہ، میری خواہش بھی غلام۔ یہی غلام ہونے کے معنی ہیں۔ اگر یہ چیزیں میری اپنی ہوتیں، تو میں آقا ہوتا، غلام کیوں ہوتا؟ تو ایک انسان، انسان کا غلام بن جائے، جس نے اسے پیدا کیا، نہ روزی دی، محض ایک نسبت پیدا ہوگئی کہ خرید لیا اور غلام بن گیا۔ اس کی یہ کیفیت کہ آقا کے مقابلے میں نہ مرضی نہ ارادہ نہ خواہش کچھ بھی تو نہیں۔

اور اللہ رب العزت جس نے پیدا کیا، جان دی، روح دی، ہر چیز کا مالک اس کے سامنے بندگی کا دعویٰ کرے اور بندگی کے خلاف بھی کرے؟ وہاں تو یہ ہونا چاہئے کہ ہماری مرضی بھی اللہ کی غلام ہے۔ ہماری خواہش بھی اللہ کی غلام ہے۔ وہاں آ کر آدمی بنتا ہے، یہاں آقا کی میں آتا ہے۔ شریعت کا حکم آئے تو اس میں رائے زنی کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اللہ میاں معاذ اللہ تابع ہیں اور یہ ان کے متبوع ہیں۔ خدا اور رسول کو اپنی مرضی پر چلائے، اس سے زیادہ گستاخی کی کیا بات ہوگی۔ بندہ اس لئے آیا تھا کہ اللہ و رسول کی مرضی پر چلے نہ یہ کہ اپنی مرضی پر انہیں چلائے کی کوشش کرے۔ تو دین میں لوگ ترمیمیں پیش کیا کرتے ہیں کہ صاحب! یوں نہیں، یوں ہونا چاہئے۔ گویا آپ پارلیمنٹ ہیں اور شریعت آپ کے مشورہ سے بن رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو جب دین اتارنا تھا تو ہمیں بلا لیتے۔ ہم سے مشورہ لے لیتے کہ یہ حکم کیسے اتاروں؟۔ یہ کتنی بڑی گستاخی کی بات ہے بندے اور خدا میں نسبت صرف غلامی کی ہے کہ بندہ غلام ہے اور وہ آقا ہیں اس کی مرضی بھی غلام اور خواہش بھی غلام۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا ﴿اذْقَالَ لَهٗ زُلَّةً اَسْلِمَ﴾ ① ”اے ابراہیم مسلم بنو“۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ اب تک آپ مسلمان نہیں تھے۔ اب مسلمان ہو جاؤ۔ اسلام کے معنی گردن نہاد ہونے کے ہیں۔ اپنے آپ کو سوئچ دینے کے ہیں۔ یعنی اے ابراہیم! اپنے کو ہمارے حوالے کر دو۔ جو چاہیں ہم تمہارے اندر تصرف کریں اور تمہیں بولنے کی مجال نہ ہو۔ جیسے مردہ ہٹلانے والے کے ہاتھ میں بے اختیار ہوتا ہے، جدھر کو چاہے کر دے دے۔ مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کیوں کر، ٹی۔ اسی طرح شریعت کے ہاتھ میں آدمی مثل مردہ کے ہو جائے کہ شریعت جدھر بھی تصرف کرے، بلا چوں و چرا آدمی عمل کرے۔

ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہو جاتا ہے۔ تو جب سرکاری آرڈر ہوتا ہے پھر چون و چرا کی مجالش نہیں دیتا۔ کوئی چون و چرا کرے تو لڑنے کو تیار کہ سرکاری آرڈر ایسے ہی ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا آرڈر آئے تو وہاں رائے زنی کرنے کو تیار کہ یہ آرڈر اور حکم کیوں آیا؟ ایسا کیوں نہ ہو گیا اور ویسا کیوں نہ ہو گیا یہ غلط کاروائی ہے۔ بہر حال جان ہو مال ہو، آبرو ہو۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام یہ ہے کہ خالق کے آگے جھکے اس جھکنے ہی کا نام طاعت و عبادت ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ① ”میرے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔“ یعنی بندہ دنیا میں خدا کی کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے۔ خدا کی کے لئے خدا کی ذات کافی ہے۔ تمہیں تو بندہ بننے کے لئے بھیجا گیا ہے اور بندگی کے یہی معنی ہیں کہ بے چون و چرا طاعت کرو۔

ہمارے ضلع سہارن پور کے قریب پنجاب کا ایک ضلع انبالہ ہے۔ اس میں عبداللہ پور ایک گاؤں ہے۔ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عرف باللہ اور شیخ کامل تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ جتنا کہ کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ ایک دفعہ برسات میں جمن میں پانی چڑھا اور اتنا چڑھا کہ گاؤں کی جو چہار دیواری تھی اس تک آدھا پانی آ گیا۔ اگر گزر بھر اور بڑھ جاتا۔ تو پورا گاؤں غرق ہو جاتا۔ وہاں ایک بزرگ شاہ دولہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے تھے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ پانی بہت چڑھ گیا اور دیوار اُتر ٹوٹ گئی۔ تو پھر گاؤں کی خیر نہیں ہے۔ تو سارے گاؤں والے جمع ہو کر شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضور عا کیجئے جمن کا پانی چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاؤں ڈوب جائے۔ یہ ذرا دیوار کھڑی ہے۔ اس سے پانی رک رہا ہے۔ فرمایا، اچھا پانی بڑھ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا: ”جی ہاں“ فرمایا، پھر پھاڑا اٹھا کے چلو۔ پھاڑا لایا گیا۔ تو شاہ دولہ نے پھاڑا لیا۔ اب شاہ دولہ آگے آگے، پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔ وہ جو دیوار کھڑی تھی۔ جس سے پانی رک رہا تھا۔ شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دیوار کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا، حضرت یہ کیا کر رہے ہو؟ اس دیوار کی بدولت تو گاؤں بچ رہا ہے۔ دیوار توڑ دیں گے تو پانی نہیں آ جائے گا؟

فرمایا: ”جدھر موٹی اور شاہ دولہ“ نامعلوم! تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں اللہ سے مقابلہ کروں۔ وہ چاہیں کہ ہستی غرق ہو۔ تو میں بھی چاہتا ہوں کہ ہستی غرق ہو۔ میں اللہ سے مقابلے کے لئے نہیں آیا۔ میں اخلاعت کے لئے آیا ہوں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ ہستی غرق ہو، تو میرا منشاء بھی یہی ہے کہ اس ہستی کو غرق ہونا چاہئے۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا، اس شخص کا کیا حال ہو چھتے ہو۔ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا،

الحمد للہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ: ”خیر یہ کیسے ہو سکتا ہے! فرمایا یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔“

اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو جو بھی عالم میں ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمد للہ پیدا ہوا چاہئے تھا۔ اگر کوئی مرتا ہے، میں کہتا ہوں الحمد للہ اسے مرنا ہی چاہئے تھا۔ میں کون ہوں۔ جو اللہ کا مقابلہ کروں کہ وہ موت دے، میں کیوں نہیں۔ موت نہیں آتی چاہئے۔ انسان بندگی کے لئے آیا ہے اور بندگی کے حق اطاعت کے ہیں کہ جو ان کی مرضی وہ میری مرضی۔

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ

تو بندہ وہ ہے کہ اپنی مرضی کو مال، جان، نور و روح کو فنا کر دے۔ اس کو فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ① اس میں میں نے جان کی تفصیلات کو چھوڑ کر مالیات کو بیان کیا۔ اس لئے کہ جب اللہ نے دو تیس دی ہیں۔ تو دولت کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں دولت کے حقوق پہچانے جائیں۔ وہاں غرباء کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ غریب بھی آپ کے اور ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔ بہت سے مسلمان غریب ہیں سب کی یکساں حالت نہیں ہے۔ ان کی طرف توجہ دیں۔

اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے..... ایک تو یہ ہے کہ شخصی طور پر آپ نے دے دیا۔ بے شک عبادت انجام دی۔ جس غریب کو بھی دیں گے آپ نے عبادت ادا کی۔ زکوٰۃ دیں، صدقات دیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر دیں۔ مثلاً آپ فنڈز بنائیں جس میں لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع ہو۔ بہت سے پس ماندہ غریب ہوتے ہیں کہ ان کے قرض لینے کا سامان ہو جاتا ہے، بہت سے بھکے ہوئے ہیں، کھانے پینے کو نہیں۔ انہیں قرض دے کر تجارت کرائی جائے۔ کوئی کاروبار لگا دیا جائے کہ بھی! تم پانچ برس میں ہمارا قرض ادا کر دینا۔ مگر اب اپنا کام چلاؤ۔

ہندوستان میں بہت سی ایسی بستیاں ہیں کہ انہوں نے فنڈز جمع کئے اور ان سے غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ پہلے یہ صورت تھی کہ لوگ ساہوکاروں سے قرضہ لیتے تھے۔ تو مسلمانوں کی لاکھوں کی جلیبدا دیں تباہ ہو گئیں۔ وہ ساری سودی میں نکل جاتی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں میں جو دولت مند تھے انہوں نے فنڈز قائم کئے اور اس میں بلا سود کا قرضہ دیا۔ اس میں کچھ ضمانتیں، یا لکھت پڑھت بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیسکڑوں کی کام سے لگ گئے۔ جو پریشان حال تھے ان کی پریشانی رفع ہو گئی۔ تو شخصی طور پر زکوٰۃ دی جائے بے شک ضروری ہے۔ قرض و عبادت ہے ثواب و اجر بھی ملے گا۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر فنڈز مقرر کئے جائیں کہ ہم اپنے

① پارہ ۵: سورہ فائدہ ارباب، الآية: ۵۶۔

غریب بھائی کو غریب نہیں رہنے دیں گے۔ جتنا ہم سے بن پڑے گا۔ اس میں تعلیم کا بھی بندوبست ہو سکتا، پیسہ کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے، غریبوں کی خبر گیری بھی ہو سکتی ہے۔ ایک کا کام ایک ہی کا ہوتا ہے۔ جماعت کا کام جماعت ہی کا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر خدمت کی جائے تو قوم کی زیادہ خدمت ہو سکتی ہے۔ تعلیم و تربیت اور معاشرت و معاش کے سلسلہ میں خدمت کے بہت بہتر نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔ غریبوں کے حقوق بھی امیروں کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ یہ غریب بھی اپنے بھائی ہیں کوئی الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ دولت مند بھائی ہیں یہ بھی ہیں۔ تو دولت مندوں کا یہ بھی فرض ہے کہ ذکوۃ، صدقات اور لئکہ فی اللہ سے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کریں۔ شخصی طور پر بھی اجتماعی طور پر بھی۔ یہ بھی ایک مستقل عبادت اور طاعت ہوگی اور اس کا اجر جماعتی طور پر ہوگا۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی، یہود و فلاح بھی ہوگی۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي﴾ ① ”ہم نے جنوں اور انسانوں کو مخلوق عبادت کے لئے پیدا کیا ہے“۔ کہ وہ بندگی کریں۔ ﴿فَأُوْبِئِدْ مِنْهُمْ مِمَّنْ زُذِقَ﴾ ② ”ہم نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ تم سے روزی چاہیں“۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ ③ ”روزی کا ذمہ ہم لیتے ہیں تم مت گھبراؤ“۔

تو ایک کام ہمارے سر دیا اور ایک اپنے ذمہ لیا۔ اپنے ذمہ روزی دینا لیا۔ آپ کے ذمہ طاعت و عبادت کرنا ہے۔ جتنا آپ طاعت و عبادت کریں گے، ادھر سے روزی آئے گی اور روزی کے معنی فقط روٹی کے نہیں ہیں۔ روزی، عزت، آبرو، اقتدار سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ تو ہم روزی دیں گے، تم طاعت و عبادت کرو۔ اب مسلمانوں نے جو اپنے ذمہ لیا تھا اسے ترک کر دیا اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس کا مطالبہ قائم ہے۔ اگر روزی میں کمی ہوئی تو بس اللہ میاں کی شکایت شروع ہوگئی کہ صاحب! بس روزی بند کرنے کو میں ہی رہ گیا تھا کفار کہاں چلے گئے تھے۔ میرے ہی اوپر بلا آتی ہے۔ گویا انہوں نے جو روزی کا ذمہ لیا تھا۔ معاذ اللہ اسے پورا نہیں کیا اور آپ جو ذمہ لے کے آئے تھے کہ میں طاعت کروں گا۔ وہ آپ نے کب پورا کیا؟ اپنے کو دیکھتے نہیں، شکایت اللہ میاں کی شروع کر دی۔ اس واسطے اپنا بھی حق ادا کرو اور اللہ نے جو اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ادا کریں گے تم کی کرو گے، ادھر سے بھی کی ہو جائیگی۔ تم پورا حق ادا کرو گے، ادھر سے بھی روزی دی جائے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ ④ ”روزی کی فکر نہ کرو ہم دیں گے“۔ اپنے کام کی فکر کرو۔ جو تمہارے ذمہ ڈالا گیا ہے اور وہ طاعت و عبادت ہے۔ یہ چند باتیں میں نے بلا تمہید عرض کیں کسی علمی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو طاعت و عبادت کی، جھکنے کی توفیق عطا فرماوے۔ (آمین)

① پارہ ۷، سورۃ الذاریات، الآیہ: ۵۶۔ ② پارہ ۷، سورۃ الذاریات، الآیہ: ۵۷۔

③ پارہ ۷، سورۃ الذاریات، الآیہ: ۵۸۔ ④ پارہ ۷، سورۃ الذاریات، الآیہ: ۵۸۔

"اَللّٰهُمَّ زَيِّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَاِذَا مَنَا سَكَنًا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ
اَسْوَابُ الرَّحِمِمْ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ . يٰرَحْمٰنُكَ
يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ."

خطبہ طیبہ

”الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَتَوَكَّلُ بِهِ وَنَعُوْذُ بِكَ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ
اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا اَمِنْ يَّهْدِيْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ . وَنُشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ ، وَنُشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَرَسُوْلُنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ اُرْسَنَهُ اللّٰهُ
اِلٰی كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ نَبِيْرًا وَنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاَذْنِهِ وَبِسِرِّهِ اَخْبِيْرًا اَمَّا بَعْدُ :

تمہید..... حضرات محترم! اس عظیم اجتماع کی صدارت مجھ جیسے بے بضاعت طائب علم کا کام نہ تھا۔ اس لئے
اس مقام پر آتے ہوئے ایک قسم کی بے ادبی اور فحاشی و ندامت محسوس ہو رہی ہے اور حیران ہوں کہ اپنے بزرگوں
کے اس اقدام (تفویض صدارت) پر ان کا شکریہ ادا کروں یا شکوہ کروں؟

تاہم ”اَلَا مَرْفُوْعُ الْاَذْوَابِ“ کے تحت جب کہ بزرگوں کے امر کی تعمیل کر رہا ہوں اور جہاں بھٹلا دیا گیا
ہو، وہاں بیٹھ چکا ہوں۔ اس لئے شکریہ کے سوا چارہ کار بھی نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس اظہار کے ساتھ کہ حقیقی معنی
میں صدروہی حضرات ہیں جو بے بضاعتوں تک کو بھی صدارتیں بانٹ سکتے ہیں۔ میں صرف ان کے تھکے ایک
تعمیل کنندہ کی حیثیت سے اس مقام پر حاضر ہوں گا اور یہ تعمیل ارشاد ہی اس فحاشی و ندامت کا تدارک بن سکتی
ہے۔ جو مجھے اس مقام پر بیٹھ کر ہو رہی ہے۔ حق تعالیٰ ان بزرگان علم و تعلیم کے منشاء کی قسم کی توفیق دے اور ان
کے فیوض و برکات کو تادیر قائم رکھے، یہ دعا میرا شکر یہ ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان بھی کئی منت شہ میں ازو کہ بہ خدمت گذاشت
تعمین موضوع..... حضرات کرام! یہ عظیم اجتماع چونکہ علمی اور تعلیمی ہے اور ایک موثر تعلیم گاہ کے انتساب سے
منعقد ہو رہا ہے۔ اس لئے اس خطبہ افتتاحیہ کا موضوع قدرتی طور پر خود ہی متعین ہو جاتا ہے۔ جو جلسہ اور تعلیم گاہ کا
موضوع ہے اور وہ علم و تعلیم اور تربیت ہے۔ اس لئے میں اس موضوع کے دائرہ میں محدودہ کر دین کی چند سطور
عرض کرنے کی جرات کروں گا۔

دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت..... میرے اس سارے خطبہ افتتاحیہ کا حاصل و انفعول میں یہ ہے کہ انسانی
زندگی میں دینی تعلیم انتہائی اہم اور ضروری ہے اور اس سے پیدا شدہ علم و عمل اور اس عمل سے مربوط زندگی ہی
حقیقی زندگی اور اعلیٰ ترین حیات ہے۔ جس کی اشاعت و ترویج اس نازک ترین یا تاریک ترین دور میں پورے

جان و مال کی قربانیوں کے ساتھ اہم ترین ضرورت ہے۔

دینی تعلیم پر مبنی چند سوالات دینی تعلیم کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے مبادی و آثار اور لوازم کیا ہیں؟ پھر دینی تعلیم کے مقابل سے جو دنیوی تعلیم مفہوم ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اور پھر اس علم دنیا اور علم آخرت کے ثمرات و نتائج میں کیا فرق ہے؟ چند قدرتی سوالات ہیں۔ جو دینی تعلیم کے لفظ سے آپ کے ذہنوں میں ابھر رہے ہوں گے انہی کے جوابات پر تحریر مشتمل ہے مگر جوابات کی تقریر اور تنبیہ قدرے طویل ہو گئی ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ موضوع ہی قدرتا طویل الذیل ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ یہ سطور ایک طالب علم کے قلم سے نکل رہی ہیں اور وہ بھی ایک تعلیم گاہ میں اور اوپر سے ایک تعلیمی اجتماع کے موقع پر اور طالب علم کے لئے ایسے مواقع میں یہ موضوع نقد زندگی اور لذیذ ترین موضوع ہے اس لئے محبوب مشغلہ میں کچھ راوی طویل بھی ہو جاتا ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر نعم

ان ارادی اور غیر ارادی طوائفوں کے لئے میں اپنے بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر ساتھ ہی کوشش کروں گا کہ طوائف کو کم کرنے کے لئے ان حقائق و خالص اصولی رنگ سے پیش کر دوں۔ واقعات و حوادث سامعین کے ذہنوں میں خود موجود ہیں بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ۔ اس لئے عرض کردہ اصول پر واقعات کو وہ خود منطبق فرما کر ان حوادث کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا فیصلہ فرمائیں۔ یہ اصول قرآن حکیم کی روشنی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جو کائنات کے سارے حوادث کی صحت و سقم کو تو لے لے کا واحد میزان ہے ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ① ”ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر“۔ اس لئے ان پر منطبق شدہ واقعات کا حکم بھی قطعی ہوگا۔ جس کی تعمیل میں کسی خدا پرست کو کوئی کلام نہ ہونا چاہئے۔

① انسان ایک حقیقت جامعہ کی تخلیق حضرات کرام! حق تعالیٰ شانہ نے اپنی صنعت متقنہ سے انسان کو حقیقت جامعہ بنایا، اس کے باطن میں قرآن کمال ودیعت کئے اور اس کے ظاہر کو مختلف اعضاء جلال سے سنوارا۔ اعضاء کے خلقی وظائف اور ان سے ایک قرآنی استدلال پھر ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال و غیضہ عمل سپرد فرمایا۔ آنکھ بنائی کہ وہ دیکھے، کان دیئے کہ وہ سنیں، ناک دی کہ وہ سونچھے، زبان دی کہ وہ چکھے، ہاتھ دئے کہ وہ پکڑیں، پیر دیئے کہ وہ چلیں، جسد بدن دی کہ وہ چھوئے، زبان دی کہ وہ کھائے پیئے اور بولے، دماغ دیا کہ وہ عقل سے سوچے اور فکر کرے۔ غرض ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال و وظائف عمل سپرد فرمائے۔ تاکہ وہ انہیں ادا کرتا رہے جس سے مقاصد تخلیق پورے ہوتے رہیں۔

اعضاء انسانی کے یہ فرائض جیسے بدنی اور مشاہد ہیں۔ جنہیں تجربہ اور بدانتہا ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ایسے

ہی وہ شرعی بھی ہیں کما یرمٰنا بھی انہیں تسلیم کرتا ہے۔ جب کہ انکے خالق نے ہی یہ وظائف ان کے لئے تجویز فرمائے اور اس کی اطلاع بھی دی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کفار کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کے فرضی معبودوں (بتوں اور صورتوں) کے بے حس و بے شعور اور بے بس ہونے کو اس سے ہی واضح فرمایا کہ وہ اپنے ان مصنوعی اعضاء سے وہ کام ہی نہیں لے سکتے۔ جو قدرت نے ان اعضاء کے لئے رکھے تھے۔ تو یہ بے حس و معطل اور ناکارہ کیا خدا ہوتے؟ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أُمِّلُوا لَهُمْ فَأَدْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ آعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ أَمْ لَهُمْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ ۚ﴾ ① ”جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر (ان بتوں کو) پکارتے ہیں وہ انہی کی طرح خدا کی مخلوق ہیں۔ (خدا انہیں) پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو، کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں؟ (اور جب یہ بھی نہیں کہ وہ مخلوق تالیٰ فرائض ہی انجام دے لیں تو وہ خالق کا کام کیا انجام دے سکیں گے کہ انہیں پکارا جائے۔“

اس آیت کریمہ سے جہاں اور بہت سے علوم برآمد ہوتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ہدایتا واضح ہے کہ اعضاء انسانی میں ہر ہر عضو کو اس کے مناسب حال کچھ فرائض اور وظائف ملنا چاہئے گئے ہیں جیسے پاؤں کے لئے چلنا ہاتھوں کے لئے پکڑنا، آنکھوں کے لئے دیکھنا اور کانوں کے لئے سننا اور ان اعضاء کی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے فطری فرائض کو انجام دیتے رہیں۔

② اعضاء کا عمل اور کائناتی عدل..... اگر ہر ہر عضو سے وہی کام لیا گیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ تو مقاصد خلقت پورے ہوتے رہیں گے اور یہ کائنات انسانی عدل پر قائم رہے گی۔ جس کا نام احسان ہے۔ لیکن اگر کسی عضو کو معطل چھوڑ کر بے کار کر دیا گیا۔ تو یہ سفاہت و بد عقلی ہوگی۔ جس کا نام حرمان ہے اور اگر کسی عضو کو غیر کام پر لگا دیا گیا۔ تو یہ ظلم ہوگا جس کا نام خسران ہے اور ان دونوں کا مجموعہ تعدی یعنی حد سے تجاوز ہوگا۔ جس کا نام کفران ہے۔

اس اضاعت نعمت کو خواہ وہ ترک نعمت سے ہو۔ جس میں انتفاع کو عدم انتفاع سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو حرمان ہے یا بے محل استعمال سے ہو کہ اس میں صحیح مصرف کو غلط مصرف سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو خسران ہے۔ قرآن حکیم نے تبدیلی نعمت سے کہ کفران نعمت سے تعبیر فرمایا ہے اور نسلہ یہ دیا ہے کہ: ﴿الَّذِينَ يَذُلُّوا بِغَضَبِ اللَّهِ كُفَرًا وَآخَلُوا قَوْمَهُمْ ذَا الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَ نَهَا وَيَنْسُ الْفَرَارِ﴾ ③ ”کیا آپ نے نہیں دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ اللہ کے احسان کا ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں۔ جو دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔“

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۶۳، ۱۶۴، ② پارہ: ۱۳، سورۃ فاطر، الآیۃ: ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴

عمل اعضاء کی غرض و غایت..... پھر قدرتی بات ہے کہ ان اعضاء کے طبعی وظائف و اعمال کی کوئی غرض و غایت بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ بے مقصد عمل بنو اور عبث ہوتا ہے۔ اس لئے ان تمام اعضاء کے مقصود کاموں کی بھی بلاشبہ ایک غرض و غایت ہے اور وہ حق طبعی اور جبروی حق ہے جس کا پروگرام شریعت ہے۔ اگر یہ تمام اعضاء اپنے اپنے وظائف عمل میں اسی غرض و غایت کے لئے حرکت کریں گے۔ تو اسی میں ان کی سلامتی اور دارین کی نجات ہے۔ ورنہ اگر انہوں نے اپنے یہ فطری وظائف بجائے محبت حق کے عداوت حق کے مظاہرہ کے لئے بصورت بغاوت انجام دیئے۔ تو باوجود اپنے پورے وظائف خلقت انجام دے بیٹے کے۔ چونکہ وہ صحیح غرض و غایت کے لئے انجام نہیں دیتے گئے۔ اس لئے وہ ان کے حق میں دہائی جان اور موجب ہلاکت و عذاب بن جائیں گے اور یہ اعضاء بجائے اس کے کہ اپنے نفس کے حق میں قیامت کے دن کوئی اچھی شہادت پیش کر سکتے اُن کے خلاف گواہ بن کر مقابل آجائیں گے اور عذاب کے لئے مضبوط حجت بن جائیں گے۔

قرآن کریم نے اعضاء بدن کی اس تبدیلی غرض یا مخالف غرض کام کرنے پر ان اعضاء کا مخالف نفس گواہ بن جانا اور اس کے عذاب کے لئے نمرہ و معاون ہو جانا ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءَهُمْ شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِمَ لَا يُشْهِدُهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۚ فَمَلَأْنَا تَلْوَظًا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱﴾﴾ اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلائے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (ئے) گئے (لئے موقف حساب میں) لائے جائیں گے۔ پھر وہ روکے جائیں گے (ناکہ بقیہ بھی آجائیں) یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آجائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کہانیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے اور (اس وقت) وہ لوگ (متعجب ہو کر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ اعضاء جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گواہی دی جس نے ہر (گواہ) چیز کو گواہی دی؟ اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔

بہر حال آیت کریمہ سے کائنات انسانی کے عدل و احسان پر قائم رہنے کی دو بنیادیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اعضاء بدن اپنے اپنے فطری وظائف انجام دیں۔ معص نہ رہیں کہ یہ حیران ہے اور دوسرے یہ کہ صحیح غرض و غایت یعنی طاعت حق میں انجام دیں۔ مخالف غرض کاموں میں نہ لگیں کہ یہ خسران ہے اور ان کی جنس جس میں دونوں شریک ہیں، ٹکرائے۔

سلطان بدن قلب کا عمل..... بہر حال جب کہ اس تمام اقلیم بدن میں ہر ہر عضو ایک صحیح و غایت کے لئے اپنے وظائف عمل ادا کرنے کے لئے بنا ہے۔ تو ممکن ہے کہ قلب جو اس ساری اقلیم بدن کا سلطان اور حکمران ہے

اس کی کار فرمائی کی کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ بالخصوص جب کہ اس کے جنود و عساکر اور خدمہ یعنی اعضاء بدن میں سے کوئی عضو بھی بے کار یا بلا وظیفہ کے ناکارہ، معطل اور بے مقصد نہیں بنایا گیا۔ تو یہ منسلک الاعضاء کب بے کار بنایا گیا ہوگا اور کس طرح اسے بلا کسی وظیفہ کے معطل اور بغیر کسی صحیح غرض و غایت کے مہمل مان لیا جائے؟ مگر اس کا وظیفہ وہی ہو سکتا ہے جو سناہلین و ملوک کا ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بادشاہ کا کام محنت مزدوری نہیں۔ بلکہ رعایا اور اپنے خدمہ یا عمال حکومت کی نفس و حرکت پر نظر رکھنا، عہد وقت ان سے باخبر رہنا اور اس علم و خبر کی روشنی میں اقیم کی تدبیر اور نگرانی کرتے رہنا ہے، کہ وہ اپنے اپنے منوطہ فرائض پر سگدر ہیں اور راست بازی کے ساتھ اپنے وظائف عمل کی غرض و غایت پوری کرتے رہیں۔

پس قلب کا سب بڑا کام اپنی اقلیم سے باخبر رہنا اور عملی طور پر اندرونی اور بیرونی امور میں جو باتیں اس کائنات بدن کے لئے مفید ہیں۔ انہیں فراہم کرنا اور جو اس کی غرض و غایت کے لئے مضرت ہیں۔ انہیں دفع کرتے رہنا ہے۔ تاکہ یہ اقلیم متن نہ اندرونی طور پر منافساد و تشویش کا شکار ہو اور نہ بیرونی طور پر کسی غنیم کے حملہ کا ہدف اور نشانہ بنے۔ اس لئے قلب کے فوائد کا مختصر خطوط میں خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اندر اور باہر اور انفس و آفاق میں توجہ کر کے ان سے معلومات حاصل کرتے رہے اور اس علم کی طاقت پر اپنی اقلیم تن کو چلاتا رہے۔ اُس اس نے یہ فریضہ صحیح طور پر انجام دیا تو یہ تہا سی کی نہیں بلکہ ساری اقلیم تن کی صلاح و فلاح ہوگی۔ ورنہ وہ بھی فاسد ہو جائے گا اور اس کی ساری اقلیم تن تہا سی و بربادی کی آماجگاہ بن جائے گی۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: "وَلَيْسَ الْبَحْسِدُ مُضْعَةً إِذَا ضَلَّحَتْ ضَلَحَ الْبَحْسِدُ كَمَا إِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْبَحْسِدُ كَمَا لَا وَجْهَ الْقَلْبُ" "بدن (انسانی) میں گوشت کا ایک ٹکڑا تو مضر ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور وہ جب فاسد ہوتا ہے۔ تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے" ①

③ قلب کا وسیلہ علم تفکر و تدبر..... پھر جس طرح کانوں کے سننے کا لئے استماع یعنی سنے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بغیر اس توجہ کے وہ سننے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے اور آنکھ کے دیکھنے کے لئے جس طرح استبصار یعنی دیکھنے کی طرف توجہ ہو کر اپنی پتھیں گھمنا ضروری ہے تاکہ وہ گرد و پیش کو دیکھ سکے کہ اس توجہ کے بغیر وہ بینائی کا وظیفہ ادا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح قلب کو علم حاصل کرنے کے لئے استعلام یعنی علم کے لئے توجہ کرنی ضروری ہوگی کہ بغیر اس توجہ کے جس کا نام حرکت فکری یا تفکر و تدبر ہے۔ وہ علم آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر قلب کو عالم خلق اور عالم امر کی طرف اپنی قوت فکریہ کو دوڑانا پڑے گا اور تفکر و تدبر کے وظائف انجام دینے ہوں گے۔ جب ہی وہ ظاہر و باطن کا علم حاصل کر کے کائنات بدن کی صحیح تدبیر کر سکے گا۔ پہلے قرآن حکیم نے ان دونوں عالموں خلق اور امر کی طرف قلوب کو توجہ دلائی۔ عالم خلق میں انفس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَيْسَ

① الصحیح لبخاری، کتاب الايمان، باب فصل من استبصر الدين، ج: ۱ ص: ۹۔

اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تَنْصَرُونَ ﴿١﴾ ”اور تمہاری ذات میں بھی (نشانیوں ہیں) کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا؟“ اور عالم خلق میں آفاق کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ”کیا وہ آسمان اور زمینوں کی پیدائش میں غور نہیں کرتے؟“ اور عالم امر کے بارے میں فرمایا: ﴿اَفَلَا يَنْصَبُ السُّرُوۡنَ الْفُرُوۡنَ وَلَوْ كَاٰنَ مِنْ عِنۡدِ غٰیۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا﴾ ﴿٢﴾ ”تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔“

گویہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حرکت فکری اور توجہ کے بعد قلب کو علم حاصل ہو ہی جائے اور وہ صحیح علم تک پہنچ ہی جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات کان توجہ کریں اور سنائی نہ دے، ہڈیاں دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں لڑائے اور نظر نہ آئے۔ جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات اچانک نظر ڈالتے ہی آنکھوں کو ہڈیاں نظر آ جائے اور کانوں میں اچانک کوئی بات پڑ جائے اور وہ سن لیں۔ اسی طرح قلب کے لئے توجہ اور فکر شرط ہے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ مگر بعض اوقات کبھی ادنیٰ توجہ ہی سے قلب میں علوم القاء ہو جاتے ہیں اور بے محنت کچا پکائی مل جاتی ہے۔ مگر قانونی عادت یہی ہے کہ توجہ ہی سے علم کا شرشیریں سامنے آتا ہے۔ جو حصول علم کی شرط اولیں ہے۔

[4] بدن کا ہر ہر عضو صاحبِ ادراک و شعور ہے۔..... اس موقع پر یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس سلطان الاعضاء (قلب) کے حاکم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کائنات بدن میں اور کوئی عضو عالم نہیں۔ بلکہ ”النَّاسُ غُلٰی دِیۡنٍ مُّلُوۡا بِحَیۡمٍ“ کے طبعی اصول پر اس کائنات بدن کا ہر ہر حصہ اور ہر ہر عضو علم و احساس سے بہرہ ور ہے اور اقلیم بدن کا ریشہ و پشا احساس و ادراک کا ذخیرہ درجہ بدرجہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

آنکھ کے دیکھنے کے معنی یہی ہیں کہ اسے صورتوں کا علم ہو جائے۔ کان کے سننے کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اسے آوازوں کا علم و ادراک ہو جائے، زبان کے بچکنے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ اسے ذائقوں کا علم ہو جائے، ناک کے سونکھنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے خوشبو یا بدبو کا ادراک ہو جائے، ہاتھ، پیر اور عام جند بدن کے چھونے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ انہیں کسی جسم کی سختی، نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا ادراک ہو جائے وغیرہ۔ جس سے واضح ہے کہ کائنات بدن کا ذرہ ذرہ ادراک و شعور اور علم کی مختلف قوتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور اپنی اپنی معلومات کی فراہمی میں مشغول ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ سارے کا سارا انسان علمی قوتوں سے لبریز اور اندر باہر سے باشعور ہے۔ جب کہ ان کا حکمران (قلب) علوم و معارف کا سرچشمہ ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان میں کس کا علم اصلی ہے اور کس کا فرعی اور جزوی۔ لیکن بہر حال جب کہ ان سب میں ادراک کسی نہ کسی شان سے موجود ہے۔ تو کسی بھی عضو کے علم و ادراک سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اعضاء کے ادراک کی حتمی قوتیں..... بنا بریں ان الاعضاء ادراک کی ان مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھ کر کہا

جاسکتا ہے کہ ظاہر نظر انسان کے علم و ادراک کی تین قوتیں ہیں۔ جو ان اعضاء میں حسب مناسبت پھیلی ہوئی اور منقسم ہیں۔ ایک حس جو مختلف نوعیتوں کے ساتھ مختلف بدن میں فرق مراتب کے ساتھ قائم ہے اور اپنے اپنے دائرہ محسوسات میں مختلف اشیاء کو اپنے اپنے رنگ، احساس سے محسوس کرتی ہے۔

دوسری عقل جو دماغ میں رچی ہوئی ہے اور امور معقول کو ایک خاص شعور کے ساتھ اخذ کر کے اپنے اپنے مواقع پر صرف کرتی ہے۔

تیسری قوت وجدان ہے۔ جو قلب میں جاگزیں ہے اور مادہ طبعیات تک اس کی رسائی ہے کہ وہاں سے بھی وہ علوم کھینچ لاتی ہے۔ جہاں حواس و عقل گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پہلی دو قوتوں (حس اور عقل) کے عمل کا میدان یہ محسوس جہاں ہے۔ جس سے انہیں معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے۔ جس کو جزئیات کا اور عقل کو کلیات کا اور آخرت کی قوت یعنی وجدان صحیح کے عمل کا میدان غیب کا جہاں ہے۔ جس پر وہاں سے علوم کا ترشح ہوتا ہے اور آیات خداوندی اترتی ہیں خواہ وہ جزئیاتی ہوں یا کلیاتی۔

اگر جزئی ہیں تو ان کے مظاہر عمل حس کے ادراک میں بھی آ جاتی ہیں اور اگر کلیاتی ہیں تو ان کی علمی صورتیں عقل پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں اور خالص وجدانی اور غیبی ہیں تو قلب کے زاویوں میں یا مانت چھڑیں رہتی ہیں۔ علم اور حظ سے قلب ہمہ وقت و معصور اور سرور ہوتا ہے۔ لیکن سرچشمہ ان سب کا غیبی ہی جہاں ہے۔ جس سے یہ علوم کبھی سماع سے قلب میں آتے ہیں کہ کوئی ہاتف غیبی خبر دے، کبھی الہام خداوندی سے قلب پر وارد ہوتے ہیں کہ قلب اچانک انہیں محسوس کرنے لگے۔ کبھی علم اور عرفانی تجربات سے خود بخود دل میں ابھر آتے ہیں کہ دل ان کا سرور ہو جائے۔ کبھی تربیت یافتہ عقل باطن کی روشنی سے ان کی انواع تمیز ہو جاتی ہیں۔ جس کی صورت مکمل اجتہاد و استنباط ہے اور کبھی عقل ظاہر کی سوچ بچار اور فکر و تدبیر سے منکشف ہو جاتے ہیں جیسے عام علمی لطائف و نکات وغیرہ۔ مگر بہر حال یہ سب وجدانی علوم کہے جائیں گے جن کا تعلق حواس یا عقل طبعی سے براہ راست نہیں ہوتا۔

قرآن کریم سے وسائل ادراک کی تعین..... قرآن حکیم نے ان سب صورتوں کی بنیادیں خود ہی قائم فرمائی ہیں اور ان مختلف الانواع آیات الہی سے کچھ سیکھنے اور لینے کے لئے انہی مذکورہ وسائل سماع، فکر، علم اور عقل و انکشاف کا ذکر فرمایا ہے کہ یہی وہ وسائل ہیں۔ جو آیات الہیہ سے کچھ سبق لیتے ہیں اور علم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان ہی میں سے انسان کا جوڑا نکل آنے اور ان میں اچانک انس و مودت قائم ہونے کی قدرتی نشانیوں کو سمجھ لینے کا ذریعہ فکر کو بتلایا گیا ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ ① ”اس میں بہت پتہ کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں یا مثلاً زمین، آسمان کی پیدائش اور انسانوں کی زبانوں کے اختلاف اور رنگوں کے تفاوت سے جو سبق لیں اور ان میں قدرت کی نشانیاں دیکھیں، اس کا ذریعہ علم کو فرمایا گیا ﴿إِنَّ فِي

ذٰلِكَ لَا يُبٰتِ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١﴾ ”اس میں بہت نشانیاں ہیں جانکاروں کے لئے۔“

یامثلًا دن اور رات میں انسان کے سونے جانے کا انقلاب اور روزانہ قدرتی خزانوں سے اپنا رزق ڈھونڈ نکالنے میں قدرت کی جوشانیاں مخفی ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ سماع قبول بتلادیا گیا ﴿١﴾ اِنِّیْ ذٰلِكَ لَا يُبٰتِ لِّقَوْمٍ یُّسْمِعُوْنَ ﴿٢﴾ ”اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو بات سنتے ہیں۔“

یامثلًا بجلی کی کڑک اور اس سے خوف طمع کا دلوں میں من اللہ ورود، پھر آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دکھانے کی نشانیوں سے عبرت کچڑا محفل کا کام بتلادیا گیا ﴿٢﴾ اِنِّیْ ذٰلِكَ لَا يُبٰتِ لِّقَوْمٍ یُّعْقِلُوْنَ ﴿٣﴾ ”اس میں بہت پتے ہیں عقل والوں کے لئے۔“

یامثلًا قرون ماضیہ اور پچھلی امتوں کی تباہی اور بادیودان کی عظیم طاقت و قوت کے برسے دن آنے پر انہیں یہ اندل سکے کی عبرت ناک صورتوں سے درس عبرت لینا قلب کا کام بتلادیا گیا ﴿٣﴾ اِنِّیْ ذٰلِكَ لَذِکْرٍ لِّیُّنْ تَنۡبَیْۤا لِّہٖ قَلۡبٌ اَوْ اَلۡفَی السَّمۡعِ وَہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿٤﴾ ”اس میں سوچنے کی جگہ ہے۔ اس کو جس کے اندر دل ہے یا گائے کان دل لگا کر۔“ بہر حال فکر، علم، سمع، عقل، وجدان ہی وہ اسباب شمار کر دیئے گئے ہیں جن سے مخفی علوم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جواد پر کے دعویٰ کیلئے ایک واضح اور قطعی دلیل ہے۔ غرض انسان میں عموماً ہم آنے کے یہی تین راستے ہیں یا تین قوتیں ہیں۔ (حس، محسّس، وجدان) جو اعضاء ادراک کے ذریعہ ادراک و احساس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر جبکہ ظاہر نظر میں ادراک، کا عمل ان کے اعضاء ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے عالم و مدد رک ان اعضاء ہی کو کہا جاتا ہے اور انہی پر اس علم و احساس کی صحت و سقم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ دیکھئے والا کچھ ہی کو کہا جائے گا۔ مخفی طور پر دیکھنے کا کام قوت باصرہ کا ہے اور سننے والا کان ہی کو کہا جائے گا۔ حقیقتاً سننے والی طاقت قوت باسماع ہے وغیرہ۔

اعضائے ادراک کا باہمی فرق مراتب..... البتہ علمی کمال و نقصان کے اعتبار سے ان اعضاء کے علم و ادراک میں یکسانی نہیں۔ بلکہ تفاوت اور فرق مراتب کافی ہے، کوئی عضو وسیع العلم ہے اور کوئی ناقص العلم، کوئی عمیق العلم ہے اور کوئی سطحی العلم جس کا معیار یہ ہے کہ جو عضو اپنے علم و ادراک سے شی معلوم کی ذات اور اصلیت و حقیقت کا پتہ چلا سکتا ہے۔ اس کے علم کو کمال اور عمیق کہا جائے گا اور یہی معنی میں علم حقیقی کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ اور جس کا ادراک شی کے محض ظاہر و رسوم اور عوارض تک محدود رہ جانے سے شی کی تمام حقیقت سامنے نہ آ سکے، تو اس کے علم کو ناقص، سطحی اور ظاہری کہا جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شی کے ان رسوم و عوارض اور خواص و آثار میں جو عوارض حقیقت سے قریب ہوں گے۔ اسی حد تک ان کا علم ادراک علم حقیقت سے اقرب اور اس سے

① یازہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۲، ② یازہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۳، ③ یازہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۴، ④ یازہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۵

⑤ یازہ: ۲۶، سورۃ فرق، الآیۃ: ۳

شبہ کہائے گا اور اسی درجہ میں اس عضو کی شرافت دوسرے اعضا پر تسلیم کی جائے گی۔ ورنہ جس حد تک یہ عوارض کا علم، ہم حقیقت سے بعید ہوگا۔ اسی حد تک اسے ناتمام، ناقص اور غیر حقیقی علم کہا جائے گا۔

اسی صورتی و حقیقی اور سطحی، عمیق علم کا عنوان سامنے رکھ کر یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صورت جیسے ایک کھلی چیز ہے۔ جو سب کے سامنے ہوتی ہے ایسے ہی حقیقت ایک باطنی اور مخفی چیز ہے۔ جو ان ظاہری عوس سے محسوس نہیں ہوتی اور سب جانتے ہیں کہ حقیقت صورت سے افضل ہوتی ہے کہ صورت کے وجود کا سرچشمہ ہی حقیقت ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکال لینا آسان ہے کہ علم حقیقت یا علم ارواح یا علم باطن، در اس کے متعلقات کا علم، علم اعلیٰ ہوگا اور علم صورت یا علم اجسام یا علم رنگ و بو اور ان کے متعلقات کا علم، علم ادنیٰ ہوگا اور اسی تناسب سے ان علوم کے ادراک کرنے والے اعضاء میں بھی اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہوگا۔

پھر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی انظروں سے اوجھل نہ رہنی چاہئے کہ ظواہر اور صور و اشکال چونکہ محدود اور بہت سی حدود و یوں میں جبری ہوئی ہوتی ہے۔ بہ صورت نام ہی محدود بنی کا ہے۔ اس لئے ہر ایک شکل اپنی حد میں رو کر ہی دوسری شکلوں سے ممتاز اور متعارف ہوتی ہے۔ اس لئے ان ظواہر کے علم حاصل کرنے میں بھی حدود بندی و قیود و شرط ناگزیر ہیں کہ انہی حدود میں یہ اعضاء، ادراک، ان کا ادراک و احساس کر سکتے ہیں۔ اگر یہ قیود و حدود توڑ دی جائیں تو غم و احساس ہی کا وجود ممکن ہو جائے گا۔ جیسا کہ آئندہ ان قیود کی تشریح آ رہی ہے۔

اس نئے یہ اصولی و دعویٰ جسمانی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جس عضو کے علم و ادراک میں ظواہر کی قیود و شرط بڑھتی جائیں گی۔ اتنا ہی اس کا علم رکھی، سطحی، جزوی اور محدود ہوتا چلا جائے گا۔ جس کا نفع بھی محدود و ادنیٰ ہوگا اور اسی حد تک یہ عضو بھی ادنیٰ الاعضاء، شمار ہوگا اور جتنا کوئی عضو اپنے علم و ادراک میں رکھی قیود و حدود سے آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی اس کا علم بھی وسیع، مہر اور حاوی و شامل ہوتا جائے گا اور اسی حد تک یہ عضو بھی اشرف الاعضاء شمار ہوگا۔

[6] اعضائے ادراک کے علم کا باہمی تقاضا..... اس معیار کو سامنے رکھ کر جب ہم اس انسانی نیکل یا کائنات بدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں علم و ادراک کے لحاظ سے سب اعضاء یکساں نہیں ہیں۔ کوئی ذکی الحس ہے اور کوئی غبی اور بلید الحس ہے۔ کسی کا علم اونچا ہے اور کسی کا علم پست، کسی کا وسیع ہے اور کسی کا تنگ، اولاً محسوسات ہی کو لیا جائے۔ تو ان میں بھی یہ تفاوت کافی نمایاں ہے۔

مثلاً چھونے کی قوت جیسے قوت لامسہ کہتے ہیں۔ سب سے زیادہ بلید اور غبی قوت ہے۔ جس کا علم بہت سی قیودوں کے ساتھ مقید اور بہت سی حدود میں جبراً ہوا ہے۔ اس میں اولین شرط تو یہی ہے کہ وہ جس شے کی ادراک کرے وہ جسمانی ہو، روحانی یا معنوی نہ ہو کہ وہ حائیت کا علم و ادراک اس کی دسترس سے باہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اس جسم کو بھی وہ دور سے معلوم نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اس سے آ کر ٹک نہ جائے اور یہ اسے چھون نہ لے یعنی اس کے لئے اپنے معلوم سے محض قرب و اتصال کافی نہیں۔ بلکہ اصاف اور مل جانا ضروری

ہے اور پھر اس بھائی انصال یعنی نکرانہ کے باوجود بھی اسے کسی شے کا شخصی تیز و حمل نہیں ہوتا صرف جنسی یا نوعی امتیاز کا اور اک ہوتا ہے اور وہ بھی مبہم اور بھائی یعنی کسی چیز کو چھو کر اس چیز کی جنتی، نرمی، گرمی، مضطرب کا احساس ہو سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ معصوم ہو سکتا ہے کہ وہ انگڑی ہے یا پتھر، لوہا ہے یا مٹی یعنی زیادہ سے زیادہ اس کی نوعیت کا علم ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا مشخص اور متاثر نہیں ہو سکتا کہ وہ جنسی طور پر کیا ہے اور کون ہے؟

یعنی نوع کے ان عوارض سے بھی وہ کسی فرد کی تشخیص کر کے اس کی ذات کے بارے میں کوئی غیر مبہم علم حاصل نہیں کر سکتی۔ حالانکہ کسی شے کا جسم ظاہر ترین اثر ہے۔ جس میں کوئی خفا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود اس موٹے اور غماں جسم کو بھی یہ قوت بغیر موٹے اور بغیر اس سے گئے پٹے اسے یا اس کے بعض عوارض کو محسوس نہیں کر سکتی۔ تو اس سے زیادہ غبی اور بھید اور کون سی قوت ہو گی۔

پس ہم کی وہ حقیقت جس کا نام تیرہیں الاشیاء ہے۔ اسے بہت ہی معمولی درجہ کی انصیب ہوئی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہ قوت انسانی مدارکات میں نہایت کم رتبہ اور حقیر قوت ہے۔ جس کے علم کو نام ہی کے درجہ میں علم کہہ سکتے ہیں ورنہ وہ لاعلمی اور جہل سے ہی زیادہ قریب ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ قوت لامرہ کے ذریعہ کسی چیز کو چھو کر احساس کر لینا کوئی خاص کمال نہیں، ایک غبی سے غبی اس قوت کے ذریعہ مومن نے مومنوں کا دراکہ و احساس کر سکتا ہے۔ جس میں صلاحیت بھی نہ ہو کہ چھو کر بھی کسی شے کو کسی حد تک معلوم کرنے کے قوت اس سے زیادہ احمق اور جاہل اور کون ہو سکتا ہے؟ اسے تو جاندار کے بجائے پتھر اور لکڑی کہا جائے گا۔ تو یہی اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔

چنانچہ قرآن کریم نے کفار کا قرآن کے ساتھ عجز و اور انکار کا ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”یہ منکرا ہے بلیدہ لیس اور غبی الفہم ہیں کہ اگر وہ کتاب الہی کو دیکھ بھی لیں اور اسے ہاتھ سے چھو بھی دیں۔ تب بھی وہ اس کا انکار ہی کریں گے۔“ ظاہر ہے کہ کسی شے کے ظہور و شہود کا اس سے آگے اور درجہ ہی دن سا ہے کہ اسے دیکھ بھی لیا جائے اور چھو بھی دیا جائے اور پھر بھی وہ شے دماغ میں نہ اترے تو انہیں حیوان بھی نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ انسان کہا جائے۔ ارشاد باری ہے: ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ كُلِّ فَزٍّ طَائِفٍ فَلَمْ تُنَفِّسُوا بِآيَاتِنَاهُمْ لَقَالُوا الْغَيْبُ كُفْرًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَائِفٌ﴾ (ان ہذا الایات خبر مؤیدہ) ① اور اگر ہم کا نذر پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتے۔ پھر یہ لوگ بس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔ تب بھی یہ کافر لوگ۔ یہ ہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے۔ قرآن کے اس بیان حتمی سے واضح ہوا کہ کسی کی نظر میں قوت نامہ غیبی ترین قوت ہے جس کا ادراک نہایت ہی کمزور درجے کا علم ہے۔ جو محض جسم کو نوع اور جسم کے اوپر نمایاں عوارض، طول و عرض اور عبق کے ادراک سے آگے نہیں بڑھتا اور وہ بھی ٹٹول کر جس میں پورا اہتمام رہتا ہے۔ کوئی خاص تیز حاصل نہیں ہوتی۔ تاکہ کسی نوع کے اشخاص و افراد تیز ہو جائیں۔ اس لئے اس کے علم کو علم کبرا در حقیقت علم سے لاطیف کا اظہار کرنا ہے۔ اور اس

① پارہ ۷، سورۃ الانعام، الآیہ ۷.

لئے اس کے ذریعے ایسے مبہم علم کا حاصل کرنے والا اہل علم میں شمار نہیں ہو سکتا۔

⑤ قوت ذائقہ..... دوسری قوت ذائقہ ہے جس کا محل زبان ہے۔ وہ کھٹے میٹھے کا پتہ چلا دیتی ہے جو ایک باطنی خاصہ ہے۔ لیکن یہ قوت بھی اس وقت تک کسی چیز کے مزے کا ادراک نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ ذائقہ دار چیز کو زبان سے ملانہ دیا جائے۔ اس لئے یہاں بھی وہی اتصال نام بلکہ الصاق اور شے کے لگ جانے کی شرط ہے جو قوت لامسہ میں تھی کہ یہ بھی بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے ذائقہ کا ادراک نہیں کر سکتی اور جتنا بھی کرتی ہے وہ شے کے عوارض کھٹے میٹھے تک ہی محدود ہے۔ جس سے شے کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے اسے بھی قوت لامسہ کا ایک فرد سمجھنا چاہئے۔ فرق اتنا ہو گا کہ لمس دمس کی قوت جب ہاتھ پیر اور جلد بدن کے ذریعہ اپنا کام کرتی ہے تو جسم کی سختی اور نرمی اور گرمی، ٹھنڈک کا احساس کرتی ہے اور جب زبان کے ذریعہ کام کرتی ہے تو ذائقے اور مزے کا احساس کر لیتی ہے بلکہ اسی کا ایک فرد قوت شہوانی بھی ہے۔ جو حقیقتاً قوت لامسہ ہی ہے کہ بغیر اپنے محسوس سے لگے ہوئے لذت کا احساس نہیں کر سکتی ہے۔ پس یہی لامسہ جب اعضاء شہوت پر ظاہر ہوتی ہے تو شہوانی لذتوں کا ادراک کر لیتی ہے۔ لیکن لامسہ کی ان سب قسموں میں قدر مشترک یہی ہے کہ وہ کسی جسم سے لگیں اور چھسیں تب ہی ادراک کر سکیں گی بغیر اس کے یہ جسمانی خواص و عوارض ان کے احساس میں نہیں آ سکتے۔ فرق اگر ہے تو قوت کا نہیں محل کا ہے۔ یعنی جس محل میں لگنا اور چھونا واقع ہو گا اسی محل کے عوارض احساس میں آ جائیں گے کہیں سختی نرمی کہیں مزہ اور ذائقہ اور کہیں لذات شہوت وغیرہ البتہ ان میں سے بعض ظاہر بدن کے عوارض ہیں اور بعض باطن بدن کے اور بعض باطن بدن سے بھی گذر کر نفس کے اور اسی لحاظ سے ان میں فرق مراتب ہے کہ بعض اس سے اعلیٰ ہیں۔ جیسے مزہ اور ذائقہ کہ وہ فی الجملہ باطن جسم سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جیسے لذت شہوت کہ وہ بدن کی گہرائیوں میں نفس کے عوارض سے متعلق ہیں اور بعض اس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ جو ایک باطنی کیفیت ہے مگر اس فرق کے باوجود ان سب میں قدر مشترک وہی لمس دمس (لگنا اور چھونا) ہے۔ اس لئے یہ سب قوت لامسہ ہی کے افراد شمار کئے جائیں گے۔ جنہیں کسی شے کی حقیقت و ماہیت کی دریافت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس قوت لامسہ کے لمس دمس یعنی لگنے چھونے کو بعض جگہ ذوق سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے بھی قوت لامسہ ذائقہ ہی کا ایک فرد ہے۔ چنانچہ روز قیامت عذاب نار اور عذاب ستر (جنہم) میں بدن سے مس کرے گا۔ جب ہی اس کی اذیت محسوس ہوگی۔ لیکن اس مس کو قرآن حکیم میں چھکنے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا گیا ﴿ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ﴾ ① ”ستر (عذاب جنہم) کے چھونے کا مزہ چکھو“۔

جس سے لامسہ اور ذائقہ کا ایک دوسرے سے قریب ہونا معلوم ہوا یا جیسے موت ایک چھونے کی چیز ہے جس

کے نکلنے سے روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے نکلنے ہی کو قرآن نے چمکنے سے تعبیر فرمایا۔ جیسے ارشاد حق ہے۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَا نَفْثَةٍ الْمَوْتُ﴾ ① ”ہر نفس کے لئے موت کا مزہ (چمکنا) ہے۔“

پس چیز چھوڑنے کی تھی، جس کا تعلق لمس اور مس سے تھا اور اسے تعبیر کیا گیا ذائقہ سے۔ یا جیسے قرآن کریم نے جہاں ایک بہتی کے کفرانِ نعمت پر جسے رزق برطرف سے دیا جارہا تھا۔ اس کا نتیجہ بدظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَإِذَا ذُوقُوا عَذَابَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ ② ”اللہ نے انہیں لباسِ جوع و خوف کا مزہ چکھا دیا۔“

ظاہر ہے کہ عذابِ مس کرنے کی چیز ہے اسی لئے تو اسے لباس فرمایا گیا کہ جیسے لباس بدن سے چپک جاتا ہے۔ ایسے ہی عذاب بھی اس بہتی کے تن پر لباس کی طرح چسٹ ہو گیا کہ نہ وہ اسے جلدی سے اتار سکتے تھے نہ اس کی اذیت سے بچ سکتے تھے۔ لیکن اس اذیت اللہ نے کو قرآن نے چمکنے سے تعبیر فرمایا کہ اللہ نے اس بہتی کو عذابِ جوع و خوف کے لباس کا ذائقہ چکھا دیا۔

جس سے واضح ہے کہ وہ لباس کا چھو تا تو بدن سے نکلنے اور چمکنے کی چیز ہے، مگر چونکہ وہ تاثر کے لحاظ سے چمکنے سے اقرب ہے۔ اس لئے اسے ذائقہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ جس سے قرآنی روشنی میں بھی کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ کہ ذائقہ کی قوت لامسہ کی قوت سے الگ نہیں بلکہ اسی کا ایک فرد ہے یہ الگ بات ہے کہ قوتِ ذائقہ، لامسہ کا ایک اونچا فرد ہے۔ مگر جب کہ وہ لامسہ ہی ہے اور لمس و مس ہی پر اس کے ادراک کا دار و مدار ہے تو اسے لامسہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور جو حکم لامسہ کا ہوگا، وہی اس کا بھی ہوگا۔ سو لامسہ کسی شے کی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتی بلکہ صرف اس کے بعض بدنی عوارض ہی کے ادراک تک محدود ہے۔

ایسے ہی ذائقہ بھی خواہ زبان سے چمکنے کا ہو یا اعضاءِ شہوت سے چمکنے کا رہے گا عوارضِ بدن کی کے پہچان کی حد تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے قوتِ ذائقہ کا علم بھی ادنیٰ ہی درجہ کا علم ثابت ہوا۔ جسے ہم کی فہرست میں کوئی اونچا مقام نہیں دیا جاسکتا اور اس کے مددک و عامل کو اعلیٰ ترین کے علماء کی فہرست میں شمار نہیں کیا جائے گا کہ یہ کوئی معتد بہ علم ہی نہیں۔

⑦ قوتِ شامہ..... رہی قوتِ شامہ (سوچنے کی قوت) سو وہ بلاشبہ اپنی کارفرمائی میں بظاہر لامسہ اور ذائقہ کے طرح لمس و مس کی محتاج نہیں۔ بلکہ جسم سے ملے بغیر دور ہی سے خوشبو یا بدبو کا احساس کر لیتی ہے۔ اس لئے اس قوت کو قوتِ لامسہ کی طرح بلیدِ لمس اور ضعیفِ احساس نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ذی لمس باور کیا جائے گا، کیونکہ وہ کسی شے کی خوشبو، بدبو سوچنے میں اس کی محتاج نہیں کہ خوشبودار چیز کو ناک سے مرگزا جائے۔ جب ہی وہ اس کی خوشبو کا ادراک کرے۔ بلکہ وہ دور سے بھی خوشبو کو محسوس کر لیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی قوتِ لامسہ سے کچھ دور

نہیں۔ کیونکہ اس میں خوشبودار شے کا ناک سے لگ جانا ضروری ہے۔ خواہ اسے ہوا ہی لا کر لگائے۔

چنانچہ پھول نہیں رکھ دیئے جائیں۔ تو سارا مکان سبک جاتا ہے اور ہر ناک اسے دور سے ہی سونگھ لیتی ہے یا کسی پھول دار درخت کے پھولوں کی خوشبو بعض اوقات مٹیوں گز دور سے محسوس کر لی جاتی ہے جو ہوا کا کرشمہ ہے مگر درخت ناک کے قریب نہیں۔ لیکن اس سے سونگھنے کی قوت کی کوئی فوقیت یا لطافت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہوا کہ لطافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ ناک کی قوت درخت تک نہیں جاتی بلکہ ہوا اس کی خوشبو کو ناک تک کے لئے آتی ہے، اور ناک اسے جب ہی سونگھتی ہے کہ وہ خوشبو اڑ کر ناک تک آ جائے اور اسے لگ جائے۔ فرق اتنا ہے کہ لامسہ اور ذائقہ میں ذائقہ دار چیز کا مزہ اور ذائقہ زبان تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ خود اس چیز کو زبان سے نہ ملا دیا جائے۔ لیکن خوشبو ذائقہ اور مزہ سے اس حد تک ضرور لطیف ہے کہ اپنے محل یعنی پھول وغیرہ سے الگ ہو کر اور اڑ کر ناک تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر ناک اسے جب ہی محسوس کرے گی کہ وہ ناک سے آگے ہیں لامسہ میں خود جسم آ کر لگتا ہے۔ جب ہی وہ احساس کرتی ہے اور شامہ میں جسم کے یہ عوارض یعنی خوشبو یا بد بو آ کر ناک کو لگتے ہیں۔ تب وہ ان کا احساس کرتی ہے۔ خواہ وہ ہوا ہی کے ذریعہ آئیں مگر مس کرنا بہر حال ضروری رہا۔ ورنہ سونگھنے کی قوت اور ناک سے عاجز رہ جائے گی۔ اس لئے سونگھنے کی قوت بھی چھونے کے قوت سے اپنی کارکردگی میں کچھ زیادہ قائل نہیں ثابت ہوئی۔ فوقیت اگر ہے تو ان کے محسوسات میں ہے کہ ایک کا محسوس کثیف ہے اور ایک کا لطیف لیکن حاسہ دونوں کے یکساں ہیں۔ پر اس میں بھی یہ چھونے اور بچھنے کی قوتیں یکساں ہی ہیں کہ شے کی حقیقت کا اور ناک ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتی صرف عوارض شے کا احساس کرتی ہے۔ اس لئے کو بعض جہات سے قوت لامسہ اور ذائقہ پر کچھ قائل تھی۔ مگر شرائط اور ادراک اور نوعیت ادراک میں سب قریب ہی قریب ہیں۔

پھر یہ سب قوتیں صرف اجسام ہی میں اپنا کام کر سکتی ہیں نہ کہ ارواح و حقائق میں۔ چنانچہ روح نہ چھوئی جاسکتی ہے نہ ٹوٹی جاسکتی ہے اور نہ ہی چھمس جاسکتی ہے۔ اور پھر سب میں وہ اتصال اور لگنے کی شرط بھی مشترک ہے کہ جب ان کا محسوس ان سے آ کر ملے جب ہی وہ ادراک کر سکتی ہیں ورنہ نہیں اور اوہ ان سب کی سب کا ادراک پھر بھی عوارض جسم ہی تک محدود ہے، ذات تک ان میں سے کسی کی بھی رسائی نہیں کہ اسے معلوم کر لیں۔ اس لئے اس سونگھنے کی قوت کا علم و ادراک بھی کچھ زیادہ معتد بہ اور قابل شمار ثابت نہ ہوا۔

8 قوت شامہ کے جزوی علم پر قرآنی استشہاد..... قرآن حکیم سے بھی اس کی طرف راہنمائی ملتی ہے کہ محض سونگھ لینا کوئی خاص اور امتیازی شان کا علم نہیں۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خوشبوئے یوسف سونگھ لینے کی حکایت سے جو قرآن نے کی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ﴿وَإِنْسِي لَكَ جِدَارًا يَنْبَغُ يُوسُفَ لَوْلَا أَنَّا نُنْقِذُ الْوَلَدَ﴾ ① (میں (یعقوب علیہ السلام) یوسف کی خوشبو پاتا ہوں کہیں تم مجھے جھٹلاؤ نہ۔)

آیت میں رتج یوسف فرمایا گیا ہے محض رتج اور خوشبو نہیں کہہ دیا گیا ہے یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایک خوشبو پاتا ہوں۔ (معلوم نہیں کس کی ہے؟) بلکہ یہ فرمایا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں۔ جس میں خوشبو والے کا علم بھی شامل تھا۔ جو ایک شخص اور واقعاتی علم ہے۔ تو انہیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ کہیں اسے جھٹلا نہ دیا جائے۔ جو ایک حقیقت واقعہ کی تکذیب ہوگی۔ ورنہ اگر مطلقاً کسی خوشبو سوگھ لینے کی بات ہوتی تو جھٹلانے کی فکر نہ ہوتی۔ کیونکہ مطلقاً کوئی خوشبو ناک میں آ جائے تو خود سوگھنے والے کو بھی تر و دلائق ہو سکتا ہے کہ یہ کس چیز کی خوشبو ہے۔ اس لئے اگر دوسروں کو بھی اس میں تر و دلائق ہو اور وہ اسے جھٹلا دیں تو جھٹلا دینے کی کوئی بھی فکر سوگھنے والے کو نہیں ہوتی، کہ وہ خود بھی کسی تمیز حیثیت تک پہنچا ہوا نہیں جھٹلانے کی یہ فکر جب ہی ہوتی ہے کہ ناک میں معین شے کی خوشبو آئے اور اس علاقہ کے ساتھ آئے کہ یہ فلاں کی خوشبو ہے، کسی اور کی نہیں تو یہ ایک تمیز اور معتد بہ علم ہوتا ہے جسے جھٹلانے کا کوئی واقعہ نہیں۔

پس آیت کریمہ سے صرف واضح ہے کہ خوشبوئے معین جس میں خوشبو والا بھی مشخص ہو علم ہے جو قابل تکذیب نہیں۔ اس کا اقتضائی نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ مطلقاً خوشبو سوگھ لینا جس میں خوشبو والا ذہن میں مشخص نہ ہو۔ کوئی معتد بہ علم نہیں اور ظاہر ہے کہ ناک کا علم اتنا ہی ہے کہ وہ خوشبو سوگھ لے نہ کہ اس کے ساتھ خوشبو والے کو بھی مشخص کرے کہ یہ ناک کا کام نہیں، ذہن کا کام ہے۔ تو قرآن سے بطور اقتضائے نص واضح ہو گیا کہ ناک کا علم جس میں صرف خوشبو ذہن میں حاضر ہوتی ہے خوشبو والا مشخص نہیں ہوتا۔ کوئی اعلیٰ علم نہیں کیونکہ ناک بنائی ہی معنی ہے، صرف خوشبو کا ادراک کرنے کے لئے نہ کہ خوشبو والی اشیاء کی تشخیص کے لئے۔

قوت لامہ، ذائقہ اور شامہ کا علم کوئی معتد بہ علم نہیں ہے..... اس لئے جیسے چھونے اور سمجھنے کا علم مخصوص قرآنی کی روشنی میں کوئی اعلیٰ علم ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس پر دور رس نتائج و ثمرات مرتب ہوں بلکہ محض ایک جزوی علم تھا۔ ایسے ہی سوگھنے کا علم بھی اس آیت قرآنی کی روشنی میں کوئی اونچا علم نہیں لھتا کہ اس پر دین و دنیا کے کچھ دور رس اور اہم ثمرات مرتب ہوں۔ بلکہ ایک جزوی علم ثابت ہوتا ہے جس سے نہ کسی شے کی تمام حقیقت واضح ہوتی ہے اور نہ خود شے ہی تمیز ہوتی ہے۔ اس لئے ناک بہر حال پھر اپنے ہی جزوی علم کے مقام پر آ کر ٹھہر گئی اور اسے کوئی اصولی فوقیت ہاتھ، پاؤں اور زبان پر حاصل نہ ہو سکی، اس پر ثمرات بھی جزوی مرتب ہوں گے جو قابل شمار نہ ہوں گے۔ اب جب کہ چھونے، سمجھنے، سوگھنے یعنی قوت ذائقہ، قوت شامہ اور باغلاظ و غیر ہاتھ، پیر، زبان اور ناک کا علم معتد بہ نہ رہا۔ بلکہ ایسا جزوی ثابت ہوا کہ ان پر انسان کے حق میں کچھ دور رس نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

معتد بہ علم آنکھ کا ان اور قلب ہی کا ہے..... اس لئے مد رک اعضاء میں اب تین ہی بنیادی اعضاء رہ جاتے ہیں کہ ان کے علم کو ان مذکورہ اعضاء کی نسبت سے معتد بہ علم کہا جائے۔ آنکھ کا ان اور قلب یعنی دیکھنے کا علم، سننے کا علم اور سمجھنے کا علم جن کے علم کو علم شمار کیا جائے اور وہ اہمیت کے ساتھ قابل ذکر ہوں اور پھر ان معلومات پر دنیا و آخرت

کے دور رس نتائج مرتب ہوں سو غور کیا جائے تو یہ تینوں اعضاء اور ان کی یہ علمی قوتیں حقیقتاً ایسے علم و ادراکات کی حامل ہیں۔ جن کا علم بہت حد تک امتیاز و تمیز کی شان بھی ہے جو علم کی حقیقت ہے اور اسکے نتائج بھی دور رس انداز میں انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات بدن کی بقا و ترقی کا راز کچھ انہی تین اعضاء کے علم میں مضمر ہے، اور انسان سے مواخذہ اور دنیا و آخرت میں پرسش و جواب کی ذمہ داری زیادہ تر انہی تین قوتوں سے، بصیر اور فہم پر، کند ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں جہاں انسان کے قابل ذکر اور موجب مسئولیت و مواخذہ غم و ادراک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہاں خصوصی طور پر انہی تین قوتوں سے، بصیر اور فہم کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

سمیع، بھر اور قلب کی عطا..... ایک موقع پر جہاں انسان پر علم ویسے جانے کے احسن کو جتلیا گیا ہے وہاں انہی تین قوتوں کے عطا فرمانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ انسان میں قلیل اعتنا اور قلیل ذکر یہی تین علمی قوتیں ہیں۔

سمیع، بھر اور قلب کا احساناً ذکر فرمایا گیا۔۔۔۔۔ چنانچہ یمن مادر میں انسان کی ان ہی قوتوں کے رکھے جانے کا احسان ذیل کے الفاظ میں جتلا گیا۔ ارشادِ باری ہے: ﴿ثُمَّ مَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوْحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ ① (پھر اس (انفس) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح ڈالی اور تمہارے لئے سنتے دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں رکھیں مگر تم ہی شکر کرتے ہو۔ پھر یمن مادر سے نکالتے ہوئے بھی انسان پر انہی تین قوتوں کی ایجاد عطا کا احسان جتلا گیا ہے۔ ارشادِ حق ہے: ﴿وَالنِّسَاءَ أَخْرَجْنَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَتَعْلَمُنَّ سَبْعًا وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ② ”اور اللہ نے نکالنا تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے کسی چیز کو اور دے تم کو کان آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو۔“

انسانی گمراہی کے ذمہ دار بھی یہی اعضاءِ ثلاثہ ہیں..... پھر آدمی کی ذمہ داری بھی انہی تین قوتوں کی بیداری اور سرخ ہو جانے پر عائد ہوئی گئی ہے ارشادِ الہی ہے: ﴿تَقَرَّبْتُ مِنْ اَتَّخِذُ اللّٰهُ هَوَاهُ وَاَضَلُّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمِهِ وَخَسَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ لِنَفْسِهِ هَوًى ۖ فَاَتَّبِعْ لَهٗ غِيَاوَةً﴾ بھلا دیکھو تو جس نے شہرِ باطن اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بھلا دیا اس کو اللہ نے نہ متابو جتھا، اور مہرِ گادی اس کے کان پر اور دل پر اور زوال دی اس کی آنکھ پر اندھیری۔

انہی اعضاء عمل کے مسئلہ پر بھی قرار دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ پھر انسانی بدن اسی کے موقع پر انہی تین توہوں کی بے راہ روی پر مذہبی اور اخروی مسوئیت بھی عائد کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لِقَائِ اللَّهِ بِهِ عِلْمَ مَا فِي السَّمْعِ وَالْبَصَرِ وَالْفُؤَادِ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عِنْدَ مُسَوِّدِ الْقُلُوبِ﴾ اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے بوجھ ہوگی۔“

② يار: ١٣، سور الفتح، الآية: ٤٨.

① پارہ: ۲ سورۃ السجدہ، الآیہ: ۹.

③ پھر: ۵۱ | سورۃ الاسراء، الآیہ: ۳۶.

اعضاء خلاشہ کا غلط مصرف ہی عذابِ جہنم کا سبب ہوگا..... اور آخر جب آدمی اپنی جاہلانہ اور عاصیانہ حرکتوں کے سلسلہ ارتکاب سے دنیا میں حیوان صفت اور آخرت میں جہنم کا سبب ہوگا۔ تو اس کی کس ذمہ داری انہیں تین عملی قوتوں پر ڈالی گئی ہے کہ جب یہ معتد بہ قسم کے تین عم قہمیں دیے جانے لگے تھے اور تم نے عواقب اور نتائج کو ان قوتوں کی بدولت سمجھ لیا تھا۔ تو پھر ان سے حق جوئی کا کام کیوں نہیں لیا؟ اور کیوں ان ناشائستہ حرکتوں میں مبتلا رہے؟ اس سے واضح ہوا کہ علمی زندگی کے بننے بڑنے کا تعلق زیادہ تر انہی تین علوم و ادراکات سے ہے۔ ارشد حق ہے: ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كُتُبًا مِّنَ الْجِبِّ وَالْأَنْسَابِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بَيِّنَاتٍ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بَيِّنَاتٍ وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بَيِّنَاتٍ أُولَٰئِكَ كَانُوا لَكُم مِّنَ الدُّنْيَا قُلُوبًا لَا يَفْقَهُونَ﴾ ① اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بکرا ان سے بھی زیادہ براہ، وہی لوگ ہیں غفل۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿حُتِّمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ② ”مگر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔“

اعضاء و تناسخ کے علم پر ہی ثمرات دنیا و آخرت کا مدار ہے..... بہر حال ان خصوص کریمہ سے واضح ہے کہ ان تین اعضاء آکھ، کان اور قلب کا علم ایک بنیادی اور اساسی علم ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کے ثمرات زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ اگر یہ تین علم غلط ہو جائیں۔ تو دنیا کا علم اور آخرت کا سکون کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر صحیح ہیں اور اپنے صحیح آثار دکھا رہے ہوں تو انہی سے آخرت و دنیا دونوں بن جاتی ہیں۔

اس موقع پر ہاتھ پاؤں، ناک یعنی لامر، ذائقہ اور شامہ کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ ان کا علم ایسا بنیادی اور معتد بہ قسم کا نہیں۔ جو دنیا و آخرت کے بننے بڑنے کا مدار کار ہو۔ بلکہ بہت حد تک یہ تینوں علم انہی بعد کے تینوں علوم کے تابع اور ان کے زیر اثر ہیں پس اصل علم یہی تین عموم ظہر جاتے ہیں۔ یعنی علم جو آکھ سے حاصل ہو، سنی علم جو کان سے حاصل ہو اور نبی علم جو قلب سے بھرے۔

③ کثرت قیود و شرائط و وسعت علم کے لئے مانع ہیں..... لیکن باوجود ان تینوں علمی قوتوں کے معتد بہ اور قابل ذکر ہونے کے پھر بھی اسی معیار کی روش سے کہ جس علم کے لئے اور اک کی قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ علم وسیع نہیں رہتا اور جس پر قیدیں اور شرطیں کم ہوں۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

اعضاء خلاشہ میں آکھ کا دائرہ عم سب سے تنگ ہے..... ان تینوں علوم میں بھی تفاوت اور فرق مراتب ہے۔ جو قرآن ہی کا مقتضاء ہے مثلاً آکھ کے علم میں چونکہ قیود و شروط بہت ہیں اور کان کے علم میں کم۔

اس نئے آنکھ کے علم کا دائرہ کان کی بہ نسبت تنگ اور محدود ہے۔ چنانچہ آنکھ کا علم اول تو صرف جسمانیات تک محدود ہے وہ دیات کو تو دیکھ سکتی ہے۔ روحانیت کو نہیں۔ اس نے آج تک خود اپنی روح کو بھی باوجود انتہائی قرب کے نہیں دیکھ جس سے واضح ہے کہ معنویات اور لہائف کے ادراک سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ آنکھ سے اگر انسان کی صورت پوچھو تو بتا دے گی۔ لیکن اگر اس کی حقیقت اور معنویت پوچھئے لگو تو وہ معذور رہ جائے گی۔ پھر بلحاظ زہ نہ جسمانیات کے دائرہ میں بھی اسے ماضی و مستقبل کے دیکھ لینے سے کوئی واسطہ نہیں جو چیزیں جا چکی ہیں یا جو آنے والی ہیں۔ آنکھ ان کے دیدار سے محروم ہے اور ان کی صورت، شکل یا جسم کا کوئی بھی پتہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس کا دائرہ عمل صرف حال رہ جاتا ہے کہ وہ صرف موجودات و وقت پر نظر ڈال لے اور ماضی و مستقبل کے دیدار سے محروم رہے۔ پھر موجودات و وقت کے دائرہ میں بھی اس کے دیکھنے کے لئے تقاضی شرط ہے کہ وہ چیز آنکھ کے سامنے ہو۔ دائیں یا بائیں پشت ہوئی تو وہ پھر ادراک سے عاجز رہ جائے گی۔ پھر تقاضی میں بھی اتصال معتدل کی شرط ہے کہ قابل دیدن سے آنکھ سے نہ زیادہ دور نہ زیادہ نزدیک۔ بہت دور ہو تب بھی آنکھ بے کار ثابت ہوتی ہے اور بہت نزدیک ہوتی کہ آنکھ سے ملا دی جائے تو پھر بھی وہ دیدار سے عاجز رہ جاتی ہے۔

پھر اس معتدل فاصلہ کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ بیچ میں کوئی حائل اور حجاب بھی نہ ہو۔ اگر ذرا سا پردہ بھی بیچ میں آجائے تو آنکھ دیدار سے معذور رہ جاتی ہے۔ پھر بلا حائل ہو کر بھی دیکھنے کی چیز کا سکون شرط ہے۔ اگر وہ متحرک ہو تو پھر بھی اس پر نگاہ نہیں جم سکتی کہ دیدار ہو جائے اور بینائی اپنا صحیح کام کر جائے۔ پھر بھی خواہ مخواہ نگاہ جمادی جائے گی تو گودیذرا ہو جائے گا۔ مگر غلط ہوگا کہ شے کچھ سے کچھ دکھائی دینے لگے گی۔ جیسے ایک گول پیہر حرکت کرتا ہوا دکھا جائے تو اس کے درمیان کا قطر اور اس کی کڑیاں سب نگاہوں سے غائب ہو جائیں گی اور پیہر بجائے درمیانی خلاؤں کو دکھانے کے متصل واحد ایک شے دکھائی دے گا۔ جو اس کی واقعی ہئیت نہیں ہے۔

بہر حال آنکھ کی کارفرمائی میں ایک دو نہیں بہت سی شرطیں ہیں۔ جن کے بغیر وہ اپنی کارفرمائی نہیں کر سکتی۔ یعنی شے کا جسمانی ہونا، مقابل ہونا، حال ہونا، متصل ہونا، بلا حائل ہونا، ساکن ہونا وغیرہ کہ ان شرطوں کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہوتا، اس نئے آنکھ کے علم کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ثابت ہوا اور اس سب کے باوجود جتنا بھی علم ہوگا وہ سطحی ہوگا وہ سوائے اوپر اور پر کی صورت اور رنگ و نقش کے کچھ اور نہیں دیکھ سکے گی۔ حتیٰ کہ اگر کسی جسم کا جبر تک چاک کر کے اسے دکھایا جائے تب بھی اسے سطح اور رنگ ہی نظر آئے گا۔ کوئی گہری حقیقت ہرگز متکشف نہ ہوگی۔

بندگان عقل کا علم بصر پر غلط اعتماد..... اس لئے یہ علم اصلی ہونے کے باوجود پھر بھی سطحی اور غیر معتد بہ ثابت ہوتا ہے۔ جس پر آج دنیا میں بے حد فخر و دُور کا اظہار کیا جا رہا ہے اور یقینی مشاہدہ ہی کو اصل الاصول اور یقین کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ کسی شے کا علم جو اس کے بارے میں یقین و اطمینان کی بنیاد بن سکتا ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا مشاہدہ ہے نہ کہ اوپری صورت اور نقش و نگار کا محاسنہ ہے۔ پس آنکھ کے مشاہدہ کا جب کہ حقائق سے تعلق

ہی نہیں جو کسی شے کی حقیقت کے بارے میں یقین و اطمینان کی بنیادیں مستحکم کر سکے۔ تو اس کے علم کو کسی درجہ میں علم حقیقی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی ہر دور کے دہرائے اپنے یعنی مشاہدات ہی کو اصل سمجھ کر معنویات میں بھی یعنی مشاہدہ کے طلب گار رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لطیف و خیر خدا نے برحق کے بارے میں بھی یعنی مشاہدہ ہی کا مطالبہ کر کے ایمان کو اس پر معلق کر چکے ہیں یہود نے کہا تھا کہ ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهَنَّمَ﴾ ① ”(اے موسیٰ) ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔“ یا مشرکین کہہ رہے تھے کہ ﴿اَوْ تَسْبِيحُ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ لَبِیْلًا﴾ ② ”(اے پیغمبر) ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، یا لے آ، اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے۔“

لیکن ان ہنگاموں میں عقل کو اس کا شعور نہ ہوا کہ آنکھ معنویات اور لطائف کے احساس کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ جیسا کہ کان صورت میں دیکھنے کے لئے اور ناک آوازیں سننے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ اس لئے جیسے کان سے صورتیں دیکھنے اور ناک سے آوازیں سننے کا مطالبہ لغو اور بے عقلی ہے۔ ایسے ہی آنکھ سے علم و اخلاق، یا روح یا حق تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ بھی خلاف فطرت اور کج عقلی ہے۔ پس دیکھنے کا تعلق صرف رسوم و نقوش اور سطوح و خطوط سے ہے نہ کہ شے کی ذات اور حقیقت سے اور یقین کی بنیادیں رسوم و نقوش پر قائم نہیں ہوتیں۔ بلکہ شے کی ذات اور اس کے حقائق کے ادراک پر قائم ہوتی ہیں۔ اس لئے آنکھ کا علم ان تینوں آلات علم آنکھ، کان و قلب میں سے اپنی ذات میں قلیل ترین اور محدود ترین علم ثابت ہوتا ہے جسے آج سب سے اوجہ علم ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج اس کے دور رس ہوں۔

③ کان اور قلب کا دائرہ علم آنکھ سے وسیع ہے..... بخلاف کان اور قلب کے کہ ان دونوں کا علم آنکھ سے کہیں زیادہ وسیع اور عقل ہے۔ وہ ٹھوس جسم کے بجائے اس کے لطیف ترین عوارض کا ادراک کر لیتے ہیں جو آنکھ کے پس کی بات نہیں پھر ان میں زمان و مکان کی بھی قید نہیں کہ کان صرف وقت پر ہی بات نہیں۔ بلکہ وہ ماضی اور مستقبل کے واقعات کا بھی ادراک کر لیتے ہیں اور زمانہ بیچ میں حاسّ نہیں ہوتا۔ پھر کان کے سننے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آواز سنانے والا کان کے متقابل ہو کر ہی آواز لگائے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ دائیں بائیں، آگے پیچھے جہاں سے بھی آواز آئے گی کان سن لیں گے اور دل اسے کچھ نہ کچھ سمجھ لے گا۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آواز دینے والا کان سے مل کر یا بہت قریب آ کر ہی آواز دے تو سنی جائے ورنہ نہیں۔ بلکہ میلوں دور کی آوازیں بھی کانوں میں سما جاتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں اور دل ان کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ پھر ان دونوں کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ درمیانی حائل ان کی سماعت میں رکاوٹ پیدا کر دے کہ بیلا حائل تو آواز سنی جائے، ورنہ نہیں بلکہ پس دیوار اور مشتعل مکانوں کی آوازیں بھی کانوں میں فوراً آ جاتی ہیں اور وہ ادراک کر

لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کان صرف امور حاضرہ ہی کا ادراک کریں۔ بلکہ امور غائبہ اور مخفی واقعات بھی آواز کے ذریعہ کانوں کے پردوں میں اتر آتے ہیں۔ اس لئے کان اور قلب یا سمع اور فہم کا علم بلاشبہ آنکھ کے علم سے کہیں زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور گہرا ثابت ہوتا ہے۔ جس میں آنکھ کی بہ نسبت قیدیں اور شرطیں آدمی بھی نہیں ہیں۔

کان اور قلب کے واقعات گزشتہ کے ادراک کرنے پر قرآنی استشہاد..... چنانچہ قرآن کریم نے جہاں لگا ہوں سے ادھم اور ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے امور کا ذکر عبرت و موعظت کے لئے کیا ہے۔ وہاں آکھ کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس میدان میں کام کر سکتے ہیں۔ ارشاد حق ہے ﴿اَفَلَمْ يَسْمِعُوا لِهٰٓی الْاٰرَضِ فَتَكُوْنُ لِهٰٓیمْ قُلُوْبٌ یَّعْبَلُوْنَ یٰۤاٰذَا نَاسٌ یَّسْمَعُوْنَ یٰۤاٰذَا نَاسٌ﴾ ① کیا سیر نہیں کی ملک کی، جو اس کے دل ہوتے جن سے سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے سنتے۔ کیوں کہ ہزاروں برس قبل کی ماضی کی سرگزشتوں اور سرکشوں کا انجام بد آکھ نہیں دیکھ سکتی۔ کان ہی اسے سچی خبروں سے سن سکتے تھے اور دل ہی اسے سمجھ کر عبرت پکڑ سکتے تھے۔

چنانچہ جو لوگ حق کے بارہ میں نہ سننے سے کام لیتے تھے نہ سمجھنے سے، انہ کا نون کو متوجہ کرتے تھے نہ دلوں کو قرآن حکیم نے انہیں دھوروں اور ڈنگروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ان کے انہی دواعضاء کان اور قلب کے مجز جانے کا ذکر فرمایا کہ ان دو کے معطل ہو جانے سے سارا نفس انسانی انسانیت سے نکل کر اور معطل ہو کر حیوانوں کی لائن میں چلا گیا فرمایا: ﴿وَأَمَّا نَحْنُ حَسْبُ أَنْ نَخْشَرَ هُمْ يَنْسَمُونَ أَوْ يُعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ ⑦ ”کیا آپ کو گمان ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سننے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو چرہ پایوں کی مانند ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ ہٹکے ہوئے ہیں۔“

اس طرح تذکیر موعظت کے موقع پر کانوں اور دلوں ہی کو متوجہ کیا گیا ہے کہ باطنی بیداری کی داستانیں کانوں سے سن کر دلوں کا ان سے نصیحت و عبرت پذیر ہونا، کان اور قلب ہی کا کام ہو سکتا تھا تا کہ آنکھ کا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كُنْتم أَفْلَکًا فَبِلَهُمْ مِنْ قَوْنِ هُمْ أَسْتَدُ مِنْهُمْ يَنْظُرُوا نَفْسًا لِقَوْلِ ابْنِ الْيَلَادِ هَلْ مِنْ مُجِيبٍ﴾ اِن فی ذلک لَذِکْرٌ لِّمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۷۰﴾ ”اور کئی جاہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ ان کی قوت زبردست تھی ان سے پھر گئے کرید نے شیروں میں۔ کہیں ہے بھگ جانے کو ٹوکنا۔ اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہو یا نگائے کان دل لگا کر۔“

اسی لئے کفار بھی قیامت کے دن اپنی انہی دو قوتوں سے دنیا میں کام نہ لینے پر حسرت کریں گے۔ ارشاد رہتا ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحَابِ السُّعُوْرِ﴾ ⑤ ”اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنے یا سمجھتے تو نہ ہوتے، روزِ خِ والوں میں سے۔“

① يار: ٤٠، سورة الحج، الآية: ٣٦.

② پارہ: ۹۱، سورۃ الفرقان، الآیہ: ۴۴.

(٣) ما، ٤: ٢٧؛ ميخو وطق، الإتيه؛ ٢٧: ٢٤.

② ٢٩:٥، سورة النمل، الآية: ٥

کان کا دائرہ اور اک بھی قلب کے مقابلہ پر محدود ہے..... لیکن نور کیا جائے تو کان باوجود اس وسعت علم کے جو ابھی ذکر کی گئی۔ پھر بھی بہت سی قیود اور حدود کا پابند اور محتاج ہے اور کم سے کم یہ قید تو اس پر بہر حال عائد ہے ہی کہ وہ جسمانیات سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور جسمانی دائرہ میں بھی آواز ہی کی حد تک اس کا دائرہ علم کام کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس شرط سے کہ وہ زیادہ دور کی آواز نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بیرونی آلات اس کی مدد کر کے اسے بہت دور کی آوازیں سنوادیں۔ مگر یہ اس کی قوت کا کرشمہ نہ ہو گا بلکہ آلات کی قوت و طاقت کا مظاہرہ ہو گا۔ کان کی تو بہر حال در ماندگی اور محتاجی ہی ثابت ہو گی۔ مذکورہ شرطوں کے علاوہ آلات کی اس پوری مدد کے باوجود پھر بھی کان مادی ہی آوازیں سن سکتا ہے۔ روحانی یا نیبی آوازیں سن لینا پھر بھی اس کے بس کی بات نہیں اور پھر مادی آوازیں سن کر وہ سن لینے ہی کا کام کر سکتا ہے۔ آواز والے کو تیز کے ساتھ پہچان لینا کان کی استعداد نہیں۔ یعنی شنوائی کے سوا اس میں کوئی شعور یا فہم اور تیز نہیں۔ اس لئے کان کا ادراک بھی ان تینوں اہم اعضاء میں کوئی نام ادراک نہ نکلا کرتھا اسے کوئی اونچا علم کہہ دیا جائے۔

[۱۱] احساس بھی قلب ہی کی خصوصیت ہے..... بہر حال انسانی علوم میں ابتدائی علم ہی حواس خمسہ کا علم ہے جن کے ذریعہ سے قابل احساس جزئیات کا ادراک کیا جاتا ہے اور کم از کم ان کے علو پر صورت دیکھ، رنگ، بو، یا عوارض وغیرہ کی جزئیات کا پتہ چل جاتا ہے۔ جو عالم میں مختلف انواع میں بنی ہوئی چار طرف بھی پڑی ہیں۔ اس لئے گویا یہ پانچوں علم بلحاظ باطن قابل ذکر نہ سکی کہ حواس خمسہ اور اک باطن اور حقیقت نرائی کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔ لیکن بلحاظ ظاہر درجہ بدرجہ ایک گونا گیت رکھتے ہیں جن کا فرق مراتب کے ساتھ ذکر قرآن حکیم کی روشنی میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔

غور کیا جائے تو گویا ہر نظر میں ان محسوسات کا ادراک اعضاء حواس کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ احساسات قلب کے ہیں آنکھ، ناک، کان کے نہیں بظاہر آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن حقیقت میں آنکھ نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہی حال سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کا بھی ہے کہ بظاہر یہ احساس کان، ناک، زبان اور ہاتھ پاؤں کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سارے ادراکات قلب کے ہیں، ان اعضاء کے نہیں پس انسانی کائنات میں حقیقی مدبر اک اور اصلی عالم قلب ہی ٹھہر جاتا ہے۔

اور یہ تمام مختلف اعضاء اور اک اپنے اپنے ادراکات میں اس کے خدام ہیں۔ اس نے اپنے ظاہری علم کی حد تک یہ ہرکارے، اور جاسوس عالم حیات میں اس لئے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ مختلف قسم کے محسوسات اور معلومات لالا کر اس کے سامنے رکھتے رہیں اور وہ اس علم کی روشنی میں کائنات بدن کی تدبیر کرتا رہے۔ اس لئے ان محسوسات کا کوئی شعور خود ان اعضاء حواس کو نہیں ہوتا، آنکھ کچھ سوچ سمجھ کر نہیں دیکھتی کان کچھ غور و فکر کر کے نہیں سنتے اس کی نہ ان میں صلاحیت ہے نہ وہ اس کام کے لئے بنائے گئے ہیں۔ وہ محض دیکھ اور سن لیتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ اس

احساس کے مہادی و اغراض کو سمجھنا صرف اسی صنوبری مہفہ گوشت کا کام ہے۔ جس کا نام دل ہے۔ پس احساس کی پالیسی دل بتاتا ہے اور اس باشعور پالیسی کے تحت مزدوروں کی طرح احساس کا ظاہری فعل یہ اعضاء حواس انجام دیتے ہیں۔ پس احساس ظاہر نظر میں ان کا ہے اور شعور احساس دل کا ہے۔

حقیقتاً اعضاء کا احساس بھی قلب ہی کا فیض ہے۔۔۔۔۔ مزید غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ احساس بھی در حقیقت یہ اعضاء نہیں کرتے۔ بلکہ وہ بھی تنہا قلب ہی کرتا ہے جب کہ ان اعضاء کا یہ ظاہری احساس صرف اسی کی توجہ پر موقوف ہے۔ بغیر اس کی توجہ کے یہ سب اعضاء احساس بھی محض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بازار کے ہنگامے، شور و شغب، ہاجے گا جوئی کی نوع، بخور آوازیں کان ہی میں نہیں آتیں۔ اگر دل کا دھیان ادھر نہ ہوں، خوش منظر چیزیں، بلند گویوں کے دیدہ زیب رنگ و روغن اور ان کی فلک پیاہندی و رفعت کچھ بھی نگاہوں میں نہیں ساتی۔ اگر دل کا دھیان دوسری طرف ہو۔ بدن پر چومیں آجائیں اور زخم لگ جائیں اور لکس و مس کی ساری ضربیں بدن پر پڑتی رہیں۔ لیکن اگر قلب کی توجہ ادھر نہ ہو تو ذرا براہ رمان مصائب کا اثر آدمی کو محسوس نہیں ہو سکتا۔ ہزار خوشبوئیں ہوا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ لیکن قلب اگر اپنے کسی اور غم میں منہمک ہو تو وہ ناک میں پہنچ کر بھی محسوس نہ ہوں گی۔ چہ جائیکہ کسی فرحت کا اثر پیدا کریں۔

بے تحاشہ لذت کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں۔ لیکن قلب کسی اور فکر میں مستغرق ہو تو کسی ایک چیز کا ذائقہ بھی زبان پر نہ آئے گا۔ خواہ آدمی کا پیٹ ناک تک بھی بھر جائے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ سننا، دیکھنا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا، کان، آنکھ، ہاتھ، ناک اور زبان کا کام نہیں بلکہ دل کا کام ہے۔

اگر یہ احساسات بذات خود ان اعضاء کے ہوتے تو آنکھ، ناک، کان میں آئے ہوئے محسوسات کے یہ نقشے بھی انہیں کے گوشت پوست میں سمائے ہوئے ہوتے، لیکن بجائے اس کے کہ اعضاء ان محسوسات کو اپنے اندر محفوظ رکھیں۔ یہ کام بھی قلب ہی کا ہے کہ وہی ان کی حفاظت کا خزانہ بھی ہے۔ اس لئے اگر آنکھ، ناک، کان بند بھی ہو جائیں۔ تب بھی ان محسوسات کے سارے نقشے، آوازیں اور ذائقے وغیرہ قلب ہی میں ہمہ وقت حاضر ملیں گے۔ نہ کہ ان اعضاء میں دل جب چاہے اور تصور میں لائے جب ہی فوراً بلا آنکھ، ناک، کان کے واسطے کہ ان سب کو عیاں دیکھ اور سن سکتا ہے آنکھ، ناک، کان ہر گز ان محسوسات کو دیکھ، سن نہ سکیں گے کہ ان محسوسات کے نقشے ان میں محفوظ ہی نہیں۔

آدمی کہا کرتا ہے کہ میں نے فلاں وقت ایسا کھانا کھایا تھا کہ آج تک اس کا ذائقہ میرے منہ میں ہے۔ حالانکہ یہ مزہ اس کے منہ یا زبان میں نہیں ہے ورنہ ہر نئی کھائی ہوئی چیز کا ذائقہ اس پہلے ذائقہ سے غلط ملط ہو کر کبھی بھی خالص نہ رہتا اور کھانوں کے خالص مزے اس اختلاط سے ختم ہو جاتے، بلکہ یہ سارے مزے دل کے ظرف میں محفوظ رہتے ہیں اور دل جب بھی چاہتا ہے ان گزشتہ ذائقوں کو اپنے تصور میں لے آتا ہے اور ان کے اور اک سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو اس کی واضح دلیل ہے کہ ان اعضاء کے یہ احساسات خود اپنے نہیں بلکہ صرف

دل کے ہیں۔ اس لئے محفوظ بھی دل ہی میں ہیں ان میں نہیں بتا بریں تن انسانی میں حقیقی مد رک اور عالم صرف قلب ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ اعضاء صرف آلات ہی آلات باقی رہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص آنکھ پر چشمہ لگا کر دیکھے تو کیا یہ بینائی کی عملی قوت چشمہ میں مانی جائے گی یا آنکھ میں اور یہ دیکھنا آنکھ کا کام ہو گا یا چشمہ کا؟ سب جانتے ہیں کہ یہ بینش (دیکھنا) کا عمل آنکھ کا کام ہو گا نہ کہ چشمہ کا کہ اس میں یہ قوت بینائی سرے سے ہے ہی نہیں ورنہ آنکھ سے اتار کر بھی چشمہ اشیاء کو دیکھ سکتا۔ مثلاً کسی شخص نے کان پر آنر لگا کر سنا تو کیا یہ شنوائی کا عمل اس آلہ کا ہو گا؟ ہرگز نہیں بلکہ کان کا ہو گا۔ ورنہ کان سے الگ رہ کر بھی اس آلہ سے سن سکتے اور ادھر یہ صورت ہے کہ اگر آنکھ سے چشمہ اتار دیا جائے تو وہ بلا اس کے بھی دیکھ سکے گی۔ بشرطیکہ بیمار نہ ہو اور کان سے آلہ جدا کر دیا جائے۔ تب بھی کان سے سنے گا اگر جلائے مرض نہ ہو۔ کیونکہ قوت بینائی و شنوائی آنکھ اور کان میں ہے، آلہ میں نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ آنکھ دل کا ایک چشمہ ہے اور کان دل کا ایک آرماع ہے۔ اس لئے حقیقتاً قوت بینائی و شنوائی آنکھ کان میں نہیں بلکہ قلب میں ہے۔ اس نے آنکھ تو قلب سے جدا ہو کر نہیں دیکھ سکتی۔ مگر دل آنکھ سے جدا ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ آلہ اصل کا محتاج ہوتا ہے اصل آلات کی محتاج نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ وہ اصل پر رہے اور بیمار اور ضعیف نہ ہو جائے۔ بہر حال جب کہ یہ چشم و گوش آلات دل ہیں اور دل اصل ہے تو قوت بینائی اور قوت شنوائی اسی کی ہوگی نہ کہ آنکھ کان کی۔

قلب جیسے بحالت نوم مد رک ہے ایسے ہی بعد الموت بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی خیمہ میں جو موت کی چھوٹی بہن ہے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے۔ جو بیداری میں آنکھ کان سے دیکھتا سنتا ہے حالانکہ اس وقت آنکھ کان مٹے ہوئے اور معطل ہوتے ہیں جس سے صاف نمایاں ہے کہ بیداری قوت دل میں ہے آنکھ میں نہیں ہے۔

اس لئے اگر ہم آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیں۔ بلکہ عقیدہ رکھیں کہ حقیقی موت کے بعد جب کہ آنکھ، ناک، کان کے اعضاء سرے سے باقی نہ رہیں گے پھر بھی آدمی اپنے اس لطیفہ قلب سے وہ سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ جو آنکھ کان سے دیکھتا سنتا تھا اور عالم برزخ کے وہ تمام عجائبات اس کی قوت بینائی اور قوت شنوائی پر منکشف ہوتے رہیں گے جن کو صاحب شریعت نے کھول کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ تو اس میں بھی کسی انکار و استعجاب کا موقع نہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ زندہ ایک ماضی اور ہنگامی موت ہے جس میں روح حیات بدن سے کلیتہً جدا نہیں ہوتی۔ صرف اعضاء حواس معطل ہو جاتے ہیں مگر قلب بیدار رہتا ہے، ورنہ خواب کے عجائبات کیسے منکشف ہوتے اور موت اصلی موت ہے جس میں روح بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور اعضاء بدن سرے سے ہی باقی نہیں رہتے۔ مگر قلب پھر بھی بیدار رہتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہتا ہے۔ جو عالم برزخ میں سامنے آئے گا۔

پس جیسے وہ خواب میں بلا آنکھ کان کے سب کچھ دیکھتا اور سنتا تھا۔ ایسے ہی برزخ میں بھی بلا اس ظاہری آنکھ، کان کے سب کچھ دیکھتا سنتا رہے گا۔ اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ اعضاء حواس درحقیقت خود بخود احساس نہیں اور

نہی یہ خود احساس کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ساری کارگزاریاں درحقیقت صرف قلب ہی کی ہیں۔ جو نیند اور موت میں بااعضاء ظاہری کے یکساں احساس رہتا ہے۔ بہر حال واضح ہو گیا کہ احساس بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعضائے حواس کا نہیں وہ اپنا احساس نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف دل کے احساس کو ظاہریوں کے سامنے نمایاں کر دیتے ہیں۔

محسوسات سے تاثر پذیر بھی قلب ہی ہوتا ہے اعضائے احساس نہیں۔ اس سے بھی آئے کی ایک بات یہ بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان محسوسات سے کسی اچھی بری کیفیت کا اثر لینا اور ان کیفیات سے لحاظ خطہ کرب شعور کے ساتھ متاثر ہونا بھی ان اعضائے حواس کا کام نہیں کہ ان کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ تنہا دل ہی کا کام ہے۔ اگر کوئی درد ناک بات کان میں پڑ جائے تو درد آشنادل ہو گا نہ کہ کان اور اگر کوئی خوش منظر چیز آنکھوں میں آجائے تو متفرح قلب ہو گا نہ کہ آنکھ جس سے واضح ہے کہ یہ اعضاء صرف ان محسوسات کے رطب و یابس کو مرنے کے ذمہ دار ہیں اور وہ بھی قلب ہی کی توجہ اور تعریف سے اس کی خاصیات و آثار کو سمجھنے اور ان سے اثر پہنچنے کے ذمہ دار نہیں۔ اس لئے قلب نہ صرف ان محسوسات کا تنہا مددگار ہی ہے۔ بلکہ ان کے طبعی آثار و خواص اور کیفیات سے ہر کیف بھی وہی تنہا ہوتا ہے یہ اعضاء اس بارے میں کسی درجہ میں بھی اس کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لئے ان کی حیثیت آلات و وسائل احساس سے زیادہ کچھ نہیں جس سے کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ قلب دیکھنے سننے میں بھی ان اعضاء حواس کا محتاج نہیں اور کیفیات احوال کا اثر لینے میں بھی حواس کا دست نگر نہیں۔ جو اس کے حقیقی، لم و مددگار اور حقیقی باکیف اور صاحب حال ہونے کی واضح دلیل ہے۔

قلب اپنی قوت تصور یہ کے ذریعہ ایک حد تک موجد محسوسات بھی ہے۔۔۔۔۔ پھر یہی نہیں کہ وہ محسوسات میں صرف انہی چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے جو پہلے سے موجود ہوں۔ جیسا کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ صرف انہی چیزوں کو محسوس کر سکتی ہیں جو خارج میں موجود ہوں۔ خواہ وہ صورتیں شکلیں ہوں یا آوازیں اور خوشبوئیں وغیرہ۔ لیکن قلب اپنے احساسات میں اس کا بھی محتاج نہیں کہ صرف انہی اشیاء کا ادراک کر لے کرے جو پہلے سے موجود ہوں بلکہ وہ اپنے تصور کی طاقت سے غیر موجود اشیاء کو ذہن میں خود وجود دے کر بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے۔ پس وہ محسوسات کا مددگار ہی نہیں بلکہ ایک حد تک موجد بھی ہے کہ جب چاہے خود ہی عالم تصور میں شہر کے شہر اور باغ کے باغ بنائے اور پھر اپنے ہی اندر ان کی سیر بھی کرتا رہے، لطف بھی اٹھاتا رہے اور آنکھ، ناک، کان کو خبر بھی نہ ہو۔

ستر است اگر ہوسست کشد کہ بمر سر و من در آ تو ز غنچہ کم نہ میدہ در دل کشاید چمن در آ
اعضائے احساس کے بالمقابل قلب کی جلالت قدر۔۔۔۔۔ پس قلب نہ صرف یہ کہ احساس میں ان اعضائے حواس کا محتاج نہیں بلکہ محسوسات کے کسی سابق وجود خارجی کا بھی محتاج نہیں۔ جس سے قلب کی علمی عظمت و جلالت اور ان اعضاء حواس کی بے ماتحتی کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ادراک و

احساس بھی قسب ہی کا کام ہے اور محسوسات کی ایجاد و اختراع بھی اس کا حوصلہ ہے۔
 فرق اتنا ہے کہ کہیں وہ ان اعضاء ظاہری کی وساطت سے اور اک کرتا ہے اور کہیں ان کے توسط کے بغیر اور
 کبھی وہ خارجی موجودات کو محسوس کرتا ہے، اور کبھی اپنے اندر تصوری موجودات بنا کر انہیں محسوس کرنے لگتا ہے۔
 پہلی صورت میں اس کا علم تابع معلوم ہوتا ہے اور دوسری صورت میں معلوم تابع علم نیز پہلی صورت میں علم انطباعی
 ہوتا ہے کہ باہر کی صورتیں شکلیں اس میں اگر چھپ جاتی ہیں اور وہ انہیں دیکھتا رہتا ہے، اور دوسری صورت میں علم
 ایجاد کی ہوتا ہے کہ صورتیں بھی اندر ہی بنتی ہیں اور محسوس بھی اندر ہی ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ آفاقی محسوسات ہوں یا انفسی، امام علم بہر حال قلب ہی رہتا ہے اور اسی کے احساس کے صحت
 و سقم پر اس کا ثبات بدن کا سارا صحت و سقم موقوف ہے۔ اندریں صورت اگر احساس میں غلطی ہوئی تو اس میں ان
 اعضاء حواس کا براہ راست قصور نہ ہوگا کہ یہ محض آلات کار تھے۔ بلکہ جرم و قصور فی الاصل دل ہی کا ثابت ہوگا کہ
 اس احساس و ادراک میں وہی اصل تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان احساسات اور حواس کے علم میں قلب ہی کو
 اصل قرار دیتے ہوئے ان لوگوں کو جو حق بنی سے آنکھ پھیر لیں یا حق نبی کی سمجھ کو غیر کام پر لگا کر کبھی بھی نصیحت
 و عبرت قبول نہ کریں۔ آنکھ اور عقل کا اندھا نہیں بتلایا بلکہ دل کا اندھا کہا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ: ﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا
 فِي الْأَرْضِ فَتَنْظُرُوا لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ
 تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ ① ”کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں۔ (کسا نگہوں سے دیکھ کر)
 ان کے دل (حق کو) سمجھتے یا کانوں سے (کوئی جی بات) سن لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں
 بلکہ سینوں میں دل ہی اندھے ہیں۔“

بہر حال قرآن حکیم کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اعضاء احساس اپنے اپنے احساس و ادراک میں
 اصل نہیں۔ بلکہ دل اصل ہے اور نہ ہی ان کا یہ تھا علم کوئی مستقل اور معتد بہ علم ہے اور اگر آنکھ، کان اور دماغ کا علم
 کچھ معتد بہ اور کسی حد تک بنیادی اور نتائج و آثار کا حامل بھی ہے۔ تو ان میں بھی باہم فرق قوت و ضعف کے ساتھ
 انجام کار علم صرف قلب ہی کا رہ جاتا ہے۔ جس پر کائنات انسانی کے مصالح و ملاح اور عدل کا وار و مدار ہے۔
 لہذا اے ارشاد سید الاولین والآخرین صلوٰۃ اللہ علیہ و علیٰ الائمہ جمع اخوانہ من المرسلین۔ ”وَفِي الْجَسَدِ مُضْفَةٌ
 إِذَا صَلَحَتْ صَلَاحُ الْجَسَدِ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقُلُوبُ“ ② ”بدن انسانی
 میں گوشت کا ایک ٹوٹھڑا ہے جب وہ صحیح ہوتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور جب وہ فاسد ہوتا ہے تو سارا بدن
 فاسد ہو جاتا ہے آگاہ رہو کہ وہ قسب ہے۔“

حیاتی علوم کی طرح دماغی علوم بھی حقیقتاً قلب ہی کا فیضان ہیں..... انسانی علوم کا ان پانچ ہی حواس

① پارہ ۱: سورۃ الحج، الآیۃ: ۱، ۲۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب الفضل من استبراء للبدن، ج: ۱، ص: ۹۰۔

میں انحصار نہیں۔ بلکہ ایک اہم اور دور رس قسم کا علم اور بھی ہے۔ جو بلحاظ باطن بھی ایک حد تک علم کہلانے جانے کا مستحق ہے اور جب بھی ان پانچوں حیاتی علوم سے اونچا ہے۔ یہ علم توانے دماغ سے سرزد ہوتا ہے جہاں آکٹھ، ناک، کان بے کار رہ جاتے ہیں۔ صرف دماغ اور اس کی ابتدائی قوت ہی کام کرتی ہے۔

غیر یہ علم حواس کے جزئیاتی علم سے زیادہ وسیع اور گہرا بھی ہے۔ جو اشیاء کی صورتوں، شکلوں سے گزر کر ان کی فہم اور اصولی بنیادوں تک کا بھی پتہ چلا لیتا ہے اور ایک ایسی امتیازی شان سے بونے ہے۔ جو اعضاء احساس میں سے کسی کو میسر نہیں کیونکہ یہ اعضاء نے حواس محسوسات کی صورتوں، آوازوں وغیرہ کا ادراک تو ضرور کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی شعور کے ساتھ نہیں کرتے۔ لیکن دماغ اپنے خاص توانے ادراک کی وجہ سے اپنے اندر اس میں با شعور بھی ہے کہ یہ محسوسات کیا ہیں؟ اور ان کے اندرون میں کیا کیا فکلی و حیثی کچھ ہوئی ہیں۔ جس سے اس محسوس کو وجود مل رہا ہے۔ پس اس کا ادراک محسوسات کی صورتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے غہوم و مراد اور معنوی خصوصیات تک کو بھی جوں کا توں قبول کر کے اپنے اندر اتار لیتا ہے۔ جس سے ذہن میں شے محسوس کی صورت و سیرت اور ہیئت و معنویت دونوں ہی کا نقشہ پورے کا پورا تر آتا ہے۔ جو شعور کا ابتدائی مقام ہے اور دماغ کو حاصل ہے۔ قرآن حکیم نے اس شعور کو جو ہر کوئی سے تعبیر فرما رہا ہے۔ جس کے معنی یہاں فہم معنویت کے ہیں۔

تفقد بھی در حقیقت قلب ہی کا وصف ہے..... غور کیا ہے تو حواس خمسہ کے ہم کی طرح یہ فہم و بصیرت کا علم بھی در حقیقت قلب ہی سے نکلتا ہے۔ جو قلب کے سامنے بواسطہ دماغ ٹھہر ہوتا ہے چنانچہ کفار کے سمع والبصر وغیرہ کو جو کان، آنکھ سے ہوتا ہے۔ قرآن نے بے شمار ثلثات ہوئے ان کے قلوب سے نقد و فہم کی نفی فرمائی ہے نہ کہ دماغ سے کہ جب ان میں دل کی سمجھ ہی نہیں اور وہ صرف ظاہری ہیئت یا سطحی معنویت ہی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اندر کی بات ان کے دلوں میں نہیں اترتی تو ان کا پتہ کچھ نہ سننا سب بیکار اور عبث ہے چنانچہ فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا﴾ ① ”ان کے دل ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔“ یہاں منکروں کے دیکھنے سننے کی نفی سے جو اس آیت کے شروع میں کی گئی ہے۔ در حقیقت اس کے فہم و نقد کی نفی مقصود ہے۔ جس سے واضح ہے کہ قلب کی اصلی صفت محض دیکھنا سننا نہیں، بلکہ سمجھنا ہے جس کا شرعی لقب نقد ہے۔ جو قلب کا ایک طبعی جوہر ہے اور عام اعضاء کے طبعی و ظائف کی طرح اس میں ودیعت کیا گیا ہے۔

قلب کا وصف امتیازی تعقل ہے..... لیکن اس طبعی احساس و شعور سے اوپر قلب کی ایک خاص شان اور بھی ہے۔ جس میں اور کوئی عضو اس کا کسی درجہ میں بھی سیم و شریک نہیں اور وہ یہ کہ قلب نہ صرف محسوسات کی صورت معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کے تجزیہ بھی کرتا ہے اور بات سے بات پیدا کر کے اس ایک علم سے متعدد مہموں کے دروازے بھی اپنے اوپر کھول لیتا ہے یعنی وہ اس

ایک محسوس جزئی کی معنویت سے آگے بڑھ کر اس میں سے اس کی غنت نکال کر ایک کلیہ بھی بنا لیتا ہے، جس سے ہزاروں جزئیات کا فیصلہ اسی ایک محسوس جزئی سے کر دیتا ہے۔ جو شعور و فہم سے آگے کا مقام ہے۔ قرآن حکیم نے قلب کی اس خاص صفت کا تاہم تعقل یا عقل ارشاد فرمایا ہے۔ جس کے معنی طبعی عقل کے نہیں بلکہ تحقیقی عقل کے ہیں۔ جو اشیاء کی حقیقت تک جا پہنچتی ہے اور شے کی جزئی صورت سے اس کی معنویت سے کلی نوعیت کا پتہ چلا لیتی ہے۔ جو بلاشبہ قلب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن نے اسے بھی قلب ہی کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: ﴿اَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونْ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا﴾ ① ”کیا سیر نہیں کی، جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے۔“

جس کا حاصل یہ ہے کہ ان منکروں نے زمین کی سیاحت بھی کی ہوگی اور اس کے عجائبات بھی دیکھے ہوں گے جن کی صورتیں اور معنویتیں ان کے دلوں میں اتاری ہوں گی جس سے وہ بات کو کچھ گئے ہوں گے۔ لیکن سمجھ کر جب انہوں نے عقل سے کام نہ لیا، نہ ان عجائبات کے فشا اور انجام کو سوچا نہ کوئی ہجرت و مواعظ اس سے حاصل کی، اور نہ ہی اپنے مالک حقیقی کو پہچان کر اس کی طاعت و ذکر کا کوئی جذبہ ان میں ابھرا تو یہ سمجھنا بوجہنا سب بے کار اور ادا کرت ہے۔

اور اک قلب کی دونو عینتیں..... اس سے واضح ہوا کہ قرآن حکیم نے قلب کے ادراک کی دونو عینتیں بیان فرمائیں۔ ایک قوت فہم جو ایک انفعالی قوت ہے کہ بات کو اس کی صورت و معنویت سمیت جوں کا توں طرف قلب میں اتار لیتی ہے اور ایک قوت عقل و کیاست کہ ان کچھ ہوئی حقیقتوں میں فاعلانہ تصرف کر کے انہیں آگے بڑھا دیتی ہے۔ مجمل کو مفصل، مشکل کو مفسر اور غفی کو ظاہر کر کے سن بھر علم کو ہزار سن کر دکھاتی ہے اور پھر اس میں سے جامع علت نکال کر اس کی جزئیت کو اس جامع علت سے کلیہ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس سے علم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ پس قلب کی سب سے بڑی اور امتیازی قوت۔ یہی قوت عاقلہ یا صفت عقل ہے۔ جو اپنی ابتدائی بنیاد اور وضع خلقت کے لحاظ سے خود دماغ سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے عمل میں آخری حکم اور منشاء کے لحاظ سے بالآخر قلب سے متعلق ہے۔ کیونکہ قلب ہی انجام کار تمام اعضائے بدن پر جن میں دماغ بھی شامل ہے یکہ وجہا حکمران ہے اور اسی کے اشاروں پر دماغ سمیت اعضاء کی یہ کائنات چل رہی ہے۔

قدیم وجدید اور باسیہ و ماغ کا متعجبانے فکر..... عام طور پر اور باب و ماغ یا فلاسفہ زیادہ تر عقل ہی کے بندے بنے رہے ہیں اور ان کی آخری پرواز عقل ہی کی عقیدت پر آ کر رک گئی ہے۔ چنانچہ فلاسفہ قدیم نے تو اسے خدا کی کا درجہ اور تخلیق عالم تک میں اسے حصہ دار بنا دیا۔ افلاک کی تخلیق ان کے زعم میں عقلوں میں آئی جن میں سب سے بڑی تخلیق کنندہ عقل فعال ہے جسے عقل اول بھی کہا جاتا ہے۔ فلاسفہ حال جن پر سائنس کا روغن بھی چڑھا ہوا ہے اسے کھلے فطرتوں میں خدا تو نہیں مانتے اور اس لئے نہیں مانتے کہ ان میں سے اکثر شرے سے خدا ہی کو نہیں

① يار: ١٤٠، سورة الحج، الآية: ٦٧.

مانتے۔ لیکن وہ اسے مدبر کائنات پھر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عالم کے تغیرات کا تعلق زیادہ تر عقلوں ہی سے ہے۔ حتیٰ کہ وہ کوجنات سے گزر کر موتی الہی تک کے اوپر عقل کو حکمران بنا دینے کے منصوبے پاندھے ہوئے بیٹھے ہیں، اور شرعی امور میں بھی اپنی انہما جزوی اور ناقص عقلوں کو حکم کا درجہ دینے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہماری عقلوں کے حلق میں اتر جائے وہی قابل تسلیم ہے ورنہ نہیں۔

عقل کے بارے میں اہل دل کا نقطہ نظر..... لیکن جہاں تک ارباب قلوب کا تعلق ہے وہ ان خرافات سے الگ رہتے ہوئے اس سے بہر حال انکار نہیں کرتے کہ عقل ایک شریف ترین آلہ شعور و ادراک ضرور ہے۔ جس سے بڑی بڑی پیچیدہ علمی مہتمیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اور وہ ایسے نازک نظری مقام پر کام کرتی ہے جہاں تک حواس کی رسائی نہیں۔ اس لئے دین و دنیا میں اس کا استعمال ضروری ہے۔ بشرطیکہ اسے اسی کی حدود میں رکھا جائے۔ شریعت نے بھی عقل کی فضیلت اور برتری کو ترقی و دنیا و آخرت کے لئے تسلیم کیا ہے۔ جس سے کتاب و سنت کی نصوص اور حکمائے اسلام نے حکیمانہ مقالات بھرے ہوئے ہیں۔

عقل کے حقیقی مرتبہ و مقام کی تعیین..... لیکن جہاں تک اس کی کارگزاری کی نوعیت کا تعلق ہے۔ اس کے لحاظ سے وہ کسی مستقل جہت کا درجہ نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ادراک و شعور میں بھی مستقل نہیں ہے جب تک کہ علم اس کی مدد نہ کرے۔ بغیر علم کے وہ اپنے ادراک و شعور کا بھی وظیفہ ادا نہیں کر سکتی۔ اس لئے نہ وہ مستقل بہادراک ہے نہ مستقل بالجہت حتیٰ کہ ایک حد تک حواس خمسہ کے احساسات سے بھی اس کے ادراک و شعور کی نوعیت و نوعی درجہ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ حواس خمسہ تو اپنے ادراک میں اشیاء کے موجود ہونے ہی کی محتاج تھے۔ جہاں کوئی شے موجود ہوئی اور اس کے مناسب حال کسی حواس کی گرفت میں آگئی۔ تو وہ فوراً ہی محسوس ہو جاتی تھی۔ لہذا وہ کی بن آئی تو اس کی صورت محسوس ہوگئی، کالوں کی بن آئی تو اس کی آوازیں محسوس ہو گئیں اور تاک کی چلی گئی تو اس کی خوشبو، بدبو کا احساس ہو گیا۔

بہر حال حواس کو ادراک کرنے میں صرف اشیاء کے وجود اور موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ معدوم اشیاء میں ان کا احساس کام نہیں کر سکتا۔ لیکن عقل کے ادراک کے لئے کسی چیز کا محض موجود ہو جانا کافی نہیں۔ جب تک کہ حواس وغیرہ کے ذریعہ اس موجود کا علم بھی ذہن میں نہ آجائے۔ کیونکہ عقل معلومات اور محسوسات ہی میں اپنے تصرفات دکھلا سکتی ہے۔ مجہولات میں نہیں حتیٰ کہ اگر وہ کسی مجہول چیز کو بھی حاصل کرنا چاہے تو معلومات ہی سے حاصل کر سکتی ہے نہ کہ مجہولات سے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا کام فکر و نظر ہے۔ جو ایک ذہنی کام ہے اور ذہن کے اندر ہی کیا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن کے چھوٹے سے ظرف میں کائنات کے بھاری بھاری اجسام اپنے مادی طول و عرض کے ساتھ نہیں سہا سکتے۔ بلکہ ان اجسام کی صرف علمی صورتیں ہی ذہن میں آ سکتی ہیں۔ جو مادی طول و عرض سے خالی ہوں۔ تب

ہی فکری حرکت ان میں کام کر سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ ذہن میں ان آئی ہوئی ذہنی صورتوں ہی کا نام علم ہے۔ جو حواس کے ذریعہ آ کر ذہن میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اشیاء کی ان صورتوں کو ذہن میں لے آئے ہی کا نام احساس و ادراک ہے۔ عقل ان ہی محسوسات یا معلومات کے علمی نقشوں میں ترتیب نظر و فکر اور تصرفات کر کے ان سے بطور نتائج کچھ جدید معلومات پیدا کر لیتی ہے۔ خواہ اس طرح کہ ان جزوی صورتوں کے استقراء و تتبع سے کوئی کلیہ بنا لے اور اس سے جدید جزئیات پیدا کر لے، یا کسی جامع علت کی بناء پر ایک جزئی پر دوسری جزئی کو قیاس کر کے ایک کا حکم دوسری جزئیات تک پہنچا دے، اور اس طرح کئی اور جزئیات پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کر دیں یا اس جزئی میں سے علمی نکات و لطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کا اضافہ کر دے۔ مگر عقل کے یہ سب علمی اور فکری کام ذہن ہی میں ہوتے ہیں جس میں اجسام خود نہیں اتر سکتے۔ بلکہ ان کی علمی صورتیں اترتی ہیں اور انہی میں حرکت فکری اندرون ذہن کام کرتی ہے جس سے نئی معلومات پیدا ہوتی ہیں۔

عقل نہ مستقل بالادراک ہے اور نہ مستقل بالذات۔ جس سے واضح ہے کہ عقل موجودات اجسام میں اس وقت تک کام نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ علمی صورتیں اختیار کر کے ذہن کے خزانے میں نہ پہنچ جائے اور ان صورتوں کا علمی انداز سے ذہن میں پہنچانا حواس خمسہ کا کام ہے۔ اس لئے عقل اپنے ادراک و عمل میں حواس خمسہ کی محتاج نکلی، بخلاف حواس خمسہ کے کہ وہ اپنے ادراک میں عقل کے محتاج نہیں، جانور بھی صورتوں، شکلوں اور آوازوں وغیرہ کا ادراک کر لیتے ہیں حالانکہ ان میں عقل نہیں۔

نیز انسان بھی جب صورتوں، آوازوں وغیرہ کا آکھ، کان سے ادراک و احساس کرتا ہے تو کسی عقلی استدلال یا ترتیب مقدمات سے نہیں کرتا۔ بلکہ بلا شعور بھی اگر آنکھ کسی صورت پر پڑ جاتی ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے اسے فوراً ہی محسوس کر لیتی ہے اسے کسی عقلی دلیل کی اس احساس میں حاجت نہیں پڑتی۔

پس عقل کا علم کتنا بھی بڑا اور شریف ہو۔ مگر موقوف ہے حواس اور ان کے محسوسات پر اور حواس کی علم کتنا بھی عقلی علم سے کم مرتبہ ہو۔ مگر وہ عقل اور عقلی استدلال پر موقوف نہیں اور نہ اس کا محتاج اس لئے عقل ہی اپنے کام میں حواس کا محتاج نکلتی ہے۔ حواس اپنے کام میں عقل کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عقل اپنے کام میں علم کی محتاج ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عقل مستقل بالادراک نہیں کہ بلا علم کے خود سے اپنا کام کر جائے۔ بلکہ اس میں دھننا جیسا ثابت ہوئیں۔ ایک اشیاء کی خارج میں موجودگی کی کہ محدودات میں عقل بیکار رہے اور ایک ذہن میں ان کے معلوم ہونے کی کہ مجولات میں بھی وہ بے کار ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ خود تھا عقل جیسے بالادراک نہیں۔ ایسے ہی مستقل بالذات بھی نہیں۔ اس لئے حواس کا علم بہ نسبت عقل کے علم کے زیادہ آزاد اور بے قید ثابت ہوا، اور عقل کا علم بہ نسبت حواس کے علم کے عکس ثابت ہوا کہ حواس کے بغیر عقل کو اپنے کام کا میدان ہی نہیں ملتا۔

اس لئے اس سابقہ اصول کے تحت کہ جس کے علم و ادراک میں قیدیں اور شرطیں زیادہ ہوں گی۔ اس کے علم

کا دائرہ تک ہو گا۔ عقل کا علمی دائرہ کچھ زیادہ وسیع ثابت نہ ہوا۔ اس لئے عام تمدنی امور اور بالخصوص دینیات میں عقل کو امام مطلق ماننے والے کافی کمزور بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ جو قطعاً پائیدار نہیں۔

پھر اس عقل کی بدولت فلاسفہ کی جہاں تک رسائی بھی ہوئی۔ تو وہ صرف محسوسات ہی محسوسات ہیں جو حواس خمسہ ہی کے اندر اک پکڑا دیا ہے اور انتہائی طور پر محدود ہے۔ باقی بڑے بڑے جہاں سب آگے رہ جاتے ہیں جہاں عقل کے پر بھی نہیں جم سکتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

عقل خدائی صفت نہیں ہے..... دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ عقل کچھ ہو بہر حال وہ کوئی خدائی صفت نہیں بلکہ انسان کی اندرون ایک طبعی خلقت ہے۔ جو خدا نے برتری تخلیق سے اس میں ولادت کے وقت پیدا ہوئی ہے اور موت کی وقت موت کے نذر ہو جاتی ہے چنانچہ اس کی تخلوقیت کا دعویٰ شریعت میں صریح موجود ہے۔ ارشاد نبوی ہے ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْعَقْلَ“۔ ”پہلی چیز جو (انسان کی تخلیق قوتوں میں) اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے“۔

جس سے واضح ہے کہ عقل مخلوق اور جب مخلوق ہے تو محدود بھی ہے۔ کیونکہ مخلوق ہونا ہی حد بندی ہے کہ نیز یہ کہ وہ عارضی ہے۔ کیونکہ مخلوق کہتے ہیں اس کو ہی جس کا وجود اپنا نہ ہو، عارضی ہو اور ساتھ ہی یہ کہ وہ ضعیف بھی ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق اپنے خالق کے سامنے ضعیف اور ناتواں ہی ہے۔ اس لئے اس کا علم کس طرح ایسا قوی ہو سکتا ہے جیسا اسے فلاسفہ نے قوی کہا ہے۔ اس لئے اس کے کلیات سے ثابت شدہ بات ظنی ہوتی ہے نہ کہ قطعی جو موجب تعین ہو اور جب حیات میں اس کا یہ حال ہے تو اسے دینیات میں کیسے مدار کا رخصت لایا جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد یقین پر ہے۔

علم انسان کی نہیں بلکہ اللہ کی ذاتی صفت ہے..... اور علم کو دیکھا جائے تو وہ انسان کی صفت نہیں اور نہ ہی اس کی ذات میں موجود ہے۔ انسان میں اگر پیدائشی طوہر کچھ ہے تو وہ علم کی استعداد ہے علم نہیں۔ اسی لئے جب وہ دنیا میں آتا ہے تو علم سے کورا آتا ہے۔ جیسا قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بَطْنِ أُمِّهِمْ كُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا﴾ اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کسی چیز کا بھی علم نہیں رکھتے تھے۔

اور جب دنیا سے جاتا ہے تو علم سے پھر کورا ہو کر ہی چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْلَدَ عِلْمِ شَبَابِهِ﴾ (پھر (بوقت موت انسان) لوٹا دیا جاتا ہے ارذل عمر کی طرف کہ جاننے کے بعد انجام یہ ہو جاتا ہے (کہ کسی شے کا بھی اسے علم نہیں رہتا)۔

پس علم کا انسان کے اول و آخر نہ ہونا اور درمیان میں آمد و شد کے درمیان ہونا کہ آیا چلا گیا۔ اس کی واضح دلیل ہے کہ علم انسان کی کوئی ذاتی صفت نہیں۔ جس طرح کہ عقل ذاتی خلقت تھی بلکہ علم خدا کی ذاتی صفت ہے۔ جس کا پر تو عارضی اور وقتی طور پر انسان پر پڑ جاتا ہے اور وہ عالم کہلانے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے حق تعالیٰ ہی کو ذاتی طور پر عالم کہا ہے۔ جس کا علم ازل، ابداً ہی اور لم یزل ولا یزال ہے۔ ارشاد قرآنی ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ﴾ اور

وہ علم خیر ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ”اور وہی ہے سینوں (کی چھپی ہوئی کو) جاننے والا“۔ اور فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ﴾ ”اور وہی جانتا ہے (ان کے سامنے اور پیچھے کی باتیں اور لوگ اسے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے“۔ اور فرمایا: ﴿وَلَا يَخْلُقُ مَنْ يَخْلُقُ﴾ ”اور کیا وہ نہ جانے گا اسے جسے اس نے پیدا کیا۔ جب کہ لطیف و خیر وہی ہے، وغیرہ وغیرہ“۔

حُلوٰق (عقلِ انسانی) غیر مخلوق (علم الہی) پر حاکم نہیں ہو سکتی..... پس عقل کا حُلوٰق ہو کر انسان کی صفت ہونا اور علم کا غیر حُلوٰق ہو کر خدا کی صفت ہونا۔ اس کے سوا اور کسی چیز کا مقتضی ہے کہ انسان میں علم خدا ہی کی طرف سے آ سکتا ہے خود سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا قدرتی ثمرہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ جب خالق کی طرف سے کوئی علم آ جائے تو پھر عقل کے لئے جوں و چرا کی گنجائش نہ ہو۔ چہ جائیکہ اسے علم الہی کے سامنے ایک متوازی حاکم کی حیثیت سے لا کر کھڑا کر دیا جائے یا علم پر عقل کو حکمران تسلیم کر لیا جائے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خالق پر مخلوق حاکم ہو جائے یا غنی پر محتاج حکم چلائے اور طاقت پر ضعیف و ناتوان کا اقتدار قائم ہو جائے جو بدست خلاف عقل ہی نہیں حماقت و جہالت بھی ہے جسے کم سے کم یہ عارف امت تو نہیں برداشت کر سکتی۔ جو علم الہی پر ایمان لائی ہوئی ہے کوئی چائل یا بے قیادت مانے تو مانے۔ بنا بریں عقل کا کام اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ علم الہی اور کلام ربانی آ جانے کے بعد اسے سمجھ لے مان لے اور مان کر اسے اس کے دائرہ میں محدود رکھ کر اس میں غور و تدبر کر لے اور استنباط و اجتہاد کے ذریعہ اس کے چھپے ہوئے علمی غزائوں کو کواشف کر دے اور ساتھ حُلوٰق کو خالق حکمران بنانے والوں کا انجام بد دیکھ کر عبرت و موعظت حاصل کرے۔

عقل کا سرچشمہ قلب ہی ہے..... اور جب یہ عقل جس قرآنی قلب ہی کا ایک آلہ ادراک ہے۔ جیسے حواس خمسہ بھی اس کے آلات ادراک تھے۔ تو ظاہر ہے کہ حقائق میں یہ عقلی تدبر اور اجتہاد و استنباط بھی قلب سلیم ہی کا کام نکلتا ہے۔ جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ عقل کا سرچشمہ بھی آئینہ کا قلب ہی ہے۔ جیسا کہ حس کا سرچشمہ بھی قلب ہی تھا۔ جیسے حیاتی علوم قلب کے تھے۔ ایسے ہی عقلیاتی علوم بھی قلب ہی کے علوم ثابت ہوئے۔ گو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ حس اور عقل کی قوتیں دماغ میں ہیں، قلب میں نہیں جیسا کہ ظاہری طور پر ایسا ہی محسوس بھی ہوتا ہے بلکہ انسانوں کا ایک بہت بڑا گروہ یہی یقین رکھتا ہے کہ عقلی اور حواسی قوتوں کا مرکز دماغ ہے۔ لیکن یہ ان قرآنی دعوؤں کے منافی نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ حسی اور عقلی قوتیں دماغ میں ہوں اور دماغ کی باگ ڈور دل کے ہاتھوں میں ہو۔ جو قلب کے اشاروں پر چلتا ہو۔ اس لئے ان قوتوں کو دماغی مان کر بھی انہیں قلب کی حکومت کے نیچے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ ہم بدابنہ دیکھتے ہیں کہ عقلی قوتیں بھی جب ہی کچھ سوچ سکتی ہیں۔ جب دل ٹھکانے ہو اگر قلب میں تشویش اور اضطراب و بے چینی ہو یا وہ کسی دوسرے مشغلہ میں منہمک ہو تو عقل سوچنے پر بھی قادر نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ کچھ

نتائج برآمد کر سکے۔ اس سے واضح ہے کہ دماغ اور اس کی عقل دل کے تابع ہے دل جس کے ساتھ دل کا اشارہ ہوتا ہے تو عقل اور دماغ جمیل قلب سوچ بچار میں لگ جاتے ہیں۔ ورنہ معطل رہ جاتے ہیں۔

حقائق اشیاء تک عقل کی بھی رسائی نہیں ہے..... اس بحث سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عقلی علوم بھی کلیتہً باطنی شے اور حقیقت اشیاء تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ عقل کا ادراک حواس اور محسوسات کے تابع ہے اور محسوسات اپنی ذات سے ظاہری چیزیں ہیں۔ جن کا یہ ظاہری حواس سے علم میں آتا ہے۔ حقیقت نہیں کھلتی تو عقل بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی گی۔ گو اس کے علوم کلیاتی ہونے کی وجہ سے ایک حد تک باطنی ہوں۔ مگر اپنے منشاء کے لحاظ سے وہ بھی ظاہری ہی کہلائیں گے جنہیں حقیقت الامر سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسی لئے فلاسفہ روزگار عقل کو امام مطلق ماننے کے باوجود آج تک کسی ایک چیز کی بھی حقیقت نہیں بتا سکے۔ بقول لسان العصر اکبر مرحوم کے۔

قلبی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں اور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

پس قلب کے یہ تمام علوم جو حواسِ خمسہ یا عقل کے واسطے سے اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ اس لئے ان عقلی علوم کو بھی تمام علم اور کامل علم نہیں کہا جائے گا جس کی حقیقت تیز بین الاشیاء ہیں۔

پس قلب ان آلاتِ خمسہ و عقل سے جو کچھ بھی دیکھتا سنتا ہے۔ وہ اسی ظاہری عالم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس جہان سے متعلق اس کی یہ معلومات بھی ظہری ہی کہنا کیسیں گی۔ خواہ وہ حسی ہوں یا عقلی جن کا حقائقِ اصولیہ سے تعلق نہ ہوگا۔ پس قلب کا یہ بالواسطہ علم خواہ حسی یا عقلی، ظہر ظاہر کے سوا کچھ نہیں۔ محسوسات کا ظاہری ہونا تو کھلا مشاہدہ ہے اور معقولات کا ظاہر ہونا اس سے نمایاں ہے کہ عقل کی دوڑ دھوپ کا دائرہ یہی حیات ہیں۔ اس لئے اس کے معقولات کو بھی ظہری کا علم کہا جائے گا نہ کہ علمِ باطن، اس لئے وہ تمام علم یا مطلق علم نافع نہ ہوگا کہ اسے دارین کے بنیادی نتائج و آثار کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے کہ اس سے ساری غیر حقیقتیں کھل جائیں اس لئے جیسے اعضاء حواس کو حقیقی معنی میں عالمِ مدرک نہیں کہا جائے گا۔ ایسے ہی اعضاء دماغ اور اس میں بھری ہوئی عقل محض کو بھی حقیقی مدرک نہیں مانا جائے گا جبکہ وہ بغیر اس ظاہری علم کی مدد کے اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔

32 حقیقی علم و ادراک صرف قلب کی خصوصیت ہے..... اس لئے اب آخری علم وہ رہ جاتا ہے جو براہ راست اور بلا واسطہ قلب ہی سے متعلق ہو۔ جس میں کسی بھی کھلے یا چھپے عضو کا واسطہ نہ ہو۔ بلکہ قلب ہی اپنے اندرونی قوت سے اس کا ادراک کرتا ہو اور ایک ایسے چھپے ہوئے جہان کی چیزوں کا ادراک کرتا ہو کہ وہ حواس اور عقل کی گرفت سے باہر ہو تو قدرۃ وہاں جس و عقل کام ہی نہیں دے سکتیں۔

سو اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واضح ہوگا۔ قلب کا واسطہ اسبابِ عام، ان تمام ادراکات حواس و عقل سے بدرجہا بالاتر اور گہرا علم ہے جس کی کرشمہ سازیاں اور شعور و ادراک کی رعنائیاں مجیر العقول ہیں۔ نہ اس کے علم و ادراک میں وہ قیدیں اور شرطیں ہیں۔ جو ان اعضاء حواس اور اعضاء دماغ کے علوم میں تھیں اور نہ ہی وہ اپنے

افادہ و استفادہ میں وہ مختلجی اور پابستگی لئے ہوئے ہے۔ سو اسی مذکورہ اصول کو سامنے رکھ کر کہ جس عضو کے علم و ادراک میں غواہ کی قیود و شروط زیادہ نہ ہوں گی۔ اسی حد تک اس کا علم وسیع، ہمہ گیر اور کمال تیز کا حامل ہوگا۔

اگر ہم غور کریں تو واضح ہوگا کہ قلب کا علم ان تمام رکمی قیود سے آزاد ہے۔ جو بدن کے دوسرے اعضاء پر عائد تھی۔ قلب کے علم میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، نہ جسم کی شرط ہے نہ روح کی، نہ حیات کی پابندی ہے نہ معنویات کی، ان قرب کی حد بندی ہے نہ بعد کی، نہ تقابل کی ہے نہ جہات اور سمتوں کی، نہ اتصال کی ہے نہ انفصال کی۔ بلکہ اس کے علم کے سوتے شش جہات میں بہتے ہیں اور وہ اگر کسی چیز کے ادراک کرنے پر آجائے تو اس کی صورت سے لے کر مادہ تک اور مادہ سے لے کر حقیقت تک اور حقیقت سے لے کر اس کی وجودی نسبت تک ہر ہر چیز کی حقیقت کھول کر دیتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی کائنات میں حقیقی مد رک اور اصلی عالم قلب ہی ہے۔

وہ محسوسات کا ادراک تو بواسطہ حواس کرتا ہے اور معقولات کا ادراک بواسطہ عقل اور وجدانیات کا ادراک بتوسط وحی خداوندی۔ البتہ محسوس و معقول میں حس اور عقل کے واسطہ بن جانے کے سبب یہ محسوسات اور معقولات حواس اور عقل کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ وہ قلب ہی کے اور اکات ہیں اور وہی صحیح معنی میں قوت حاسہ اور قوت عاقلہ ہے۔

بہر حال یہ سب دلائل اسی کے ہیں۔ جیسے محسوسات کا علم حقیقتاً حواس کا علم نہ تھا، بلکہ دل کا تھا۔ اسی طرح معقولات کا علم بھی دماغ یا عقل کا نہیں، بلکہ دل ہی کا ہے۔ وہ ان کے واسطوں سے اس سطحی اور ظاہری جہان کو دیکھتا ہے۔ اس میں جزئی اور اصولی طور پر غور کرتا ہے اور اقلیم بدن کی تدبیر کرتا ہے۔ جس سے یہ جسمانی زندگی استوار ہو جاتی ہے اور اس کے تمام وسائل بواسطہ حواس و عقل دور بین مہیا کر کے تمدن کی بنیادیں ہموار کر لیتے ہیں، تاکہ نفس انسانی دینیوی زندگی براجت بسر کر سکے۔

حسیاتی اور عقلی علوم کا ملبھا خوبصورت سامان ہیں خوش سیرت انسان نہیں..... لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان ظاہری علوم سے خواہ وہ حواس خمسہ کے ہوں یا عقل کے ظاہر آرائی ہی قوت مل سکتی ہے۔ صورت صورت ہی کو جنم دے سکتی ہے نہ کہ حقیقت کو۔ مادہ مادیات ہی کو نمایاں کر سکتا ہے نہ کہ روحانیات کو اور معقول معقول ہی کو سامنے لا سکتا ہے نہ کہ وجدان اور ضمیر کو۔ اس لئے تجربات و مشاہدات اور اصول کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔ کہ حواس خمسہ کی صورت آرائیوں کا یہ علم جو سامنس کے مرکب پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دماغی عقلیات کا یہ علم جو فلسفہ کے کاندھوں پر چڑھ کر آتا ہے۔ بلاشبہ اچھے اچھے خوب صورت سامان تو پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اچھے اور خوش سیرت انسان نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ حسیاتی علم وضع ہی کیا گیا ہے، صورت آرائی کے لئے نہ کہ حقیقت نمائی کے لئے، اس سے حقیقت نمائی یا سیرت سازی کی توقع باندھنا خلاف موضوع ہے۔ نیز ایسے ہی یہ عقلیاتی علم بنایا گیا ہے تمدنی نظریات قائم کرنے کے لئے نہ کہ حقائق غیبیہ اور عقلیات کو ضمیر میں جمانے کے لئے پس اس سے بھی اور بنیادی

حقیقتیں کھول دینے کی توقع باندھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے چیونٹی سے پہاڑ اٹھا لینے کی امید رکھنا۔

ان ظاہری علوم سے جب ہر وقت اجسام اور ان کی نت نئی صورتیں اور ان ہی کے عوارض رنگ و بو اور جسمانی لذات سامنے آتی رہیں گی۔ تو دل میں رنگینوں ہی کے جذبات بھی قائم ہوں گے۔ صورتوں کی رنگینی، گوش نواز نغموں کی افراط، رنگ روپ کے چمکدار نمائشی سامان اور اسباب قہش و آسائش ہی کے جذبات دلوں میں سما سکیں گے، نہ کہ سادگی و بے تکلفی اور قناعت و کفایت کے اخلاق و دواعی ابھر رہیں گے۔

ادھر بھی حواس خمسہ کی ظاہر نمائی کا یہ علم جب دماغ کی تاثیریت یا فزعیہ کی سان پر چڑھتا ہے اور عقل انہی حیاتی چیزوں کو استدلالی رنگ دینے پر اتر آتی ہے تو طرح طرح کے طبعیاتی فلسفے نظر پائی ازم اور نمائشی فارمولے کیون ازم، کمپٹل ازم، ہوشل ازم وغیرہ وغیرہ دنیا کے دماغوں پر چھاتے ہیں۔ جس سے نمائشی تمدن نظری طور پر ایک معقول انداز کا فلسفہ نظر آنے لگتا ہے۔ خواہ اس کی حقیقت میں معقولیت کا نشان تک نہ ہو۔ جس سے اس مادی قسم کی معاشرت کو علمی رنگ کی تقویت بھی مل جاتی ہے۔ کیونکہ ان مادیاتی سامانوں کو اگر ایک غیر فلسفی محض اپنی صنعتی مہارت سے بنا تا رہے۔ تو وہ زیادہ سے زیادہ صنایع اور سامان سازی کا ایک کارگر کہلا سکے گا۔

لیکن انہی چیزوں کو جب فلسفیانہ نظریات کی آب دے کر کوئی بنانے والا بنائے گا۔ تو اسے ڈاکٹر کا لقب ملے گا اور اب وہ مزدوروں یا صنعت کاروں کی لائن سے، اوپر ہو کر فلسفیوں کی سطر لائن میں آ جائے گا۔ جس کی بدولت بظاہر دلائل کی قوت سے ایک ایسی ظاہر داری کا روکھا تمدن اور نمائشی معاشرہ دنیا میں ابھرے گا۔ جس میں قصع، بناوٹ، نمائش اور گندم نمائی، جو فروشی کے جذبات کام کریں گے۔ جس سے مرنا، جینا اور رہنا، سہنا حتی کہ سامان خورد و نوش اور ضروریات لباس و پوشاک تک سب بناوٹی بن جائے گا اور ان ظاہری علوم سے ساری زندگی ہی ظاہر داری کی ہو کر رہ جائے گی۔ جس میں حقیقی اخلاق، فاضلانہ ملکات، صدق و اخلاص، انسانی اخوت، باہمی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے جذبات و عزائم بھر ہی نہ سکیں گے، جس سے تمدن میں خلوص اور محبت نہ تعاون و عناصر پیدا ہو جو تمدن کی حقیقت ہے۔

حیاتی اور عقلی علوم کے طبعی نتائج بد..... اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ان حیاتی اور عقلیاتی فنون کی بنائی ہوئی صورتیں حقیقتوں اور معنوی قدروں سے خالی ہوں گی۔ جن کے لئے یہ فنون وضع ہی نہیں کئے گئے۔ تو وہ بے جان لاشوں کی مانند ہوں گی اور سب جانتے ہیں کہ بے جان لاش کا انجام گھنے، سڑنے، پھولنے، پھٹنے اور عفونت پھیلانے کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جس سے دنیا کا دماغ پر گندہ ہو کر ہزاروں ظاہری اور باطنی مہلک بیماریاں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جس میں سب کچھ ہوگا۔ مگر سکون و اطمینان ہی نہ ہوگا۔

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج کی دنیا کے خوش منظر اور نظر فریب سامانوں اور ان کی نئے نئے ذرائعوں سے اسباب راحت کی بہت تاب ہے۔ لیکن راحت مفقود ہے۔ اسباب عیش کی کمی نہیں۔ لیکن عیش حقا ہے، امن و سکون

کے نام پر ہزاروں خوشنما سامان لئے نئے اسباب معیشت، نئے نئے ڈیزائنوں اور نئے نئے روپوں میں مہیا ہیں۔ لیکن امن و سکون ہی ندارد ہے۔ بلکہ پیش کی جگہ جنگ حالی، امن کی جگہ بارودھاڑ، اور چین و اطمینان کی جگہ ہمدردی تشویش اور بے چینیوں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ قلبی راحت و طمانیت اور ضمیر و وجدان کے سکون کا تعلق اخلاقی بلند یوں اور سچے کردار سے ہے۔ نہ کہ صورتوں کی چمک دمک اور سامانوں کی کثرت سے۔

اسی لئے آج کا انسان صورتاً تو یقیناً انسان ہے اور بہت چمکیلا انسان لیکن سیرت و کردار کے لحاظ سے سانپ، بچھو اور گیدڑ، بھیڑیے سے کم نہیں ہیں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: ”سَيَخْرُجُ أَقْوَامٌ خُلْدَاءُ الْإِنْسَانِ مُفْهَاءُ الْأَخْلَامِ يَقُولُونَ بِقَوْلِ خَيْرِ النَّبِيِّ يَقُولُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَوَاقِيهِمْ، أَلَيْسَتْهُمْ أَخْلَى مِنَ الشُّكْرِ وَقُلُوبُهُمُ الذَّائِبُ.....“ ”عنقریب کچھ قومیں ابھریں گی تو خیر، بد عقل، باتیں بڑی اصول رنگ کی بگھاریں گے، قرآن کا نام بھی زبانوں پر ہوگا۔ لیکن وہ منسلکوں سے نیچے اترا ہوا نہ ہوگا۔ ان کی زبانیں تو عربوں جیسی فصیح و شائستہ ہوں گی۔ لیکن دل ان کے بھیڑیوں کے سے ہوں گے۔“

اور جیسا کہ حضرت ابوالفضل دواور رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد میں اہل لباسوں میں سے ہوئے انسانوں کی بابت بڑی حسرت سے فرمایا تھا کہ ”كَانَ النَّاسُ وَرَقًا لَا شَرَّكَ لَهُ فَضَارُوا شَوْكًا لَا وَرَقَ فِيهِ“ ”لوٹ ہرے بھرے پتے تھے جن میں کانٹے کا نشان نہ تھا۔ لیکن ہو گئے ایسے کانٹے، جن میں پتے کا نشان نہیں۔“

چنانچہ آج نہ اس صورت پسند انسان سے انسان کو چین ملتا ہے، نہ غیر انسان کو، انسان ہی نہیں کائنات کی کسی بھی چیز کو امن میسر نہیں۔ عباد اور بلاد دونوں تباہ حال ہیں، ملک ملکوں کے لئے، شہر شہروں کے لئے، دریا دریاؤں کے لئے اور فضاء و غلاء ساری فضاؤں کے لئے آفات و مصائب کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی تصویر قرآن حکیم نے اس طرح کھینچ دی ہے کہ: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ نَعَضُ النَّبِيِّ عَمَلُوا أَعْلَمُوا لِقَوْمٍ يُزْجَوْنَ﴾ ”حکلی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ باز آجادیں۔“ اس سارے مہل کی کی بنیاد ان حیاتی اور مادیاتی علم کی بنائی ہوئی تمدنی صورتوں کا اخلاقی قدروں سے خالی ہونا اور ان کے متاعوں اور اس نمائش کے علمبرداروں کا مصدر اخلاق و مصدر کمالات حضرت حق جل مجدہ کے تعلق اور اس کی یاد سے بیکر غافل ہو جانا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کی جڑ بنیاد ہے قرآن حکیم نے انہی دعویداران علم اور ان کی فلسفیانہ مبلغ علم کی قسمی ان الفاظ میں کھوں دی ہے ﴿لَا عَرَضَ عَنْ مَنْ قَوْلِي عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَى﴾ ”سو تو وہ بیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا۔ پس میں تک پہنچی ان کی سمجھ۔ تحقیق حیرانرب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے اور وہ خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا۔“

نیز اس نئے قرآن حکیم نے اس صورت سازی اور صورت سازی کے علم کو ظاہری علم فرما کر اشارہ فرمادیا ہے۔ کہ اس ظاہری علم میں کوئی باطنی حقیقت نہیں۔ جو اس علم کو جاندار بناتی، اس لئے یہ رسمی اور نمائشی علم خواہ سائنس کا ہو یا ریاضی کا، مساحت کا ہو یا فلسفہ کا، جب بھی اخلاقی قدروں سے خالی ہوگا۔ تو وہ انجام میں غفلتوں ہی کا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ﴾ ”جانتے ہیں اوپر اور پر دنیا کے جینے کو اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے۔“

قلبی ادراک کے دو علمی رخ..... پس اس اصول پر کہ صورت بغیر حقیقت کے لاثر اور گندگی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس قلب انسانی کو جہاں یہ علمی رخ عطا فرمایا کہ وہ اس ظاہری علم سے جو حواس و عقل کے راستہ سے اس میں نمایاں ہوتا ہے اور اس سے مادی زندگی کی دل فریب نقشے اور رنگین تمدن کی رنگین صورتیں اور ڈیزائنیں بنتے ہیں۔ جس میں آنکھ کے لئے دیدہ زیب مناظر، کانوں کے لئے سحر نواز آوازیں، ناک کے لئے پاکیزہ خوشبوئیں، زبان کے لئے خوش ذائقہ غذائیں، ہاتھ پاؤں کے لئے نرم و گداز بدن، چھوٹے اور پکڑنے کے لئے خوش گوار چیزیں، تن خاکی کے لئے راحت دو بلڈ ٹیمیں ہوں۔ تاکہ نفس انسانی کے لئے ان معلومات اور ان محسوسات سے تسکین نفس اور لذت بدن کا سامان میسر آجائے۔ وہیں اس انسانی قلب کو حق تعالیٰ نے ایک دوسرا علمی، رخ بھی بخشا ہے۔ جس کی بدولت قلب کے لئے برا واسطہ حواس و عقل دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور دیکھنے کے کچھ معنوی سامان مہیا ہوتے ہیں۔

بالفحہ وغیرہ اس مجموعہ عجائبات (قلب انسانی) میں ایک درپچہ اگر اس کی سمت اسفل میں کھولا تھا۔ جس سے وہ بواسطہ حواس و عقل اسی حسی اور نمائشی جہاں کو دیکھتا تھا تاکہ اس کائنات بدن کے لیے اپنے اسی ظاہری علم سے بدنی اور جسمانی سامان فراہم کرے۔ تو دوسرا درپچہ اس کی سمت بالا میں کھولا ہے۔ جس سے وہ اس غیبی جہان کو دیکھتا ہے۔ جہاں معارف الہیہ، اخلاق ربانی، لذات روحانی اور مقامات باطنی مثل محبت والفت، انس و موانست، ہمدردی و خدا ترسی، اطاعت الہی اور بندگی حق کے ذخیرے جمع ہیں۔ تاکہ قلب اپنے اس باطنی علم سے بلا واسطہ حواس و عقل بالہام ربانی اپنی اخلاقی قدریں درست کرے۔ جس سے دنیا میں امن سکون کی فضا ہموار ہو اور یہ کائنات طمینتان و چین کی زندگی بسر کر سکے۔

قلب کی مادی اور روحانی اور اکات میں مشابہت..... پس یہاں اگر علم ظاہر کا واسطہ حواس، اور عقل ہیں۔ جن کے راستہ سے یہ حسی علم قلب میں آتا ہے اور اس سے وہ کائنات بدنی کی تدبیر کرتا ہے تو وہاں اس علم باطنی کا واسطہ وحی و الہام ربانی ہے۔ جس کے ذریعہ یہ انبیائی علوم قلب کے وجدان پر مترشح ہوتے ہیں۔ جن سے یہ قلب اپنی کائنات روحانی کی تدبیر کرتا ہے۔ یہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا چرے کی آنکھ، کان، ناک سے ہوتا ہے اور وہاں کا دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا اس کی اندرونی آنکھ، ناک، کان سے ہوتا ہے۔ یہاں سونگھنے سے چکھنے سے تن و جان کو قوت ملتی ہے اور وہاں کے مشاہدہ و سماع سے روح و رواں اور معرفت و ایمان کو قوت میسر آتی ہے

یہاں صورتوں کی نمائش ہوتی ہے اور وہاں سیرتوں کی آرائش۔

اگر بدنی زبان کھانے کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی مادی غذا ہے تو یہاں دل و جان کی زبان معرفت و ایمان کا مزہ چکھتی ہے۔ جو اس کی معنوی غذا ہے۔ ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: "كَذَاقِ طَعْمُ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِمَا لِلَّهِ رِضًا وَبِسُحْمٍ نَبِثًا وَبِإِسْلَامٍ ذِقْنًا" ایمان کا مزہ چکھ لیا اور اس شخص نے جو اللہ سے راضی ہو گیا بلحاظ اس کے رب ہونے کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو گیا بحیثیت رسول ہونے کے اور اسلام سے راضی ہو گیا بلحاظ دین ہونے کے۔

اگر یہ مادی زبان علوہ سے متحساس کا مزہ چکھ لیتی ہے تو دل کا وجدان ایمان و عرفان کی متحساس محسوس کرتا ہے ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: "مَنْ مَسَرَّهُ أَنْ يُجِدَ خَلَاوَةً الْإِيمَانِ فَلْيَنْتَسِبِ الصُّوفَ تَذَلُّلاً لِرَبِّهِ عَسْرًا وَجَلًّا" جس کو ایمانی متحساس سے لطف اندوزی کا شوق ہوا ہے چاہئے کراپنے رب کے سامنے اپنی ذلت کے اظہار کے لئے سونا مسمولی لباس پہنئے۔ اگر جسمانی معذہ لذیذ غذاؤں سے سیر ہوتا ہے تو روحانی طین نجی لطیف غذاؤں سے سیر ہوتا ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا افطار پے در پے روزے رکھنے پر فرمایا: "أَبْسُكُمْ فَيَلْبَسِي يَطْعَمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي" تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلا بھی دیتا ہے اور پلا بھی دیتا ہے۔ اگر پیشانی کی آنکھ خوشنما چہرے، اور اقلیموں کے جیل منظر دیکھتی ہے تو دل کی آنکھ رہال غیب (ملائکہ علیہم السلام) کے روشن چہرے اور عجائبات ساوی دیکھتی ہے۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف شمس کے موقع پر جنت و دوزخ کو عیاں دیکھا اور جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں ملاحظہ فرمایا اور ہر معراج ایک انتہائی رفیع منزلہ پر پہنچ کر اپنے پروردگار کے جمال کا بھی مشاہدہ فرمایا۔ اگر یہ سر کے کان اس جہان کے حسی نفس اور آوازوں کو سنتے ہیں۔ تو دل کے باطنی کان اسی جہان غیب کی آوازیں اور روح نواز نغمے سنتے ہیں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملائکہ آ کر باتیں کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے یا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کا دور کر کے سنتے سناتے تھے اور بعض اوقات آسمان کے دروازہ کھلنے کا ترانہ بھی سنتے۔

اگر منہ کی ناک ہواؤں کے طفیل پاکیزہ خوشبوئیں سونگھتی ہے تو دل کی اندرونی ناک اس عالم کے روح و رحمان کی خوشبوؤں کا ادراک کرتی ہے۔ جیسے حدیث نبوی میں جھوٹ کی بد بو اور حق کی خوشبو کا ذکر کر کے فرمایا گیا کہ جھوٹ کی بد بو سے ملائکہ کا تین ٹل دور تک بھاگے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جیسے مرنے کے بعد مومن کی روح میں سے مشک کی خوشبو کا مہکتا اور ملائکہ کا اسے سونگھنا بتلایا گیا اور جیسا کہ جان نکالنے کے وقت ملائکہ موت کا مرنے والے کے ہاتھ پاؤں کو سونگھنا کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا وہاں بھی ہے اور یہاں بھی، وہاں خواص سے ہے اور یہاں وجدان

سے، وہاں مادیت سے ہے اور یہاں روحانیت سے، وہاں قلب کے نیچے درجہ سے اس جہان رنگ و بو کی صورتیں محسوس ہوتی ہیں اور یہاں قلب کے اوپر کے جہر و کد سے اس جہان کی اخلاقی اور روحانی قدریں مشاہدہ ہوتی ہیں، وہاں احساس ہے اور یہاں الہام، وہاں قوائے حساسہ اور قلوب میں اور یہاں قوائے وجدانیہ، وحیات و معنیات ہیں، اور یہ معنویت، وہاں سائنس اور فلسفہ کی کارگزاری ہے اور یہاں حکمت الہی اور وحی رہائی کی۔

حس اور علم کا فرق..... اس سے یہ بھی کھل جاتا ہے کہ نفس و سائنس یا حواس سے جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے اسے حس کہا جائے گا، علم نہیں کہا جائے گا اور یہاں غیبات کی خبروں سے جو کچھ کھلے گا، اسے علم کہا جائے گا، جس نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ علم کہتے ہی میں کسی نئی اور نگاہوں سے اوجھل چیز کے جان لینے کو، خواہ وہ غیبی اشخاص ہوں یا معنوی امور، علمی جزئیات ہوں یا اصول کلیہ کہ وہ جس سے محسوس نہیں ہوتے۔ اس لئے علم جب بھی ہوگا، مغیبات ہی کا ہوگا نہ کہ حیات کا اور جس جب بھی ہوگی مشاہدات کی ہوگی خواہ وہ مشاہدہ صورت کا ہو یا مشاہدہ آواز و اصوات ہو یا مشاہدہ خوشبو وغیرہ۔ و دوسرا کبھی حس کو علم یا علم کے احساس سے تعبیر کر دیا جائے۔ بہر حال علم وہی ہے جو حواس سے غائب اور مخفی امور کا ہوا اور قوت حس سے اس کا اور اک نہ ہوگا ہو۔ یہ علم جو حقیقی علم ہے اپنی پوری صلیت اور قطعیت کے ساتھ انبیاء معصومین علیہم السلام پر اتارتا ہے اور بطور نقل و فرس کے ان کے ابتداء و خداس، اولیاء کرام اور علماء آخرت پر وارد ہوتا ہے

حیاتی علوم کا سرچشمہ مادہ ہے اور الہامی علوم کا منبع ذات و صفات خداوندی ہے۔۔۔۔۔ بہر حال ظاہری موم الہی احسانات اگر مادے کی ذات و صفات سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ بھی ظواہر میں سے ہے اور یہ علم بھی ظواہر کا ہے۔ تو یہ الہامی علم خدا کی ذات و صفات اور افعال سے متعلق ہے کہ وہی غیب مطلق اور غیب حقیقی ہے اور یہ علم بھی غیب ہی کا ہے۔ پس اگر علم کا شرف معلوم کرے تو جیسے خدا کی ذات و صفات، شرف و عظمت میں سب سے سخی اور بالا ہے۔ ایسے ہی اس کا علم بھی درجہ معلوم سے اعلیٰ فائق تر اور اشرف تر ہوگا اور جس طرح مادہ کے علم سے مادہ کی ذات و صفات اور اس کے تقابلیہ کھلتے ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات کے علم سے انہی کے اوصاف و کمالات اور ان کے تقاضے منکشف ہوں گے۔ اس غیبی علم کے سلسلہ میں چونکہ ذات و برکات حق کا تعارف حاصل ہوتا ہے جو سارے کمالات و برکات کا سرچشمہ اور تمام خیرات و حسنات کا منبع ہے اور آدمی مرتے دم تک ذوق و شوق اور محبت الہی سے اس کی خرافہ و دوزخ اور بڑھتا رہتا ہے اور اسی کی ذات و صفات میں سراپا شوق میں سرگشتا رہتا ہے۔ تو علمی طور پر انہی کی صفات و کمالات کا استاکشاف اور علم یقین بھی حاصل ہوتا رہتا ہے کہ وہ واحد مطلق، علیم و مجیب، حکیم و کریم، رؤف و رحیم، محسن و منعم، رزاق و قیام، باری برحق اور معلم مطلق ہے۔ تو اس سے قدرتی طور پر انسان میں خدائی اخلاق کے پرتو نمایاں ہوتے ہیں۔ یعنی رحمہ، سخا و کرم، حیاء و نفست، غیرت و حمیت، جو د و عطا، عدل و انصاف، ناز و زور کی خبر گیری، ہنسوں کی حاجت برآری، مظلوموں کی داری قیہوں اور بیواؤں کی خدمتگزاری، غریب

الوطنوں کی پشت پناہی، کمزوروں کو قوت رسانی اور عام مخلوق خدا کی خیر خواہی کے ہی اخلاق و جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے عالم میں چین، ملکوں میں اطمینان، شہروں میں سکون، گھروں میں عافیت، دلوں میں بشارت اور معاملات میں فرحت و مسرت کے آثار پھیل جاتے ہیں۔ جس سے یہ ظلمت کدہ و تباہت نظیر بن جاتا ہے۔ زندگیاں بڑھ جاتی ہے اور آدمی فرشتہ بن کر پروردگار پر نمودار ہوتا ہے۔ جس پر ہمہ وقت رحمت کی بارشیں برسی ہیں اور وہ لوگ بھی اس سے محروم نہیں رہتے، جو اپنی تنگ نظری سے ان بھلوں کو بھی برا بناتے رہتے ہیں۔

اویم زمیں سفرہ عام دوست بریں خوان یثما چہ دشمن چہ دوست
مادی اور الہامی علوم کے جد اجداد آثار و شمرات..... پھر نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کو بھی سکھ میسر آتا ہے جس سے وہ اس قسم کے رہبانوں اور تھانوں کی محبت و عقیدت میں سرشار ہو کر ان کے دعا گو بن جاتے ہیں۔ حیوانیاں اپنے سوراخوں میں، گھنچیاں اپنے دریاؤں میں اور پرند اپنی فضاؤں میں ایسے انسانوں کی عمر درازی اوراقبال مندی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ملائکہ جیسی مقدس مخلوق ان کے قدموں کے نیچے پر بچھائے لگتی ہے۔

جس کی بنیاد یہ ہے کہ اس علم حقیقی کا پہلا اثر آدمی کے اخلاق میں نمایاں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ مادہ پرستوں میں مادہ کی ذات و صفات کو رات دن کریدتے رہنے اور اس میں ہمہ وقت گھسے رہنے سے مادیات اور مادی جذبات و اخلاق ہی چھاتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے اس امارۃ بالسوء نفس کو قوت ملتی ہے اور وہ اس مادی قوت کے غرور اور قوی وسائل زندگی کی کثرت کے گھمنڈ میں انجام سے بے خبر ہو کر نفس پروری، خود غرضی، بے حسیتی، طمع نفس، توقیر نفس، حقیر غیر، انفاق انگیزی، ظلم پروری، تساہل قلبی، بے حیائی، دنیا طلبی، طمع آیزی انداز کی چوری، قانونی رنگ کی ڈکیتی اور اپنی حقیر حقیر قسم کی اغراض و خواہشات کی تکمیل کے لئے ہزاروں انسانوں کے جان و مال سے کھیلنے ہی میں لطف محسوس کرتا ہے۔ جس سے دنیا میں بے چینی، بے اطمینانی، باہمی بے اعتمادی، مایوسی، توہم پرستی اور تعصب پسندی کی فضا بن جاتی ہے۔ جس سے نہ عباد کو چین ملتی ہے، نہ بلاؤ کو۔ ایسے ہی خدا کی ذات و صفات اور کمالات کی معرفت اور اس میں رات دن گھسنے اور دوڑنے سے اسی کے کمالات کے آثار نفس میں پیوست ہوتے ہیں۔ جس سے وہ نفس مطمئن بن جاتا ہے اور اس میں خدائی اخلاق رحمت و محبت، اثر و غنا، خدمت خلق اللہ، رنگیری و ضعفاء اور محبت آخرت وغیرہ کے اخلاق و اعمال رونما ہوتے ہیں۔

پھر اسی نجی علم کے سلسلہ میں ذات و صفات کے علم کے بعد اس کا اہم ترین حصہ اللہ رب العزت کے قانون کے علم کا ہے۔ جس سے اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ چلتا ہے اور ان مذکور اخلاق و کمالات کو عمل میں لانے کے لئے عمل کے طریقے سامنے آتے ہیں۔ حلال و حرام، جائز و ناجائز، روا و ناروا کی تمیز پیدا ہوتی ہے اس کے اوامر و نواہی کا پتہ چلن ہے۔ اس کے اور اس کے مخلوق کے حقوق ادا کرنے کے ڈھنگ نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے وہ پختہ اور تیر بہدف کے نمونے اور پیغمبری اسوے نمودار ہوتے ہیں، جن سے انسان کی سعادت دنیا اور نبیات آخرت رونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

علم ربانی کی سبابتجہ علم نفس بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔ مگر اسی علم اعلیٰ کا تہہ ایک اور علم بھی ہے کہ جس کے بغیر آدمی اعلیٰ علم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ خود اپنے نفس کے تشبیہ و فراز کا علم ہے۔ جس سے نفس کی اصنیت اور اس کی جذبات کے گوشے و اشکاف ہوں۔ کیونکہ نفس کی اوجھڑچاٹ کا علم ہوجانے سے واشکاف ہوتا ہے کہ وہ تمام شرور و فتنے اور عیوب و ذنوب کا منبع ہے۔ برائیاں اسی سے ابھرتی ہیں اور دینائے اخلاق کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کھول دیا ہے کہ انسانی نفس کی ذات میں نہ کوئی کمال ہے نہ ہتر۔ کمال و ہتر کی دو ہی بنیادیں ہیں علم اور اخلاق۔ قرآنی روشنی میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ نہ اس کے اول میں علم ہے نہ آخر میں اور درمیان میں جتنا ہے وہ عارضی ہے۔ جو اس کی دلیل ہے کہ اس میں پیداہشی طور پر کوئی علمی کمال موجود نہیں۔ پھر جہاں تک اخلاقی کمال کا تعلق ہے۔ جس سے پاکیزہ اعمال اور خیر و برکت کی حرکات و سکنات کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں نہیں، بلکہ ہے تو فتنہ و فساد کے جذبات اور برائیوں کے دوائی جاگزیں ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام کو جب انسان کی خلافت ارضی کا علم ہوا تو انہوں نے جناب باری میں عرض کیا تھا کہ: ﴿فَجَعَلْنَاهَا مِنْ نَفْسٍ ذَلِيلَةٍ﴾ کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور خون بہائے۔

اور یوسف علیہ السلام کا مقولہ حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ: **جَوَانُ النَّفْسِ لَا مَازَةَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجَمَ رَبِّي**۔ ”بے شک نفس (امارہ) جو تو سکھلاتا ہے برائی، مگر جو دم کر دیا میرے رب نے“۔ جس سے صاف واضح ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے جیسے علم لے کر نہیں آیا۔ ایسے ہی کوئی اخلاقی کمال لے کر بھی نہیں آیا۔ ورنہ اسے تعلیم تربیت کی ضرورت نہ پڑتی اور ظاہر ہے کہ جب اس کے جذبات اس جمل و ناقوانی اور بد اخلاقی و بد تہذیبی کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ تو وہ سوائے فتنہ و فساد کے، اور کیا ہوں گے اور اور کمالات علم اور کمالات اخلاق کا سرچشمہ و حقیقت حق تعالیٰ شانہ کی ذات باریکات ہے۔ جس کے آثار دنیا میں امن و امان اور دیانت و ایمان پھیلاتے ہیں۔ جس سے دنیا امن و سکون کا گہوارہ بن جاتی ہے تو ضروری تھا کہ جہاں علم خداوندی انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہیں خود اپنے نفس کا علم بھی بتعلیم حق ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے جبل شریف و وفطرت الہیہ کی خیر و برکت و ازل کے رسمے اور اس طرح دنیا بھی اس کے شر سے محفوظ رہ سکے اور وہ خود بھی حفاظت کے دائرہ میں آجائے۔

علم کی دو بنیادی اقسام علم النفس اور علم الازب اس لئے قدرتی طور پر دو علم بنیادی طور پر ضروری ٹھہر جاتے ہیں۔ جو انسان کی صلاح و فلاح کے لئے ناگزیر ہیں۔ ایک علم النفس اور ایک علم الازب پھر دونوں علم جہاں اپنی اپنی خاصیتوں اور تاثیروں کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ وہیں اس وجہ سے بھی فطری ہیں کہ طبعاً انسان سب سے پہلے اپنے قرب کی چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے اور پھر بعد اوردور کی چیزوں کا۔

اور ظاہر ہے کہ انسان کا نفس جس قدر انسان سے قریب ہے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ سو اگر کسی کو اتنے قریب اپنا بھی علم نہ ہو تو اس سے زیادہ جاہل اور کون ہو سکتا ہے اور ادھر اس سے بھی زیادہ قریب تر اس کا رب ہے کہ خود

نفس بھی اپنے سے اتنا قریب نہیں۔ تو اس غیر معمولی قرب پر بھی اگر انسان کو اپنے رب کا علم نہ ہو تو اس سے زیادہ اجہل اور کون ہو سکتا ہے؟

اس لئے قرب و بعد کے لحاظ سے بھی یہ دونوں علم انسان کے حق میں ضروری اور واجب ٹھہر جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان دونوں علموں کی ضرورت کی بنیادیں بھی قائم فرمادی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: **وَلَسْتُ بِفِيهِمْ اَيْتًا فِي الْاَفَاقِ وَلِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتٰى يَنْبَغِيْ لَهُمْ اِنَّهٗ الْحَقُّ ۚ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۚ اَلَا اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰتٰىهُم مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۚ اَلَا اِنَّهُمْ يَكُلُّ الشَّيْءَ مُجِيفٌ ۚ** ”ہم دکھا دیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود ان کی جانوں میں ہی، یہاں تک کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے۔ کیا تیرا رب تمہارا ہے اس چیز پر گواہ ہونے کے لئے خبردار وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے۔ خبردار وہ گھبرے ہوئے ہے ہر چیز۔“ ظاہر ہے کہ یہ اراست آیات (نشانیوں دکھانا) ہی علم پہنچانا ہے اور وہ علم نفس کے اندر کا بھی ہوگا اور باہر کا بھی جس سے علم انفس اور علم آفاق کی تکمیل کی طرف صاف اشارہ نکلتا ہے۔

پھر اس علم پر تین حق مرتب کیا گیا ہے اور تین کے معنی کھول دینے کے ہیں ظاہر ہے کہ ذہن پر یا قلب حق کا کھل جانا ہی علم ہے۔ جس سے علم الرب کی طرف اشارہ ہے اور ساتھ ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علم انفس یا نفس کے اندر آیات اُمیہ کا دکھلایا جانا، ہی حق کے دکھلا دئے جانے کے مبادی میں سے ہے تو اس کا صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معرفت نفس ہی سے معرفت رب کا دروازہ کھل سکتا ہے، جسے عرفاء اسلام نے طبع ترین انداز سے اس حکیمانہ مقولہ سے مزید کھول دیا ہے کہ **”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ“**..... ”جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا بیشک اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔“

علم الرب کی عملی تفصیل کا نام فقہ ہے اور علم انفس کی تفصیل کا نام تصوف ہے..... علم حق اور اس کے احکام کے لئے فقہ ہے۔ جس میں احکام مکلفین کو کتاب و سنت سے اخذ کر کے جمع کر دیا گیا ہے اور علم انفس اور اس کے جلی روائی کے لئے فن تصوف ہے جس میں نفس کے تمام مکائد اور اس کی بداخلاقیوں کے اصول اور پھر ان رذائل کو فضائل سے بدلنے کی تدابیر کتاب و سنت سے جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جب تک اپنے نفس کی جہتوں کا علم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک حق کی نظرتوں سے استفادہ مشکل ہے۔ اس لئے جہاں علم الرب ضروری ہے۔ وہیں علم انفس بھی ضروری ہے، تاکہ ایک طرف شرور و نقائص کی فہرست سامنے آ جائے اور ایک طرف کمالات و مہرات کی تفصیل نمایاں ہو جائے اور اس طرح دنیا فتنہ و فساد سے بچ سکے۔

یہی دو علم ہیں جن سے انسان فرض شناس بنتا ہے، خوشی اور غمی میں اپنے حقیقی فرائض کو نہیں بھولتا دنیا کو چند روزہ اور اس کی لذتوں کو فانی نذر سمجھ کر اپنے ہر کام اور عمل میں آخرت ہی کو سامنے رکھتا ہے۔ اور اسی کو مقصد زندگی اور اپنی حیات مستعار کا نصب العین قرار دے لیتا ہے اور اس طرح تعظیم حق اور خدمت خلق کو اپنا جوہر نفس بنا

کر خاک ناپاک سے جو ہر پاک بن جاتا ہے اعمالِ صالحہ اس سے اولاً تکلف اور آخر کار بے تکلف سرزد ہوتے لگتے ہیں جس سے مخلوق بھی اس پر اعتماد کرتی ہے اور خالق کی رضا و خوشنودی بھی میسر آتی ہے اور اس طرح داریں کی فلاح و بہبود اس کا نقد زندگی بن جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اسی علمِ الرب کے پہنچانے کے لئے آتے ہیں..... یہی وہ قلب کا بند واسطہ علم ہے۔ جس کے پہنچانے کے لئے فلسفی اور سائنس دان نہیں، بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے۔ اسی علم کو بطونِ غیب سے اس عالم ظاہر میں اتارنے کے لئے ملائکہ معصومین علیہم السلام آسمانوں سے زمین پر اتارے گئے اور اسی کے عملی نمونے دکھانے کے لئے پیغمبروں اور ان کے مخلص خدام، آئمہ ہدایت، علماء ربانی اور دوریشانِ حقانی کو مامور فرمایا گیا یہی وہ علم ہے جس کا تعلق مادہ اور صورت سے نہیں بلکہ حقیقۃً الحقائق ذاتِ ہرکات حق سبحانہ و تعالیٰ سے ہے اور جب کہ حیاتی اور عقلیاتی علم کا آخری منہا قلب تھا۔ جو بذریعہ حواسِ غیب اور بذریعہ عقلِ معاش اسے نظریاتی ازموں کیوں ازم، کپٹل ازم، موٹل ازم وغیرہ اور مشینی علموں کی صورت سے اس دنیا میں نمایاں کرتا رہا ہے۔ تو اس معنوی اخلاقی اور شرعی علم کا مستحیا تو قلب کے سوا دوسرا عضو ہی ہو نہیں سکتا۔

پس یہ علم بطریقِ اولیٰ قلب ہی کا ہے جو بلا واسطہ حس و عقلِ محض وحیِ الہی سے ملتا ہے۔ ان رسمیاتی علوم سے مگر نظریاتی فلسفے نمایاں ہوتے تھے۔ جن سے آدمی مادہ کی گہرائیوں تک پہنچ کر مادیات ہی میں گم ہو جاتا تھا۔ تو اس خدائی علم سے دینی حکمتیں، فقہی مسائل اور وصول الی اللہ کے طرق نمایاں ہوتے ہیں جن سے آدمی حق کی گہرائیوں میں پہنچ کر فانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ جو دوائی بقاء ہے وہاں اگر مشینی علموں کی صورتیں نمودار ہوتی تھیں تو یہاں قلبی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ جن سے عقائدِ حقہ اور اعمالِ صالحہ کی بدولت آدمی بلا واسطہ اسباب بڑے بڑے نبی جہانوں حتیٰ کہ چاند تک ہی نہیں، فوقِ سموات تک جا پہنچتا ہے۔

اور جیسے ان نظریاتی ازموں کے علم و عمل سے دنیا میں ہمیشہ فتنہ و فساد اور اخلاقی گمراہیوں کا سائے آتی رہیں اور آدمی ہیں اور انسان انسانیت چھوڑ کر حیوانیت کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ ایسے ہی ان فقہی اور خدائی مسلکوں کے علم و عمل سے ہمیشہ دنیا میں امن و سلامتی، اخلاقی بلندی اور پاکیزہ عزائم و اعمال کے نمونے سامنے آتے رہے ہیں۔ جن سے انسان انسانیت سے بھی بالا ہو کر ملکیت کے آسمانوں پر پہنچتا رہا ہے اور اب بھی سعادت مند ملکوب برابر پہنچ رہے ہیں۔ مادی قسم کے نظریات اور فارمولوں سے ہمیشہ فرعون و دہمان پیدا ہوئے اور ان روحانی قسم کے فکار و اعمال سے صدیق رضی اللہ عنہ و فاروق رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

حیاتی علوم کی طرح ربانی علوم کا ظرف بھی قلب ہی ہے..... قرآن حکیم نے جیسے حیاتی اور نظریاتی علوم کو قلب ہی کا علم کہا ہے۔ مگر بواسطہ حواس و عقل جس کی تفصیل گزر چکی ہے ایسے ہی خدائی علم کا ظرف بھی قلب ہی کو بتلایا ہے۔ جو اس اقلیمِ حق میں حقیقی مدرک اور عالم ہے اور وہی اس حسی خول میں ایک لطیفہ ربانی ہے جو اس علم کو اپنے

اندر جذب کرتا ہے کہ اس کی اصلی غذا ایسی علم و معرفت ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَأَنذَرْتُكَ نَارَ الْفُتُورِ﴾ نَارُ الْفُتُورِ نزلِ یہ الزَّوْجِ الْأَمِينُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ﴿اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، لے کر اترتا ہے اس کو فرشتہ معبر، تیرے دل پر کہ تو ہوڑ رسا دینے والا علی عربی زبان میں۔“

پس جیسے علوم حواس کا سرچشمہ مادہ اور صورت ہے۔ اسلئے اس علم سے مادہ صورت ہی کو قوت ملتی ہے۔ کھانے پینے اور بارام رہنے سہنے سے بدن اور بدنی قوتیں ہی زور پکڑتی ہیں اور اس سے پھر مزید نمائشی صورتوں اور اسباب تخلیق کے نئے نئے ذراتوں کی بجائے حقیقی اور سیرت و کردار کے نئے نئے پاکیزہ نقشے سامنے آتے ہیں۔ جن سے درجہ بدرجہ روحانیت کے مقامات ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔

اب اگر یہ حقیقی علم اور اس کی یہ اخلاقی قدریں اس نمائشی علم اور اس کی حسی صورتوں کے ساتھ لگ کر اسی میں روح کی خرق سما جائیں۔ تو پھر تمدن کے یہ نمائشی نقشے بے جان باقی نہیں رہ سکتے۔ بلکہ زندہ و پائندہ بن جاتے ہیں۔ جس سے دنیا کو حیات ملتی ہے نہ کہ بتابی و ہلاکت، دنیا میں امن و سکون پھیلتا ہے۔ نہ تشویش و اضطراب اور بے چینی جیسا کہ خلفہ راشدین اور آئمہ عدل و حق نے دنیا کو منتوں کو منائے بغیر انکی اخلاقی قوتوں سے جاندار بنا دیا تھا اور دنیا کے پردوں میں دینی زندگی بھر کر اس دنیا کو بھی زندہ جاوید دکھایا تھا۔

ربانی اور حسی علوم کے لوازم اور خاصیات جس کا راز یہ ہے کہ اس علم الہی کے لوازم میں سے پہلی چیز خشیت اللہ اور خوف خداوندی ہے جس کا طبعی اثر نافرمانی اور بغاوت حق سے گریز اور معصیت سے پرہیز ہے۔ پس عالم دین وہی شمار ہوگا جس میں علم کی یہ تہ صیتیں ہوئی ہوں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل حسی اور فسفیانہ علم کا خاصہ خوف خداوندی کے بجائے منافع بدنی کے فوت ہونے کا خوف اور فرمانبرداری حق کے بجائے فرمانبرداری نفس ہے۔ جس کا طبعی اثر معصیت، حق تلفی اور طغیان و سرکشی ہے۔ جس سے عالم میں فتنے، فسادات اور ہنگامے پھیلتے ہیں۔ پس ایک مادی اور طبعی علم کا عالم وہی سمجھا جائے گا۔ جو سب سے زیادہ آزادگرمی، بے باکی اور ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ حلال و حرام کے فرق سے بے نیاز ہو اور اپنے منافع کی خاطر ایک دنیا کی دنیا کو بتابی کے گھاٹ اتار دینے سے بھی دریغ نہ رکھے ہو۔ کسی عربی کے شاعر نے خوب کہا ہے۔

وَصَبَّحَ لِسَانُ حِكْمَةٍ وَنَفْسُ

وَصَبَّحَ لِسَانُ وَطَنٍ مَّالٍ وَطُغْيَانٍ

”ایک ہی چھاتی کا دودھ پیاتے علم اور خشیت الہی نے کہ ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں علم ہوگا۔ وہاں خوف خداوندی ضرور ہوگا (بشرطیکہ تربیت صحیح ہو) اور ایک ہی وطن کے باشندے ہیں مال (وسائل عیش) اور سرکشی کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ وسائل دنیا ہاتھ میں آجائیں گے تو حرم و بغاوت لازمی طور پر آئے گی (جبکہ تربیت صحیح نہ ہو)۔“

چنانچہ اس علم الہی کے آثار خشیت و خوف کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ

عَبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ﴿۱﴾ ”اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے۔“ اور پھر اسی ربانی علم کے علماء کا مقابلہ غیر علماء سے کرتے ہوئے قرآن نے ان کا فرق مراتب اور درجہ مساوات ارشاد فرمایا ہے: ﴿عَلَّمُوا يَسْغَوِي الْغَدِيرُ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَسْتَكْبِرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ ﴿۲﴾ ”کیا جو لوگ (اللہ اور اس کے احکام کو) جانتے ہیں وہ برابر ہو جائیں گے ان لوگوں کے جو جاہل ہیں بلاشبہ ذکر و نصیحت پکڑنا عقل والوں ہی کا کام ہے۔“ اور پھر اسی علم کے حاملین کے روز بروز بڑھنے والے درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا: کہ ﴿يَرْجُو الْغَدِيرُ أُولُو الْعِلْمِ قَدْ جَلَّتْ﴾ ﴿۳﴾ ”اور جنہیں علم عطا ہوا ہے ان کے درجات ہیں۔“

علم نافع کی حقیقت و وسعت یہی وہ مراتب و درجات و اعلا علم ہے جس کا لقب علم نافع ہے اور جس کا نفع کسی حد پر آ کر نہیں رکتا بلاشبہ دنیا کے تمام علوم و فنون خواہ حیاتی ہوں یا نظریاتی، نفع سے خالی نہیں، سائنس جو یا فلسفہ، ریاضی جو یا مساحت، معاشیات ہوں یا اقتصادیات اور تمام علوم و فنون کے نافع ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ان کی بدولت ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ رہائشی مکانات کی تعمیر، ظروف اور اثاثہ المیت کی تیاری، لباس اور تن پوشی کے سامان خورد و نوش کے ذرائع، نقل و حمل کے وسائل۔ پھر تجارت و صنعت کے اسباب و مواد انہی کے ذریعہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ جو یقیناً نافع ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا نفع علی الاطلاق نہیں۔ بلکہ ایک حد تک محدود ہے جو قبر کے کنارہ سے آگے نہیں گزرتا۔

آپ ہوائی جہاز سے لندن اور برلن منوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن عرش کرمی اور جنت تک یہ سواریاں آپ کو نہیں پہنچ سکتیں۔ آپ ان فنون کی ساخت پر داخت غذاؤں سے دنیا میں پیٹ بھر سکتے ہیں لیکن قبر میں حکم سیری کے لئے یہ کارآمد نہیں ہیں۔ آپ نرم گدیوں اور کنبوں سے یہاں بدن کو آرام پہنچا سکتے ہیں لیکن قبر و حشر میں یہ گدے، تکیے بے کار ہیں۔ اس لئے ان علوم و فنون کا نفع اسی زندگی کے آخری سانس تک محدود ہے۔

لیکن ہم شرائع جو مہمان بنانے کے لئے نہیں بلکہ انسان بنانے کے لئے آیا ہے اور صحیح الانسانی انسان کی گزرگاہ محض دنیا ہی نہیں۔ بلکہ برزخ اور حشر بھی ہے۔ اس لئے اس علم کا تیار کردہ انسان جو انسانی کمالات سے بھرپور ہو اور اس کی راحت وطمینیت خود اس کے اندر ہی مہیا کر دی گئی ہو۔ دنیا میں بھی اس علم سے آرام پا سکتا ہے اور وہاں بھی کیونکہ اس کا راحت و آرام مادی وسائل کے تابع نہیں رہتا۔ بلکہ اس کی راحت اس علم کی بدولت اس کے قلب میں ہوتی ہے۔ جسے کسی بھی جہان کی کوئی چیز زائل نہیں کر سکتی۔ اس لئے نافع مطلق یہی علم ہو سکتا ہے جو انسان میں خفاء وطمینیت پیدا کر کے دنیا و آخرت کی تمام راحتیں خود اسی کے اندر مہیا کر دیتا ہے۔ اس لئے دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کا سکھ اور چین کبھی زائل نہیں ہوتا۔

پس علی الاطلاق جب بھی علم نافع کا لفظ بولا جائے گا۔ تو اس سے یہی علم شریع اور علم حقائق مراد ہوگا۔ صرف یہ کہ وہ مکدر عیش اور کدورت آمیز زندگی کا سبب بنیں گے، بلکہ تمدن کے وہی بے جان ڈھانچے اور لاشے پیدا

کریں گے، جن میں نقصان اور بدبر ہوگی اور دل و دماغ پر آگندہ ہو کر ہلاکتوں کا شکار بن جائیں گے۔ پھر یہی وہ علم ہے جو قلب کے حقیقی فرائض میں ہے۔ جیسے دیکھنا، سننا، کان آنکھ کے فرائض میں سے ہے اور جب قلب علم کا وہی ولیفہ ادا کرے گا، جو قدرت نے اس کے سپرد کیا ہے اور اس علم سے وہ اپنی اعلیٰ ترین نظام چلائے گا۔ تو بھی کائنات انسانی کا وہ عدل ہوگا۔ جو حرمان و خسران سے بری ہوگا اور کفران کے عذاب سے انسانوں کو محفوظ رکھ سکے گا۔

اگر قلب کو اس کے اس اصلی علم سے ہٹا کر ظاہر واریوں کے علم میں ہمہ تن پھاس دیا جائے گا تو یہی وہ خسران ہے جس کا ذکر ابتدائی اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں اور اگر اسے ان سب سے معطل کر رکھ کر جہالت کے قعر میں گرا دیا جائے تو یہی وہ حرمان ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ پھر یہی قلب کا وہ علم ہے جسے علم قطعی کہیں گے جس میں شک و شبہ اور تردد و تذبذب کی گنجائش نہ ہوگی۔ کیونکہ حواسِ فسد یا عقلیات جو معلومات اس دنیا سے بڑھ کر لاتے ہیں۔ ان میں شک و وہم، تردد اور تذبذب کی آمیزش ہوتی ہے جو جہل کی اقسام میں سے ہے۔ اس لئے یہ دنیوی علوم جہل آمیز ہوتے ہیں، خالص علم نہیں ہوتے کہ ان میں قطعیت ہو۔

لیکن خدا نے برتر کا نازل کردہ علم جو انسانی ضمیر پر بلا واسطہ حواس و عقل اترتا ہے، وہ سرچشمہ نفرت سے نازل ہونے کے سبب کمال قطعیت لئے ہوئے ہوتا ہے، جس میں کسی شک و شبہ یا وہم و تردد کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ صورت یقین و اطمینان ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی ہلاکت و طمانیت رو بہ ترقی رہتی ہے اور اس میں حقیقی چین اور سکھ پیدا کرتی ہے۔

بہر حال اخلاقی قدریں علم الہی کے خواص و آثار میں سے ہیں اور بد اخلاقی کی قدریں ان صورتوں، شکلوں اور نمائش ڈیزائنوں کے حسی علم کے خواص و آثار میں سے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں علم اپنی نوعیت اور اپنی خاصیت کے لحاظ سے گویا نکل جدا جدا ہیں۔ لیکن اگر ان ظاہری علوم کا مقصد اس حقیقی علم کو غمبھرا کر آگے بڑھایا جائے اور ان نمائش و نقوش کو ان حقیقی قدروں سے بھر دیا جائے۔ تو دنیا کے یہ خوشنما منوئے آخرت میں کام دے سکتے ہیں۔

عصری تعلیم کا ہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر محفوظ ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علم الہی ہے، ختم کیا جا رہا ہے۔ جو اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہے اور اگر بد اخلاقیات دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو بالاستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جا رہا ہے۔ جس میں سوائے ظاہر واری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔

چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور انفرادی ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات و منافع کے لئے حلال و حرام سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جا رہے ہیں۔ جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہا تار بجھنے ہی کو سب سے بڑی معراج ترقی سمجھ چکا ہے۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاقی دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں۔ تو یہ

ان کی اپنی سلامتی، فطرت یا گھریلو ماحول یا دیندار ماں باپ کی تربیت کا اثر ہو سکتا ہے نہ کہ خالص اس مادی تعلیم کا۔ ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے وجود کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے لادینی ماحول اور مادہ پرستانہ اخلاقی تربیت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ لادینی اور اخلاقی انارکی محض کالج اور یونیورسٹی یا محض کسی کتاب کے نوشتوں کا اثر نہیں۔ بلکہ معلموں کی نافرمانی اور اور پست اخلاقیوں کے ماحول کا اثر ہے اور پھر اس تعلیمی ماحول کے بگڑنے ہی سے پورا معاشرہ بگڑ جاتا ہے۔ ورنہ آج مدارس دینیہ میں بھی فلسفہ اور مادی سائنس پڑھائے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ قلب و اخلاق اور اعتقاد پر کوئی مضراثر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ پڑھانے والوں کا قلب، دیانت و امانت کا ظرف بنا ہوا ہوتا ہے اور نیک ماحول کا وجود قائم شدہ رہتا ہے۔ اس لئے یونیورسٹیاں مضرت نہیں، بلکہ ان کا ماحول مضرت ہے۔ اگر انہی یونیورسٹیوں میں مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کے دوائی پیدا ہو جائیں اور مادی ڈھانچوں میں روحانی قدروں کا رنگ بھر دیا جائے۔ تو یہی مادہ ایک صالح تمدن کا جنم دہند بن سکتا ہے۔ پس ضرورت کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مٹانے کی نہیں بلکہ ان کا نظام اور ماحول بدلنے کی ہے۔

مدارس دینیہ کے قیام کی ضرورت اور غرض و غایت..... لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پھر دوسری مستقل صورت اس کے سوا اور نہیں ہو سکتی کہ الگ سے ایک صحیح اور مستقل خدا پرستانہ ماحول قائم ہو۔ جس میں علوم خداوندی کی تعلیم اور اس کے تحت اخلاقی تربیت پر پورا زور صرف کیا جائے اور دینی مدارس ملک میں زیادہ سے زیادہ پھیلادے جائیں۔ جو بالآخر اپنے کردار و عمل سے ان دوسرے ماحولوں پر بھی موثر ہوں اور ادھر ان دینی اداروں میں ایسے افراد کی بھرتی کی خاص گنجائش رکھی جائے۔ جو سائنس و فلسفہ زدہ ہونے کی وجہ سے مایوس العلاج مریضوں کی صف میں آچکے ہوں مگر اپنا معالجہ چاہتے ہوں۔ کیونکہ آج کی صورت پرستانہ تمدن کی رنگین صورتوں میں اگر اخلاقی قدروں بھری جاسکتی ہیں اور تمدنی جزئیات کی ان خوب صورت مگر مردہ لاشوں کو روح اخلاق سے زندہ کیا جاسکتا ہے، تو وہ صرف اسی علم سے جو پاک قلوب پر بلا توسط اسباب غیب سے اتارا گیا ہے۔ جس کا مقصد ہی انسان کو انسان بنانا ہے۔ نہ کہ سامان تیار کرنا، اس لئے اگر ایک طرف قوم کو نئی تعلیم کے ذریعہ زندگی کے ڈھانچے بنانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ تو دوسری طرف انہیں اس دین کی قدیم تعلیم کے ذریعہ ان ڈھانچوں میں روح ڈالنے کا پتہ بھی تیار کیا جائے۔ ورنہ یہ تمدنی صورتوں کی مردہ لاشیں ایک نہ ایک دن دنیا کے دماغ کو پرانہ کر کے رہیں گی اور پھر ان گلے سڑے ڈھانچوں میں روح آنے کی صلاحیت بھی نہ رہ جائے گی۔ اس لئے اگر ارجح خواہش جسے سائنسی علوم اور عقل معاش کے فلسفیانہ علوم کی ضرورت ہے، تو اس سے کہیں زیادہ قلوب کے اس عرفانی علم کی بھی ضرورت ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے اپنی روح فرما کر اسی کو جہانوں کا زندہ کنندہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے ﴿وَتَذَكِّرُكَ اَوْ حِينَا اَلَيْكَ اَوْ حِينَا اَلَيْكَ وَوَحَاٰ مِنْ اَمْرِ نَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاٰيٰمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نُّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۗ اِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطٍ

اللّٰهُ الَّذِي لَمْ يَلِخِ السَّمَوَاتِ وَمَا بَيْنَ الْأَرْضِ ۚ ۝ آتَا إِلَى اللَّهِ تَقْصِيرُ الْأَوَّلِ ۚ ” اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان، لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی، اس سے سمجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں اور بے شک تو سمجھاتا ہے سیدھی راہ اللہ کی۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام۔“

دور حاضر کی بیمار دنیا کا واحد علاج..... بہر حال اگر آج کی دنیا کا گہرا مرض یہی ہے کہ اس کے تماشائی تمدن میں اخلاقی قوتیں باقی نہ رہیں اور اگر دنیا کی عمومی بیماری یہی ہے کہ اسے سب کچھ ملنے کے باوجود جو چیز نہیں مل سکی، وہ سکون قلب اور روحی چین وطمینان ہے۔ تو اس کا واحد علاج یہی اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اسے سرچشمہ طہانیت و بشاشت علم دین اور علم اخلاق یا بالفاظ مختصر ”مذہبی تعلیم“ سے روشناس کرایا جائے اور دین و مذہب کے بنائے ہوئے علمی اور اخلاقی نقشوں پر ان کی تربیت کی جائے۔ جس کا مکمل اور مستند سرچشمہ آج کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اور دوسرا نہیں۔ اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”لَا يَصْلُحُ اخْرَاجُهُ الْاُمَمَةُ إِلَّا بِمَصْلُحِ بَدَنِهَا“ ”اس امت کے آخر حصہ کی اصلاح اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول حصہ کی اصلاح ہوئی تھی“۔ اور وہ وسیلہ اصلاح یہی روح الہی قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات اور تشریحات ہیں۔ جو حدیث اور فقہ میں منضبط اور مدون ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ..... میرا مقصد علم عصریہ سے کلیہً بھٹانا ان سے نفرت دلا کر رکھنا ہے زار بھٹانا نہیں۔ کیونکہ جب انسان میں بدوہ کے ساتھ بدن بھی لگا ہوا ہے تو روحانی قدروں کے ساتھ بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ جس میں خورد و نوش، پرودہ پوش، نقل و حمل وغیرہ کے اسباب، نیز تجارت، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ کے تمام وسائل داخل ہیں۔ جنہیں سائنس و فلسفہ ہی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے جب تک روح کا بدن سے انقطاع کلی نہیں ہو جاتا ان وسائل و اسباب اور ان کی تعلیم سے بھی کلی یکسوئی ممکن نہیں۔ لیکن جب کہ اسی طرح بدن کے ساتھ روح بھی لگی ہوئی ہے۔ تو اس کے تقاضوں سے بھی قطع نظر نہیں کی جاسکتی بالخصوص جب کہ ایک نہ ایک دن نفس انسانی کا اس بدن سے انقطاع ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس وقت جو چیز انسان میں باقی رہے گی، وہ روح ہی روح ہوگی۔ اس لئے اس کی ضروریات کی فراہمی بدنی ضروریات کی فراہمی سے بھی زیادہ ضروری اور تاگزیر ہے۔ بلکہ جب بدن اور بدنی زندگی عارضی ہے اور روح اور روحانی زندگی دواوی ہے۔ تو بدنی ضروریات اور ان کے مہیا کرنے والے علوم و فنون اور ان کے منافع بھی بہر حال عارضی ہی ہو سکتے ہیں اور عقلی قاعدہ ہے کہ عارضی ضرورتوں کی فراہمی بقدر ضرورت ہی ہوتی ہے۔ حواض میں مقاصد کے انداز کا انہماک نہیں ہوتا۔ اس لئے ان عصری فنون سے نہ کلیہً قطع نظر ہی کی جاسکتی ہے اور نہ انہیں مقاصد زندگی بنا کر انہیں ترقی کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اصولی بات یہی ہوگی کہ انہیں کسی حد تک باقی رکھ کر ان سے معاش پیدا کی جائے۔ لیکن ہمہ وقتی فکر

مقصد زندگی کا رکھا جائے اور وہ دین ہے جو دنیا میں انسان کو انسانیت سکھانے کے لئے بھیجا گیا ہے اور جس کے حصول کا واحد ذریعہ یہی دینی اور شرعی تعلیم ہے۔

علم دین ترقی کے لئے اور علم دنیا حصول ضروریات کے لئے ہے..... اس طرز فکر کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے علم دین ترقی کے لئے رہ جائے اور علم دنیا ذاتی ضروریات کے حصول کے لئے اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمَقْدَارٍ بَقَاؤُكَ لِيْنِهَا وَاعْمَلْ لِّلْآخِرَةِ بِمَقْدَارٍ بَقَاؤُكَ لِيْنِهَا" "دنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے"۔ اس لئے آج شدید ضرورت ہے کہ مسلمان عام دین کو مقصدی حیثیت دے کر آگے بڑھیں اور اپنی نسلوں کو دین اور تعلیم کے فروغ دینے کے لئے تیار کریں۔ اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں اولین و درجہ تعلیم دین ہی کو دیا ہے ارشاد فرمایا کہ: "وَمَا مَنَعَكَ اَنْ تَتَعَلَّمَ دِيْنَكَ يَا اَبِي الْقَاسِمِ" "جیسا کہ بھیجا ہم نے تم ہی میں سے رسول جو پڑھتا ہے تمہارے آگے آتے ہیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب" اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اولین..... اور اس لئے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی بعثت کا اولین مقصد تعلیم دین کو ارشاد فرمایا: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

بعثت کا مقصد ثانی..... اس تعلیم کا طبعی اثر اصلاح عمل ہے۔ جس کی اصلاح اور پاکیزگی ہے بغیر علم بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتا بلکہ اللہ و مال جان بن جاتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دوسری ہم غرض و غایت اسوہ حسنہ بتلائی گئی ہے۔ جسے قرآن نے تعلیم حکمت سے تعبیر فرمایا ہے اور تیسری غرض تکمیل اخلاق ہے کہ اس کے بغیر عمل صالح کے وجود پذیر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو تذکرہ سے تعبیر فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: "لَبِئْسَ مَا كُنَّا فِيْهِ اَلَا خُلُقًا" "میں بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کروں" فرما کر خلقِ عظیم کا وہ نمونہ پیش فرمایا کہ دنیا سخر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر جھکے کے لئے مجبور ہو گئی۔ علم محض کی عظمت و وقعت ضروری جاتی ہے۔ لیکن سرنیا از اخلاق و عمل ہی کے آگے جھکایا جاتا ہے۔ پس اخلاق بمنزلہ رحم کے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والی شاخیں اعمال صالحہ ہیں۔

بعثت کا مقصد ثالث..... پھر اگر کسی ختم پر برگ و بار نہ آئیں تو یہ اس کے سوخت ہو جانے کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے دینی زندگی کا تیسرا بنیادی اور اہم شعبہ تربیت اخلاق نکلتا ہے۔ جس سے اعمال شاخوں کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں اور آدمی اس کے بغیر معیاری انسان نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ دنیا میں کون ہے جو اپنے قول اور بیان کو خوش نما بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جس کا عمل اس کے قول کے موافق

پڑ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ محض قول سے وہ سمجھ کر اچھے نفس کو خواہ مخواہ ہلاک کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”هَفَّتِ الْعِلْمُ بِالْعَمَلِ لَئِنْ أَجَابَ وَالْأَرْثَقُ عَمَلٌ“ ”علم نے عمل کو پکارا (کہ میرے ساتھ چل) مگر اس نے قبول کر لیا (یعنی اگر وہ ساتھ ہو لیا تو یہ علم عمل کی سواری پر سوار ہو کر اپنے عامل کو عرش تک پہنچا دے گا) ورنہ (یعنی اگر عمل ساتھ نہ ہوا) تو علم کوچ کر جاتا ہے (یعنی کہتا ہے کہ پھر میں بھی نہیں ٹھہرتا)۔“

علم و عمل کی باہمی وابستگی..... اس سے واضح ہے کہ جب تک انسانی زندگی علم و اخلاق اور عمل کے ساتھ وابستہ نہ ہو کہ انسان اس میں بند جائے۔ اس وقت تک اس کی زندگی معیاری نہیں بن سکتی کہ لوگ اسے نمونہ سمجھ کر اپنی زندگیوں اس کے حوالہ کر سکیں اور اس کے قول و عمل سے اپنی زندگیاں بنائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے تعلیم کتاب کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور تعلیم حکمت کو جس کا دوسرا نام تربیت اور ذہن سازی ہے۔ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے قائم فرمایا اور اپنے رسول کے بنیادی فرائض میں انہیں شمار فرمایا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت ہی بحیثیت مجموعی نبی کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کا یہ فریضہ تعلیم و تربیت اب امت ہی پر عائد ہے۔ امت جب تک اس بنیادی فریضہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ لے گی، اس وقت تک وہ صحیح معنی میں امت کہلائے جانے کے قابل نہ بنے گی۔ جس کے لئے وہ کتاب و سنت کی رو سے مامور کی گئی ہے۔

ان صریح احکام قرآن وحدیث کے بعد جس کی تائید عقل و فطرت بھی کر رہی ہیں، آخر امت کو اب اور کسی دلیل کا انتظار ہے؟ اور وہ اس کے سوا آخر کون سی جہت چاہتی ہے۔ جو محاذ اللہ کلام خداوندی سے بھی آگے کی ہو۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فُجْئًا يَخْطُبُهُمُ الْقَعَامُ وَالْمَلْبَكَةُ وَقَطِيعُ الْأَمْزِجِ عَالِي اللَّهِ تَرْجِعُ الْأَمْزُجُ﴾ ”کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سانپانوں میں اور فرشتے، طے ہو جاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام“۔

مسلمانہ زندگی کے تین بنیادی شعبے..... بہر حال ایک مسلمان کی دینی زندگی کے تین بنیادی شعبے نکل آتے ہیں۔ علم، اخلاق اور عمل، علم نہ ہو تو راستہ ہی نہیں مل سکتا کہ راہِ رومی ممکن ہو۔ اخلاق نہ ہوں تو عمل کی قوت میسر نہیں آ سکتی کہ آدمی راہِ مستقیم پر رواں دواں ہو اور عمل نہ ہو تو معطل قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا کہ وہ عزت سے دنیا میں باقی رہے۔

قومی بربادی کے تین اسباب..... اس سے طبعی طور پر کسی قوم کی تباہی اور بربادی کے بھی تین بنیادی اصول نکل آتے ہیں۔ جن سے ایک قوم قعرِ مذلت میں گر کر دم توڑ دیتی ہے۔ ایک جہالت کہ راستہ ہی دکھائی نہ دے، ایک بدخلقی کہ تہذیب و دانش کی کاسرا ہاتھ سے چھوٹ جائے اور انسان کی بجائے حیوان بن جائے اور ایک بے عملی کہ سست اقوام کا تہیہ ہمیشہ مذلت، خواری اور پستی و غلامی نکلا ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی ہلاک ہوئی ہے وہ ان ہی تین بنیادی بیماریوں سے ہلاک ہوئی ہے۔

قومی ترقی کے تین وسائل..... اس لئے اس کے بالقابل یہی مذکورہ تین بنیادی اصول ہمیشہ قوموں کے عروج و ارتقاء کا راستہ ثابت ہوئے ہیں۔ ایک علم نافع جس سے دارین کی ترقی اور سرخروئی کی راہیں انکشاف ہوں۔ دوسرے اخلاق حسنہ جن سے ان راہوں پر چلنے کی قوت ملے اور تیسرے عمل صالح جس سے زندگی کی برتری اور عزت ممکن ہو۔ اس لئے مسلمان غور کریں کہ وہ ان تین بنیادی معیاروں کے لحاظ سے آج کس مقام پر ہیں؟ وہ قوم جس کے اسلاف میں بڑا مذہب خلافت فاروقی تھا ہر ایک کا لاشعور بھی اس وقت تک نہیں ملا تھا۔ جب تک کہ تاجر بیع و شراء کے پورے مسائل اور فقہ درونی سے واقف نہ ہو جائے، چہ جائیکہ عبادات و معاملات۔

دور حاضر اور ملت اسلامیہ..... اسی قوم کے افراد آج پہچانے ہی جاتے ہیں، جہل و نادانی سے انا اللہ آج علاقے کے علاقے اور بستیوں کی بستیوں میں، جن میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ لیکن عالم دین کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ اسی لئے جگہ جگہ بدعات و خرافات اور رسوم و رواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنی جہالت سے انہی رسوم و رواج کو دین بادر کر کے اپنی دنیا و آخرت خراب کر رہے ہیں۔ نہ ان میں قابل ذکر طریقہ پر دینی شعور ہے، نہ دینی احساس، نہ دینی لائقوں میں صنعتی، تجارتی، سیاسی اور اقتصادی شعور سے بھی عامہ بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ یہ ساری بنیادیں علم سے قائم ہوتی ہیں۔ جب علم ہی صفر کے درجہ میں ہو تو یہ بنیادیں کہاں قائم ہو سکتی ہیں اور جب بنیادیں نہ ہوں تو تعمیر انھیں کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقوام کی تباہی کی طبعی ترتیب..... عملی زندگی میں عامہ منکرات اور فواحش دلوں پر مسلط ہیں۔ عمل کی خود ساختہ صورتیں مرغوب ہو گئی ہیں اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی میری غیر مرغوب۔ گویا مرض جہالت کا بحران اس حد پر آ چکا ہے کہ ذہن کا ذائقہ ہی بدل چکا ہے، کڑوی چیزیں شیریں محسوس ہونے لگی ہیں اور شیریں چیزیں تلخ، جو توجہ ہے پیہم بدل گئی کی مشق کا اور جب برے افعال عادت ثابت ہو جاتے ہیں تو قدر دان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جاتا ہے اور جب اس ترک نصیحت کی بھی عادت جزو نفس ہو جاتی ہے، تو نصیحت بھی پھر برائیوں کی ہونے لگتی ہے اور بھلائیوں سے روکا جانے لگتا ہے اور اس کا قدرتی انجام یہی ہوتا ہے کہ بھلائی برائی نظر آنے لگتے اور برائی بھلائی دکھلانے لگے۔ العیاذ باللہ جس سے فہم اور ذوق ہی بدل جاتا ہے اور ایک خاص مزاج اور مخصوص ذوق کی قوم ذوق کے تبدیل ہو جانے پر گو نام کے لحاظ سے وہی پرانی قوم کہلائی جاتی رہے۔ لیکن حقیقتاً وہ قوم نہیں رہتی بلکہ کوئی دوسری قوم بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے آج یہی منظر سامنے ہے۔

اور میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام اعضای بدن کے عی و عملی فرائض کے ساتھ قلب کو جو فریضہ بخشا گیا ہے۔ وہ علم نافع، اخلاق فاضلہ اور انکار کا مذاقہ ہیں۔ اگر وہ ان فرائض کو سرے سے ترک کر دیتا ہے تو یہ حرمان ہے اور اگر کچھ دوسرے مصنوعی فرائض اپنے سر لگا لیتا ہے، جس سے اصل فرائض رہ جائیں تو یہ خسران ہے۔ آج اگر دیکھ تو دنیا حرمان و خسران دونوں ہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ قلب آج نہ صرف اپنے حقیقی علم کے فرائض سے

ہیں بلکہ علم کے نام سے ایسے مصنوعی غلطیوں اور ازموس کو انہوں نے اپنے اندر بھر لیا جو علم نما جہل ہیں اور جن سے انسان نہ جاہلی ہی رہتا ہے اور نہ عالم ہی بنتا ہے۔ بلکہ جہل مرکب کا شکار ہو جاتا ہے۔

میں آج کا انسان جب کہ اپنے تن خاکی کی حکومت اور اس کے عمل کو قانون الہی سے ہٹ کر لائقانویت کے ساتھ چلا رہا ہے اور علم کی نعمت کو جہالت سے تبدیل کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو بلاشبہ وہ اپنے کو دارالبوار (جہنم) کا مستحق بناتا جا رہا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ مَذَلُوْا نِعْمَتُ اللّٰهِ شُغِرُوْا وَاَخْلَوْا فَلَوْ نُهَمَّ ذَاَ الْاَبْوَابِ ۖ لَجِئْتُمْ بِغُلُوْظِكُمْ فَيُصَلُّوْنَهَا وَهُمْ يَشْنُوْنَ ۚ﴾ ”تو نے نہ دیکھا کہ جہنم نے بدلا اللہ کے احسان کو تا مشرکی سے اور اتارا اپنی قوم کو جم جاعی کے گھر میں جو دوزخ ہے، داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے۔“ ان حالات میں دینی مدارس کا قیام جس طرح اہم و اجبات میں سے ہے ایسے ہی ان حضرات کی تدریسی اور حوصلہ افزائی بھی اہم فرائض میں سے ہے جو اس دور فتنہ والی میں دینی مدارس لئے جیٹھے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ بھوجپور اس سلسلہ کی ایک شہری کڑی ہے۔ جس کے بانیوں، مدرسوں اور منتظموں نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس علمی درس گاہ کو پھر سے زندہ کیا اور اسے بام عروج پر پہنچانے کی کئی تہذیب اور آرزو لئے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اسی آرزو اور تہذیب کا اثر ہے کہ آج جامعہ اشرفیہ ایک نئی روح کے ساتھ سامنے ہے اور اس میں درباب کمال جمع ہیں اور اسی قلب کے علم کو اور اس علم سے قلب کو پھر سے زندہ و پائندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ حضرات درحقیقت انہی اسلاف کے اخلاف ہیں۔ جنہوں نے انگریزی تسلط و اقتدار کے وقت جب کہ برطانوی حکومت نے اسلامی علوم و فنون کے سوتے ہر طرف سے بند کر دیئے تھے۔ ان بزرگوں نے اپنی نگاہ دور بین سے مستقبل کا صحیح اندازہ لگا کر آزادی ہندوستان میں بچھا دیا تھا، اور اس طرح ناسازگار ماحول میں دین کی ہزاروں ٹھہریں روشن کر دی تھیں۔ جن کا چاندنا آج تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے آج کتنا بھی ناسازگار ماحول کیوں نہ ہو۔ ان کے اخلاف عزائم اور جہتیں ہارنے والے نہیں ہیں اور توقع ہے کہ یہ حضرات اسی طرح اسلامی علوم و فنون، اور اسلامی معاشرہ کو جوں کا توں باقی رکھیں گے۔ جس طرح ان کے بزرگوں نے اسے باقی رکھا تھا۔

اگر اب بھی جامو اشرفیہ سے فیض و برکات کا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور دوسرے سرایضوں کو بھی اس کا راستہ نہ دکھایا جائے تو انتہائی بد قسمتی ہوگی۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان حضرات کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اس درس مجاہد کو علوم قلب کی آبیاری کا وسیلہ ثابت فرمائے۔ علوم نبوت اس سے زعمہ ہوں اور سرشاران عمل افراد اس سے ابھر ابھر کر دین کے مناد بنیں اور تو م میں دلی انقلاب آئے اور انجام بخیر ہوں۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم روزگارے دریں بسر بردیم

گرینا بد بگوش رغبت کسی
بر رسولان بلاغ باشد و بس

”وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي يَتَعَفَّى عَنْهُمْ”